ہندستانی مسلمان

مولانا وحید الدین خاں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہندستانی مسلمان

مولانا وحید الدین خاں

فہرست

یقینی ضمانت

قرآن کے مطابق، اہل ایمان کے لیے اس دنیا میں حفاظت کی سب سے بڑی اور یقینی ضمانت یہ ہے کہ وہ صبر اور تقویٰ کی روش پر قائم رہیں۔ قرآن میں مختلف انداز سے اس کا واضح اعلان کیا گیا ہے۔ ایک جگہ اسلام کے بدخواہوں اور دشمنوں کا ذکر کرتے ہوئے قطعی اور حتمی انداز میں ارشاد ہوا ہے:

وَاِن تصبروا و تتقوا لا یضرکم کیدھم شیئاً۔

اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ کی روش اختیار کرو تو ان کی مخالفانہ تدبیر تم کو کچھ بھی نقصان نہ پہنچائے گی۔

(آل عمران ۱۲۰)

یہ بات جو اس آیت میں کہی گئی ہے، یہ کوئی پُر اسرار بات نہیں۔ یہ ایک سادہ اور فطری حقیقت ہے۔ اپنے آس پاس کے واقعات پر غور کر کے اس کو سمجھا جا سکتا ہے۔

اگر آپ سچائی اور انصاف پر ہیں اور کوئی شخص آپ کا مخالف بن کر کھڑا ہو تو اس کا یہ اقدام خود اس کی اپنی فطرت کے خلاف ہوتا ہے۔ عین اس وقت بھی اس کی فطرت کی آواز اس کے خلاف فیصلہ دینے کے لیے اس کے اندر موجود ہوتی ہے۔ وہ جب تک ضد اور عناد کی نفسیات میں مبتلا ہے، وہ آپ کے خلاف کارروائی کرے گا۔ مگر جیسے ہی وہ اعتدال پر آیا وہ آپ کے خلاف اقدام کرنے کا حوصلہ کھو دے گا۔

صبر اور تقویٰ کی روش فریق ثانی کو اسی حالتِ اعتدال پر لانے کی ایک تدبیر ہے۔ صبر کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے شخص کی زیادتیوں پر ردِ عمل کا اظہار نہ کیا جائے۔ اور تقویٰ کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی اللہ کی عظمتوں کو سوچ کر متواضع بن جائے۔

یہ دونوں صفتیں اگر آدمی کے اندر حقیقی طور پر پیدا ہو جائیں تو وہ بلاشبہ اس کے حریف کو ٹھنڈا کرنے کی یقینی ضمانت ہیں۔ یہ اعلیٰ اخلاق یقینی طور پر اس کے ضد اور عناد کو ختم کر کے اس کو اعتدال کی حالت پر پہنچا دے گا۔ اور جب کوئی شخص معتدل نفسیات والا بن جائے تو خود اس کی اپنی فطرت اس کو ظلم سے روک دیتی ہے، اس کے بعد اس کے لیے کسی مزید پولس اور فوج کی ضرورت نہیں۔

ناکامی میں کامیابی

حضرت یوسف علیہ السلام کے دشمنوں نے آپ کو ایک سنسان کنویں میں ڈال دیا۔ بظاہر یہ ہلاکت کا واقعہ تھا۔ مگر عین اس وقت خدا نے حضرت یوسف کو مطلع کیا کہ ہلاکت کے اس کنویں سے تمہارے لئے ایک نئی زندگی برآمد ہوگی۔ قرآن میں ہے کہ جب حضرت یوسف کے دشمنوں نے آپ کو کنویں میں ڈالا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف کے پاس وحی بھیجی کہ عنقریب تم ایسی بلندی پر پہنچو گے کہ تمہارے بھائی تمہیں دیکھ کر پہچانیں گے بھی نہیں۔ (یوسف ۱۵) گویا خدا نے حضرت یوسف کے واقعہ کو ظاہری پہلو سے دیکھنے کے بجائے اس کے اندرونی پہلو کے اعتبار سے دیکھا۔ اس کو حال کے اعتبار سے دیکھنے کے بجائے مستقبل کے اعتبار سے دیکھا۔ اس نظر سے دیکھنے میں ساری بات بدل گئی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس وقت حضرت یوسف کو مطلع کیا کہ تمہارا اسوء القصص آئندہ احسن القصص بننے والا ہے۔ جہاں لوگوں نے تمہاری تاریخ ختم کردینی چاہی تھی وہیں سے تمہاری نئی تاریخ شروع ہو جائے گی۔

ایک حدیث ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: اتقوا فراسة المؤمن فانه ينظر بنور الله۔ مومن کی ہوشیاری سے ڈرو کیوں کہ وہ خدا کے نور سے دیکھتا ہے۔ حضرت یوسف کے واقعہ کا یہ پہلو گویا اس حدیث کی تشریح ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے نور سے دیکھنے کا مطلب کیا ہے۔ اس کا مطلب ہے: چیزوں کو ان کے اندرونی امکانات کے اعتبار سے دیکھنا۔ جب اس طرح کسی واقعہ کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جو قصہ بظاہر اسوء القصص تھا وہ مستقبل کے اعتبار سے احسن القصص ہے۔ نور خداوندی سے دیکھنے والا ناموافق میں موافق کو دیکھ لیتا ہے۔ وہ تاریک حالات میں روشن حالات کا پتہ لگا لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی منصوبہ بندی میں تسخیر کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی منصوبہ بندی کا مقابلہ وہ لوگ نہیں کر سکتے جو حالات کو صرف ظاہر کے اعتبار سے دیکھنا جانتے ہوں۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو دیگر اقوام سے مختلف قسم کی تکلیفیں پہنچی ہیں اور پہنچ رہی ہیں۔ یہ بات یقیناً افسوسناک ہے لیکن اگر معاملہ کو صرف اس کے ظاہری پہلو کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ہمیں اس کے سوا کوئی اور کرنے کا کام نظر نہ آئے گا کہ کچھ قوموں کو ظالم قرار دے کر ان کے خلاف احتجاج اور شکایت کا طوفان برپا کرتے رہیں۔ بدقسمتی سے موجودہ زمانہ کے مسلمان یہی ایک کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے ابھی تک اس واقعہ کو نور خداوندی سے نہیں دیکھا۔ اگر وہ اس کو نور خداوندی سے دیکھتے تو ان کو معلوم ہوتا کہ جہاں "تاریک پہلو ہے وہاں روشن پہلو بھی موجود ہے۔ جو قصہ بظاہر أسوء القصص نظر آتا ہے وہ أحسن القصص میں بھی تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

یہاں میں انسانی "تاریخ کا ایک حوالہ دینا چاہتا ہوں جس کو خصوصیت سے آرنلڈ ٹوائن بی نے ریکارڈ کیا ہے۔ آرنلڈ ٹوائن بی مشہور انگریز مورخ ہے جس کی کتاب اسٹڈی آف ہسٹری اپنے موضوع پر نہایت اہم سمجھی جاتی ہے۔ ٹوائن بی نے اس کتاب میں قدیم وجدید دنیا کی ۲۱ تہذیبوں کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اس تفصیلی مطالعہ کے بعد اس نے ایک بڑی عجیب بات لکھی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ میں نے اپنے مطالعہ میں پایا کہ دنیا کی جن قوموں نے کوئی تہذیب پیدا کی وہ اکثر وہ تھیں جو اپنی زندگی میں شکست سے دوچار ہوئیں۔ جنھیں سخت ناموافق حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی قوم کے موافق حالات ہمیشہ اس کے ناموافق حالات کے بطن سے پیدا ہوتے ہیں۔

ٹوائن بی کے اس نظریہ کی ایک واضح مثال جدید تہذیب ہے جو مغربی قوموں کے ذریعہ پیدا ہوئی۔ مغربی قوموں کے عروج سے پہلے دنیا کے بڑے حصہ پر مسلمانوں کا اقتدار تھا۔ مسلمانوں نے اس زمانہ میں شام اور فلسطین پر قبضہ کرلیا جو مغرب کی مسیحی قوموں کے نزدیک مقدس مقام کی حیثیت رکھتا تھا۔ چنانچہ ان مقدس مقامات کو واپس لینے کے لئے مغرب کی مسیحی قومیں متحدہ طاقت سے مسلم دنیا پر حملہ آور ہوئیں۔ ان جنگوں کو تاریخ میں صلیبی جنگیں (Crusades) کہا جاتا ہے۔ یہ صلیبی جنگیں ۱۰۹۵ء سے ۱۲۷۱ء تک جاری رہیں۔ یعنی وقفہ وقفہ سے پورے دوسو سال تک۔ مگر آخر کار مغربی قوموں کو ذلت آمیز شکست

ہوئی۔ وہ اپنے مقدس مقامات کو حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوئے۔

مغربی قوموں کی یہی وہ ناکامی ہے جس کے بطن سے جدید تہذیب نکلی۔ جس نے مغربی قوموں کو سارے عالم میں غالب کر دیا۔ صلیبی جنگوں میں شکست کے بعد مغربی قومیں اپنا جنگی حوصلہ کھو چکی تھیں۔ اب انھیں اس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا کہ وہ جنگ کے میدان میں مسلمانوں کو چیلنج کر سکیں۔ ان حالات نے ان کے اندر ایک نیا ذہن ابھارا جس کو ان کے مفکرین نے روحانی کروسیڈ (Spiritual crusades) کا نام دیا، یعنی غیر حربی میدان میں مقابلہ۔ اب انھوں نے مسلمانوں کے علوم سیکھنے شروع کئے۔ عربی زبان کی علمی کتابیں لاطینی میں ترجمہ کی گئیں۔ اولاً انھوں نے مسلمانوں کے علوم کو سیکھا۔ اور اس کے بعد اس میں اضافہ کرنا شروع کیا۔

یہ کوششیں کئی سو سال تک جاری رہیں۔ یہاں تک کہ انھوں نے علم وفن کی دنیا میں اتنی ترقی کی کہ تاریخ انسانی کو نئے دور میں داخل کر دیا۔ انھوں نے روایتی دور کی جگہ سائنسی دور پیدا کیا۔ انھوں نے دستکاری نظام کو مشینی نظام میں تبدیل کر دیا۔ وغیرہ

اس ترقی کے بعد ان کی طاقت بے پناہ ہو چکی تھی۔ انھوں نے نہ صرف مسلم قوموں کو از سر نو مغلوب کیا بلکہ ساری دنیا پر براہ راست یا بالواسطہ انداز میں غلبہ حاصل کر لیا۔ وہ تمام اقوام کے اوپر قائد بن کر کھڑے ہو گئے۔

مغربی اقوام کی یہ عظیم کامیابی ان کی عظیم ناکامی سے برآمد ہوئی۔ صلیبی دور کی شکستوں نے ان کو موجودہ دور کی فتح تک پہنچایا۔

خدا کی اس دنیا میں شکست بھی فتح کا دروازہ ہے۔ یہاں ناکامی میں بھی کامیابی کا راز چھپا ہوا ہے۔ بشرطیکہ اس کو جان کر اسے استعمال کیا جائے۔

ہجرت کی ضرورت

اسلام کے اصولوں میں سے ایک اصول وہ ہے جس کو ہجرت کہا جاتا ہے۔ ہجرت کی ایک صورت زمینی انتقال ہے۔ مگر یہی کل ہجرت نہیں۔ ہجرت دراصل اسلامی مشن کا ایک مرحلہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ایک میدان کار میں عمل کرنا بے نتیجہ بن گیا ہو تو مشن کے افراد اس میدان کو چھوڑ کر دوسرے ایسے میدان میں منتقل ہو جائیں جہاں نتیجہ خیز کام کرنے کا امکان نظر آتا ہو۔

پچھلے سو سال سے مسلمانوں نے مبنی بر غیر تحریکیں چلائیں اور وہ سب کی سب بے نتیجہ رہیں۔ اب مسلمانوں کو مبنی بر غیر میدان سے نکل کر مبنی بر خویش میدان میں آجانا چاہیے جہاں نتیجہ حاصل کرنا بلاشبہ یقینی ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں ہندستانی مسلمانوں نے پُرشور خلافت تحریک چلائی۔ مگر تحریک جب اپنے آخری عروج پر پہنچ گئی تو معلوم ہوا کہ اس کا سرا ترکی کے حکمراں کمال اتاترک کے ہاتھ میں تھا۔ ۱۹۲۴ میں کمال اتاترک نے خلافت کے ادارہ کے خاتمہ کا اعلان کر دیا اور ہندستان کی تحریک خلافت اچانک زمیں بوس ہو کر رہ گئی۔

یہی حال موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی تمام تحریکوں کا ہوا ہے۔ ہر بار وہ اپنی تحریک ایسی زمین پر اٹھاتے ہیں جس کا سرا کسی اور کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی ہنگامہ خیز تحریک بالآخر کسی غیر کی ایک کارروائی سے ختم ہو جاتی ہے۔ ہر بار یہ ہوتا ہے کہ ابتدا میں مسلمان کامیابی کا جشن مناتے ہیں اور آخر میں شکایت اور فریاد کا دفتر لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اس کی ایک تازہ مثال وہ ہے جو اگست ۱۹۹۱ میں پیش آئی۔

اسلامک فقہ اکیڈمی کے زیر اہتمام چوتھا فقہی سیمینار حیدرآباد میں ۹۔۱۲ اگست ۱۹۹۱ کو ہوا۔ اس کی روداد لکھنؤ کے ماہنامہ الفرقان (اکتوبر۔ نومبر ۱۹۹۱) میں شائع ہوئی ہے۔ اس کا ایک حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

اس سمینار میں ہندستان بھر کے علماء وفقہاء نیز مصر، سعودی عرب، پاکستان اور بنگلہ دیش کے ممتاز اہل علم شریک ہوئے۔ اس سمینار میں جو مسلم مسائل زیر بحث تھے ان میں سے ایک "ہندستان کے موجودہ حالات اور مسلمانوں کی جان و مال پر مسلسل منصوبہ بند حملوں سے پیدا ہونے والی صورتحال

میں جان و مال کے انشورنس کا مسئلہ" بھی تھا۔

مباحثہ کا آغاز کرتے ہوئے کہا گیا کہ موجودہ حالات یہ ہیں کہ منظم منصوبہ بندی کے تحت ہندستانی مسلمانوں کی نسل کشی کی جارہی ہے اور اقتصادی طور پر ان کو کنگال بنا دینے کی زبردست کوشش ہو رہی ہے۔ یہ بات عیاں ہو چکی ہے کہ فسادات وقتی جھگڑے سے نہیں پھوٹ پڑتے بلکہ مہینوں پہلے سے کی گئی منصوبہ بند تیاریوں سے ہوتے ہیں۔ ان حالات میں کیا ہم بدرجہ مجبوری مسلمانوں کو یہ مشورہ دے سکتے ہیں کہ وہ اپنی جانوں یا اپنے املاک کا بیمہ کروالیں۔ اور انشورنس کی اسکیموں کا فائدہ اٹھائیں۔ کیوں کہ یہ دیکھا گیا ہے کہ فساد کے موقع پر ان دکانوں کو نہیں جلایا گیا یا ان اموال کو برباد نہیں کیا گیا جن کا بیمہ کر دیا جا چکا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ جان کر کہ مسلمانوں نے اب عام طور پر اپنی جانوں اور اپنی املاک کا بیمہ کرا لیا ہے، انتظامیہ فسادات روکنے کے سلسلہ میں زیادہ چوکنا ہو جائے۔

اس مباحثہ کے دوران یاد دلایا گیا کہ ۱۹۶۵ء میں مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء (لکھنؤ) نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ضرورت شدیدہ کے پیش نظر اگر کوئی شخص اپنی زندگی یا اپنے مال یا اپنی جائداد کا بیمہ کرائے تو شرعاً اس کی گنجائش ہے۔

رپورٹ کے مطابق علماء کے درمیان طویل، دلچسپ، پُرمغز، مفید اور زوردار مباحثہ کے بعد تقریباً طے ہو گیا کہ فرقہ وارانہ فسادات میں مسلمانوں کو جان و مال کے مسلسل نقصان سے بچانے کے لیے انھیں انشورنس کی اجازت دے دی جائے۔ پروگرام یہ تھا کہ ۱۲ اگست ۱۹۹۱ کی نشست میں مذکورہ مفہوم کی تجویز پیش کر کے رسمی طور پر اس کو منظور کرا لیا جائے گا۔ مگر عین اس دن حیدرآباد کے ایک مسلم ڈاکٹر وہاں آئے۔ وہ انشورنس کے قواعد وضوابط سے متعلق ضروری دستاویزات اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ اس میں انھوں نے ایک خاص حصہ کو پہلے ہی سے نشان زد کر دیا تھا جو زیر بحث موضوع سے متعلق تھا۔ ان نشان زد سطروں سے یہ بات مشکوک ہو گئی کہ فسادات کے نتیجہ میں ہلاک ہونے والے افراد کو انشورنس کا فائدہ مل سکے گا۔

ان نشان زد سطروں میں کہا گیا تھا کہ انشورنس کارپوریشن اس بات کی ذمہ دار نہ ہو گی کہ وہ محولہ اے اور بی کے قاعدہ کے تحت کسی شخص کو مقررہ مزید رقم ادا کرے، جب کہ زیر بیمہ شخص کی معذوری یا موت قانون کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہو، یا ان زخموں کے سبب سے ہو جو فسادات، سماجی شورش

یا بغاوت کے دوران پیش آئیں :

The Corporation shall not be liable to pay the additional sum referred in (a) or (b) above if the disability of the death of the Life Assured shall:
(iii) result from the Life Assured committing any breach of law; or
(iv) be caused by injuries resulting from riots, civil commotion, rebellion.

مذکورہ واقعہ سامنے آنے کے بعد ساری صورت حال بدل گئی۔ چنانچہ سمینار میں شرکت کرنے والے سب حضرات نے یہ رائے دی کہ اس حالت میں انشورنس کے بارہ میں کوئی فیصلہ کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ چنانچہ اعلان کر دیا گیا کہ اس مسئلہ پر مزید تحقیق کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی جاتی ہے جس کی تجویز آئندہ سمینار میں پیش کی جائے گی۔

۱۹۶۵ سے ۱۹۹۱ تک مسلم رہنما فرقہ وارانہ فساد کے اس حل پر غور کرتے رہے کہ مسلمان اپنی جان و مال کا بیمہ کرائیں۔ مگر بیمہ کمپنی پر مسلمانوں کا قبضہ نہیں تھا بلکہ کسی اور کا قبضہ تھا۔ اس نے مسلمانوں کا رجحان دیکھ کر یہ ضابطہ بنا دیا کہ فسادات میں جو ہلاکت ہوگی، بیمہ کمپنی اس کی تلافی کرنے کی ذمہ دار نہ ہوگی۔ غیر کی ایک جنبش قلم سے مسلمانوں کا سارا منصوبہ ڈھ کر رہ گیا۔

تدبیر کی تبدیلی

فرقہ وارانہ فسادات کے مسئلہ کا واحد قابل عمل حل ہجرت ہے۔ یعنی میدان محنت کی تبدیلی۔ ان فسادات کے معاملہ میں اب تک مسلمانوں کے نام لکھنے اور بولنے والے "مبنی بر غیر" انداز میں اپنی تحریک چلاتے رہے ہیں۔ یعنی فرقہ وارانہ تنظیموں کے خلاف احتجاج۔ حکومت اور انتظامیہ سے مطالبہ کرنا کہ وہ فساد کو روکیں۔ مگر ان کوششوں کے نتیجہ میں فسادات میں ایک فی صد بھی کمی نہیں آئی۔

اب مسلمانوں کو اس معاملہ میں "مبنی بر خویش" روش پر آجانا چاہیے۔ یعنی خود اپنی بنیاد پر سوچنا۔ خود اپنی کوشش سے مسئلہ کا حل نکالنا۔

مبنی بر خویش حل سے میری مراد ہرگز دفاعی تدبیر نہیں ہے جس کو مسلمانوں کے کچھ نادان لکھنے اور بولنے والے لوگ پیش کر رہے ہیں۔ نام نہاد دفاع اس مسئلہ کو صرف بڑھانے والا ہے۔ وہ ہرگز اس کو گھٹانے

والانہیں۔ مبنی برخویش حل سے میری مراد صرف صبر و اعراض ہے۔ اس مسئلہ کا واحد یقینی حل صبر و اعراض ہے۔ یہ حل وہ ہے جو مکمل طور پر مسلمانوں کے اپنے اختیار میں ہے۔ یہاں کسی دوسرے کے لیے یہ موقع نہیں کہ وہ اپنی حرکتِ لب یا جنبشِ قلم سے اس کو بے اثر بنا دے۔

صحیح مسلم کی ایک روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگ اپنے دشمنوں پر اس وقت تک غالب رہو گے جب تک تم میرے طریقہ کو پکڑے رہو۔ اگر تم میرے طریقہ سے ہٹ گئے تو اللہ تمہارے اوپر ایسے لوگوں کو مسلط کر دے گا جو نہ تم سے ڈریں گے اور نہ تم پر رحم کریں گے یہاں تک کہ تم میری سنت کی طرف لوٹ آؤ:

لا زلتم منصورین علی اعدائکم ما دمتم متمسکین بسنتی۔ فإن خرجتم عن سنتی سلّط اللّٰہ علیکم من لا یخافکم ولا یرحمکم حتی تعودوا إلی سنتی۔

مسلمانوں کی موجودہ حالت حقیقۃً ترکِ سنت کا نتیجہ ہے نہ کہ کسی دشمن کی سازش کا نتیجہ۔ فسادات کے پس منظر میں مسلمانوں نے جس سنت کو ترک کیا ہے وہ صبر و اعراض کی سنت ہے۔ اسی سنت کو چھوڑنے سے موجودہ صورت حال پیدا ہوئی ہے اور دوبارہ اسی سنت کو اختیار کر کے اس صورت حال کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی دوسری تدبیر اس مسئلہ کو حل کرنے والی نہیں۔

مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ بے صبری سے صبر کی طرف لوٹیں۔ وہ ٹکراؤ کو چھوڑ کر اعراض کی طرف واپس آئیں۔ اشتعال انگیزی پر مشتعل ہو جانے کے بجائے وہ اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہ ہونے کا طریقہ اختیار کریں۔ یہی پیغمبر اسلام کی سنت ہے اور اسی سنت میں کامیابی کا راز چھپا ہوا ہے۔

مسلمانوں کو آج ایک ہجرت کرنا ہے۔ یہ تدبیری ہجرت ہے نہ کہ کوئی جغرافی ہجرت۔ اسی ہجرت میں ان کی کامیابی کا یقینی راز چھپا ہوا ہے۔

صبر و تحمل کا کرشمہ

جناب محمد کلیم اللہ صاحب مدراس کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے مکمل حوالے کے ساتھ مدراس کے دو تقابلی واقعات ہمیں لکھ کر بھیجے ہیں۔ ان واقعات میں بہت بڑا سبق ہے۔ موصوف کا پتہ یہ ہے :

Mohammad Kalimullah, 352, T.T.K. Road,
Raya Pettah, Madras 600014.

ان کا خط مورخہ ۲۸ ستمبر ۱۹۹۱ اور مورخہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۱ ہمارے سامنے ہے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے مدراس کے انگریزی روزنامہ ہندو کی ایک کاپی روانہ کی ہے جس کے صفحہ ۲ پر مذکورہ واقعہ کی رپورٹ شائع کی گئی ہے۔ یہ رپورٹ مکمل طور پر اس صفحہ کے نیچے نقل کی جارہی ہے۔ خبر یہ ہے :

مدراس میں ہر سال گنیش چترتھی کا جلوس نکلتا ہے۔ پچھلے سال ہندوؤں کا یہ مذہبی جلوس ۲۱ ستمبر ۱۹۹۰ کو نکلا تھا۔ یہ جلوس چلتا ہوا ٹریپلی کین ہائی روڈ میں داخل ہوا۔ یہ ایک مسلم علاقہ ہے۔ یہاں مسجد کے سامنے باجا بجایا گیا اور اشتعال انگیز نعرے لگائے گئے۔ اس پر مسلمان مشتعل ہو گئے۔ آخر کار مسلمانوں اور پولیس کے درمیان باقاعدہ لڑائی شروع ہو گئی۔ پولیس نے گولی چلائی جس کے نتیجہ میں دو مسلمان مارے

RESTRAINT PREVENTED LARGE SCALE VIOLENCE

Two organisations -- Citizens for a Secular Society and Penn -- a Centre for Women's Studies -- have expressed deep concern over the Vinayaka Chathurthi procession on Sunday.

In a statement they said "the processions were far from religious in nature. What we found instead was an aggressive and communal campaign directed against members of the minority community. The processionists were boisterous young men, a number of them carrying sticks, shouting slogans like 'This is a Hindu nation and only Hindus can live here.' 'We will destroy the mosque and build a Ram temple.' 'Fearless Hindus, come forward as a battalion.'

This show of communal viciousness made a mockery of a supposedly religious occasion. Members of the minority community, on the whole showed great restraint. It was this, combined with effective police presence that, in our opinion, prevented large scale violence.

The attention of the public is drawn to this transforming of a religious event by blatantly communal and political organisations.

The Hindu (Madras), September 26, 1991.

گئے۔ بہت سے زخمی ہوئے۔ مسلمانوں کی کئی دکانوں میں توڑ پھوڑ کی گئی۔ جانی اور مالی دونوں نقصان صرف مسلمانوں کا ہوا۔

گنیش چترتھی کا یہ جلوس اس سال بھی ۱۲ ستمبر ۱۹۹۱ کو نکالا گیا۔ مگر اس سال مسلمانوں نے جوش کے بجائے ہوش سے کام لیا۔ انھوں نے اس بار "اعراض کرو اور کامیابی حاصل کرو" کا فارمولا استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ جلوس نے حسب معمول مسلم محلہ میں باجا بھی بجایا اور اشتعال انگیز نعرے بھی لگائے۔ مگر مسلمانوں نے نہ تو روٹ بدلنے کا مطالبہ کیا اور نہ وہ اشتعال انگیز باتوں پر مشتعل ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جلوس سڑک پر چلتا ہوا گذر گیا۔ مسلمانوں کا کوئی جانی یا مالی نقصان نہیں ہوا۔ علاقہ میں مکمل طور پر امن قائم رہا۔

موجودہ واقعہ پر مدراس کے انگریزی اخبار ہندو (۲۶ ستمبر ۱۹۹۱) نے جو رپورٹ چھاپی ہے وہ نہایت سبق آموز ہے۔ اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ پچھلے سال کے برعکس، اس سال جلوس کے واقعہ پر فساد نہ ہونے کا خاص سبب مسلمانوں کا صبر و تحمل کا رویہ تھا، دو ہندو تنظیموں نے مسلمانوں کی تعریف کرتے ہوئے ہندؤوں کے جلوس کی مذمت کی ہے اور کہا ہے کہ وہ مذہب کے نام پر فرقہ واریت پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جلوس والوں نے اقلیتی فرقہ کے خلاف قابل اعتراض نعرے لگائے جن کا مذہب سے کوئی بھی تعلق نہیں تھا۔ انھوں نے مدراس پولیس کی بھی تعریف کی جس نے شہر کو نقض امن سے بچانے کی موثر تدابیر اختیار کیں (صفحہ ۳)

اس خبر پر غور کیجئے۔ ایک ہی واقعہ ایک ہی محلہ میں دو بار ہوتا ہے، ایک بار وہاں فساد ہو جاتا ہے، اور دوسری بار فساد نہیں ہوتا۔ اس فرق کا سبب جلوس والوں کا رویہ نہیں ہے بلکہ محلہ والوں کا رویہ ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فساد کا ہونا یا نہ ہونا تمام تر "محلہ والوں" کے اختیار میں ہے۔ وہ چاہیں تو ایک قسم کا ردعمل اختیار کر کے معاملہ کو فساد تک پہنچا دیں اور چاہیں تو دوسرے قسم کا ردعمل اختیار کر کے فساد کی جڑ کاٹ دیں۔

دوسرا سبق اس میں یہ ہے کہ مسلمان اگر ان مواقع پر مخالفانہ ردعمل کا مظاہرہ کریں تو معاملہ پولیس اور مسلمان کا بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ اعراض کا طریقہ اختیار کریں تو معاملہ جلوس والوں کا اور پولیس کا رہتا ہے۔ ایک صورت میں مسلمان پولیس کے نشانہ پر آجاتے ہیں اور دوسری صورت

میں جلوس والے۔

تیسرا سبق یہ ہے کہ تحمل کا رویہ نہایت اثر کرنے والا رویہ ہے۔ چنانچہ مدراس کے مذکورہ واقعہ پر جب مسلمانوں نے تحمل کا رویہ اختیار کیا تو خود اکثریتی فرقہ کے اندر سے ایسے افراد اٹھے جنھوں نے جلوس والوں کی مذمت کی۔ اور مسلمانوں کی شرافت کا واضح طور پر اعتراف کیا۔ اخبارات میں مسلمانوں کو شاندار پر سراہا گیا اور دوسرے گروہ کو کنڈم کیا گیا۔

یہ سارا کرشمہ صرف ایک چیز کا تھا، اور وہ صبر ہے جس کو اخبار ہندو نے اپنے تبصرہ میں برداشت (restraint) کا نام دیا ہے۔

مسئلہ کا حل

۱۹۴۷ کے بعد کے دور میں ہندستان کے مسلمانوں کے ذہن پر سب سے زیادہ جو مسئلہ چھایا رہا ہے، وہ فرقہ وارانہ فساد کا مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ مسلمانوں کو مستقل طور پر عدم تحفظ کے احساس میں مبتلا رکھتا ہے۔ مگر مذکورہ واقعہ علامتی طور پر بتاتا ہے کہ اس مسئلہ کا حل مسلمانوں کے اپنے اختیار میں ہے۔ مسلمان سادہ طور پر صرف یہ کریں کہ وہ کچھ نہ کریں، اور اس کے بعد یقینی طور پر وہ فساد کی مصیبت سے نجات پا جائیں گے۔

حدیث میں بتایا گیا ہے کہ صبر مومن کے لیے بچاؤ کا ذریعہ ہے (الصبر معقل المومن) مذکورہ واقعہ، اور اس طرح کے دوسرے واقعات، اس قول رسولؐ کی عملی تصدیق ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے صبر و اعراض کی صورت میں اہل ایمان کو ایک ایسی ڈھال دے دی ہے جو بے خطا اپنا عمل کرتی ہے۔ جب بھی آپ صبر کی تدبیر اختیار کریں وہ آپ کے لیے یقینی بچاؤ کا ذریعہ بن جائے گا۔

انسان عین اپنی پیدائشی ساخت کے مطابق اس طرح بنایا گیا ہے کہ وہ کسی کے خلاف زیادتی کرنے کے لیے جواز (justification) چاہتا ہے۔ جب آپ کسی کی اشتعال انگیزی پر مشتعل ہوں تو گویا آپ اس کو یہ جواز دے رہے ہیں کہ وہ آپ کے خلاف زیادتی کرے۔ لیکن جب آپ اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہ ہوں تو گویا آپ نے اس سے زیادتی کرنے کا جواز چھین لیا۔

یہ دوسرا رویہ مومن کے حق میں ڈھال کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب آپ یہ دوسرا رویہ اختیار کریں تو اس کے بعد آپ اپنے حریف کی فطرت کو اپنا وکیل بنا لیتے ہیں۔ اس کے بعد آپ حریف کے

اندر اپنا ایک حامی کھڑا کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد آدمی خود اپنی اندرونی کیفیت کے اعتبار سے مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ آپ کے خلاف زیادتی کرنے سے باز رہے۔ اور جو آدمی خود اپنے خلاف شکست کھا جائے وہ کوئی ظالمانہ اقدام کرنے کے لیے اسی طرح نااہل ہو جاتا ہے جس طرح ایک غبارہ ہوا نکلنے کے بعد اڑنے کے لیے۔

قرآن کی ہدایت

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اگر تم لوگ صبر کا طریقہ اختیار کرو اور اللہ سے ڈرو تو ان کی کوئی سازش تم کو کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکے گی۔ وہ جو کچھ کرتے ہیں اللہ ان سب کا احاطہ کیے ہوئے ہے (وان تصبروا وتتقوا لا یضرکم کیدھم شیئا ان اللہ بما یعملون محیط) آل عمران ۱۲۰

ابن کثیر لکھتے ہیں کہ اس آیت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو یہ ہدایت فرمائی ہے کہ وہ صبر اور تقوی کے ذریعہ شرپسندوں کے شر سے اور فاجروں کی سازش سے اپنے آپ کو بچائیں (یرشدھم اللہ تعالی الی السلامۃ من شر الاشرار وکید الفجار باستعمال الصبر والتقوی) تفسیر ابن کثیر ۱/۳۹۹

صفوۃ التفاسیر میں ہے کہ اگر تم نے ان کی ایذا پر صبر کیا اور اپنے اقوال اور اعمال میں تم اللہ سے ڈرے تو ان کی سازش اور ان کی تدبیر تم کو کچھ نقصان نہ پہنچائے گی۔ پس اللہ نے ان کے ضرر کو ختم کرنے کے لیے صبر اور تقوی کی شرط لگائی (ای ان صبرتم علیٰ اذاھم واتقیتم اللہ فی اقوالکم واعمالکم لا یضرکم مکرھم وکیدھم۔ فشرط اللہ تعالی نفی ضررھم بالصبر والتقوی) ۱/۲۲۶

ہندستان میں فرقہ پرستوں کے جلوس اور ان کے دل آزار نعروں کے سلسلہ میں صبر اور تقویٰ کا انطباق کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ مسلمان ان کی اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہ ہوں۔ وہ ان کی دل آزاری کو یک طرفہ طور پر برداشت کرلیں۔ وہ ردعمل کا اظہار کرنے کے بجائے خاموشی کا رویہ اختیار کریں۔ وہ ہمیشہ صبر کے رویہ پر قائم رہیں۔

دوسرے یہ کہ وہ کسی حال میں بھی تقوی کی روش نہ چھوڑیں۔ ایسے مواقع پر دنیوی انجام سے زیادہ اخروی انجام کو وہ اپنے سامنے رکھیں۔ وہ قوم پرستی کے بجائے اصول پسندی کا انداز اختیار کریں۔ فریق ثانی کی دشمنی کے باوجود وہ اس کے ساتھ بے انصافی نہ کریں۔ وہ جو کچھ کریں یہ سمجھ کر کریں کہ

ان کو اللہ کے یہاں اس کا جواب دینا ہے۔ وہ اللہ کے معاملہ میں حساس اور انسانوں کے معاملہ میں غیر حساس بن جائیں۔

مسلمان اگر اس طرح صبر و تقوی کا طریقہ اختیار کریں تو یقینی طور پر مخالفین کی ہر سازش بے اثر ہو جائے گی۔ ہر مخالفانہ تدبیر ان کے حق میں ناکام ثابت ہوگی۔

مذکورہ آیت میں ارشاد ہوا ہے کہ إن الله بما یعملون محیط (اللہ ان کی سرگرمیوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے) یہ فقرہ بہت بامعنی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے شرپسندوں کے شر سے بچاؤ کے لیے صبر و تقوی کے جس طریقہ کی تعلیم دی ہے وہ ایک ایسا طریقہ ہے جو معاملہ کے اوپر پوری طرح حاوی ہے۔ وہ یقینی طور پر ایک بے خطا طریقہ ہے۔ وہ کبھی ناکام ہونے والا نہیں۔

اللہ نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ وہ انسان کی سرشت اور اس کے مزاج سے پوری طرح باخبر ہے۔ اس نے جو اصلاحی اور دفاعی تدبیر بتائی ہے وہ اپنے علم کلی کے تحت بتائی ہے۔ اللہ کے لیے یہ ایک پوری طرح معلوم مسئلہ کا پوری طرح معلوم جواب ہے۔ یہ حل تمام متعلق پہلوؤں کا مکمل احاطہ کیے ہوئے ہے۔ کوئی بھی صورت حال ایسی نہیں جو اس کے دائرۂ اثر سے خارج ہو۔

ان خصوصیات نے اس حل کو ایک بے خطا حل بنا دیا ہے۔ تم جب بھی اس کو استعمال کرو گے اس کا نتیجہ تمہارے حق میں ہی نکلے گا۔ کوئی بھی انسانی گروہ اس کے دائرہ سے باہر نہیں۔ شر انگیزی کی کوئی بھی آگ ایسی نہیں جو اس طریقہ کو کام میں لا کر بجھائی نہ جا سکتی ہو۔ اس تدبیر کے اندر ہر بم کو ناکارہ بنا دینے کی طاقت ہے، خواہ بظاہر وہ کیسا ہی خطرناک بم کیوں نہ ہو۔

انسان، حیوان

پٹنہ کی خدا بخش لائبریری سے ایک جرنل شائع ہوتا ہے۔ اس کے نمبر ۴۹ (۱۹۸۹) میں شری شمبھر ناتھ پانڈے کا ایک مفصل مضمون چھپا ہے اس کا عنوان ہے "ہندستان میں قومی یک جہتی کی روایات"۔ یہ فخرالدین علی احمد میموریل لکچر کے تحت ۱۹۸۶ میں لکھنؤ کے ایک اجتماع میں پڑھا گیا تھا۔ اس لکچر کے آخر میں انھوں نے اپنا ایک ذاتی واقعہ بیان کیا ہے جو انھیں کے الفاظ میں یہ ہے :

اکتوبر ۱۹۶۹ میں تمام ملک میں گاندھی جی کی پیدائش کا سو سالہ جشن منایا گیا۔ لیکن ہمارے ملک کی ایک فرقہ پرست جماعت نے اس موقع کو فرقہ وارانہ فساد کے لیے چنا اور وہ بھی احمد آباد کے شہر کو، جہاں گاندھی جی نے ۱۹۱۵ میں اپنی قومی خدمات کی ابتدا کی تھی۔ اس وقت وہاں جس صوبائی پارٹی کی سرکار برسراقتدار تھی وہ مرکزی سرکار کے اثر سے باہر تھی۔ دنگائی بے خوف مکانوں کو جلاتے رہے، دکانوں کو لوٹتے رہے۔ اور معصوم انسانوں کا قتل کرتے رہے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گاندھی جی کے ساتھ وابستہ اس شہر سے انسانیت رخصت ہو چکی ہے۔ محترمہ وزیر اعظم اندرا گاندھی نے مجھ سے کہا کہ "بہت سے لوگ وہاں گئے ہیں اور لوٹ کر مجھے اپنی رپورٹیں دی ہیں۔ لیکن مجھے تسلی نہیں ہوئی ہے، میں چاہتی ہوں کہ آپ وہاں جائیں، شہر میں گشت کریں اور اس بات کو دیکھیں کہ حیوانیت کے بیچ میں کیا وہاں انسانیت بھی زندہ ہے ؟"

میں احمد آباد گیا۔ قریب مہینے بھر وہاں رہا۔ زخمیوں سے اسپتال میں ملا، مظلوموں کی دردناک کہانیاں سن کر ان کے آنسو پونچھے۔ قریب چھ ہزار مکان جلا دیے گئے تھے۔ اور وہاں کی سرکار کے بیان کے مطابق ساڑھے تین سو آدمی، لیکن فوجی انٹلی جنس کے آنکڑوں کے مطابق قریب دو ہزار آدمی، اس فرقہ وارانہ فساد میں شہید ہوئے۔ مظلوموں کی کثیر تعداد اقلیتی فرقے کی تھی۔ ایک دن گشت کرتا ہوا میں میمو بائی کی چال میں پہنچا۔ وہاں محلوں کو چال کہتے ہیں۔ میرے پہنچنے پر اس علاقے کے سوڈیڑھ سو آدمی جمع ہو گئے۔ چال کے سبھی مکان جلے ہوئے تھے۔ دو چار مکانوں سے اب بھی دھواں نکل رہا تھا۔ میں نے ان سے سوال کیا "کیوں بھائیو! کیا یہ سب کے سب مکان مسلمانوں کے تھے ؟"

چالیس پینتالیس برس کی عمر کے ایک صاحب نے میری طرف مخاطب ہو کر کہا : "جی نہیں، یہاں ۴۵ گھر مسلمانوں کے تھے اور ۱۲۰ گھر ہندوؤں کے تھے۔"

میں نے پوچھا آپ کا نام؟ جواب ملا "میرا نام کلیان سنگھ ہے۔"

میں نے پھر پوچھا: "تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک بار مسلمانوں کا مجمع آیا جو ہندوؤں کے مکان جلا گیا، اور دوبارہ ہندوؤں کا مجمع آیا جو مسلمانوں کے مکان جلا گیا؟"

وہ صاحب بولے: "جی نہیں۔ مجمع تو ایک ہی آیا تھا اور وہ ہندوؤں کا تھا۔"

میں نے حیران ہو کر پوچھا: "تو کیا ہندوؤں نے ہی ہندوؤں کے مکان جلا دیے؟"

جواب ملا: "جی۔" میں نے کہا: "آپ کا گھر کون سا ہے؟" انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا: "وہ جس سے اب بھی دھواں نکل رہا ہے۔ اس میں میری رہائش بھی تھی اور دکان بھی۔ دکان موٹروں کے ٹائروں اور سائیکل کے ٹائروں کی تھی۔ اسی وجہ سے دھواں اب بھی نکل رہا ہے۔"

میں نے پھر پوچھا: "کلیان سنگھ جی! کتنے کی مالیت رہی ہوگی؟"

جواب ملا: "مکان کی مالیت تو قریب ایک لاکھ ہی ہوگی اور دکان کی بھی کم و بیش اتنی ہی۔"

میں نے حیران ہو کر پوچھا: "آخر ہندوؤں کے مکان جلانے کی وجہ کیا تھی؟"

کلیان سنگھ نے کہا: "مجمع نے آکر ہم لوگوں سے پوچھا کہ ہمیں یہ بتاؤ کون سے مکان ہندوؤں کے ہیں اور کون سے مسلمانوں کے۔ ہم ہندوؤں کے مکانوں کو چھوڑ کر مسلمانوں کے مکان جلانا چاہتے ہیں۔ ہم نے انھیں یہ بتانے سے انکار کر دیا۔ اس پر وہ بہت خفا ہوئے۔ اور لوگوں سے انھوں نے پوچھا۔ سب نے میری بات کی ہی تائید کی۔ بھیڑ میں لوگوں نے چلّا کر کہا: "تب ہم سب مکان جلا دیں گے۔" ہم نے کہا: "آپ کی مرضی۔" انھوں نے سارے مکانوں میں پیٹرول سے آگ لگا دی۔ جب شعلے پوری طرح بھڑک اٹھے تب وہ یہاں سے رخصت ہوئے۔"

میں نے پوچھا: "کلیان سنگھ! تم نے اپنی دو لاکھ کی مالیت خاک میں ملوا دی۔ شاید زندگی بھر کی کمائی۔ اور یہ بتا کیوں نہیں دیا کہ تم ہندو ہو۔"

کلیان سنگھ نے پاس کھڑے ہوئے مسلمانوں سے تعارف کراتے ہوئے کہا: "ہم اور یہ دونوں راجستھان میں سیکر کے ایک ہی گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ پہلے ہم ہندو یہاں آکر بسے اور ہم نے اپنا کاروبار جمایا۔ اس کے برسوں بعد ہمارے مسلم پڑوسیوں نے ہم سے کہا، کیا ہم بھی آپ کے ساتھ وہاں چل سکتے ہیں اور آپ کے زیر سایہ دو روٹی کما سکتے ہیں؟ ہم نے ہامی بھری۔ وہ ہمارے بھروسے اور اطمینان

پر یہاں آئے۔ اچھے کاری گر اور ہنرمند تھے۔ جلد ہی انھوں نے اپنا کاروبار کھڑا کر لیا اور اپنے گھر بھی بنالیے۔ تو جن لوگوں سے ہمارے سیکڑوں برس کے تعلقات تھے، جو ہمارے گاؤں کے لوگ تھے، جو ہمارے بھروسے پر یہاں آئے تھے، اور جنھیں ہم چچا، تاؤ، ماموں کہہ کر پکارتے ہیں، اگر ہم اپنے گھر بچا کر ان کے گھر جلوا دیتے تو پھر اوپر والے کو کیسے منہ دکھاتے ؟"

میرا دل بھر آیا۔ میں اپنے کو ضبط نہ کر سکا۔ میں نے کہا : "کلیان سنگھ! جب تک تیرے جیسے آدمی ہندستان میں ہیں تو اس ملک سے باہمی محبت اور یک جہتی کی جڑوں کو کوئی ہلا نہیں سکتا۔"

فطرتِ انسانی

کلیان سنگھ نے جو کچھ کیا، اپنی فطرت کی پکار پہ کیا۔ ہر آدمی اسی فطرتِ صحیح پر پیدا ہوتا ہے۔ ہر آدمی ابتدائی طور پر اپنی فطرت کے زیر اثر ہی کام کرتا ہے۔ البتہ جب اس کو بھڑکا کر غصہ دلا دیا جائے تو اس وقت اس کی انسانی فطرت دب جاتی ہے اور اس کی حیوانی خصلت ابھر آتی ہے۔ تخریب اور فساد کے تمام واقعات اسی وقت ہوتے ہیں جب کہ انسان کو غصہ دلا کر اس کو اس کی فطرت سے ہٹا دیا گیا ہو۔

جب تک آپ فریق ثانی کو مشتعل نہ کریں، وہ آپ کے لیے "انسان سنگھ" رہتا ہے۔ مگر جب آپ اپنی کسی حرکت سے اس کے اندر اشتعال پیدا کر دیں تو وہ آپ کے لیے "حیوان سنگھ" بن جائے گا۔ اب اس کی گاڑی فطرت کی پٹری سے اتر جائے گی۔ اور جو گاڑی اپنی اصل پٹری سے اتر جائے وہ خود بھی تباہ ہوگی اور دوسرے کے لیے بھی تباہی کا سبب بن جائے گی۔

فریق ثانی کی انسانی فطرت کو جگائیے، اور اس کی حیوانی فطرت کو سویا رہنے دیجیے۔ یہی کامیاب اجتماعی زندگی کا واحد یقینی راز ہے۔

کامیابی کا راز

روزنامہ قومی آواز (۲۱ اپریل ۱۹۹۱) میں مسٹر مشتاق احمد، ایڈوکیٹ سپریم کورٹ آف انڈیا کا مراسلہ چھپا ہے۔ اس مراسلہ کا ایک حصہ یہ ہے :

"جس زمانہ میں میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا طالب علم تھا، وہاں کے شعبۂ تاریخ کے کیپٹن افتخار احمد خاں نے اپنی طالب علمی کے زمانہ کا ایک واقعہ سنایا۔ وہ کیمبرج یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ یورپ کے یہودیوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو چکا تھا۔ وہ جرمنی سے بھگائے گئے تھے۔ افتخار احمد خاں صاحب روزانہ یونیورسٹی کیمپس میں دیکھتے تھے کہ طلبہ کا ایک گروہ ہے۔ اس کا انداز دوسرے طلبہ سے مختلف ہے۔ وہ عام طلبہ سے زیادہ مطالعہ کرتا ہے۔ کھانے کے اوقات میں جلدی سے لنچ کر کے وہ مطالعہ میں یا مطالعہ سے متعلق کاموں میں مصروف ہو جاتا ہے۔ ایک دن انھوں نے طلبہ کے اس خاص گروپ سے سوال کیا کہ وہ لوگ کیوں جنون کی حد تک محنت کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک طالب علم نے جواب دیا : دیکھئے، ہم یہودی ہیں۔ ہم کو جرمنی سے جلاوطن کر دیا گیا ہے۔ یہاں ہم اقلیت میں ہیں۔ اس لیے اگر ہمارا حریف خوب ہے تو ہم کو خوب تر ہونا ہے۔ اگر وہ بہت اچھا ہے تو ہم کو اس سے بھی زیادہ اچھا بننا ہے۔

یہودیوں کی ترقی کا راز یہ ہے کہ انھوں نے اپنے مدمقابل سے زیادہ محنت کر کے امتیازی حیثیت حاصل کرنے کو اپنی زندگی کا شیوہ بنایا۔ محنت کرنے کے لیے ذہنی سکون اور یکسوئی چاہیے۔ اور یکسوئی کے لیے اپنے آپ کو چھوٹے بڑے جھگڑوں سے، احتجاجی کیفیت سے، اپنی ناکامی کا ذمہ دار دوسروں کو ٹھہرانے سے اور نعرہ بازی سے الگ رکھنا پڑتا ہے۔ یہودیوں نے اس حقیقت کو جان لیا کہ جب وہ اقلیت میں ہیں تو ان پر ایک بہت بڑی تاریخی اور سماجی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اور وہ یہ کہ وہ اکثریت سے دگنا زیادہ محنت کریں (صفحہ ۳)

یہ دنیا مقابلہ کی دنیا ہے۔ اس دنیا میں کامیابی کا واحد راز محنت اور دانش مندی ہے۔ خواہ یہودی ہو یا غیر یہودی۔ کوئی عام امت ہو یا خیر امت، ہر ایک کو ایک ہی امتحان میں کھڑا ہونا ہے۔ یہاں کسی کے لیے بھی اس معاملہ میں کوئی استثنا نہیں۔

اس معاملہ میں یہودیوں کا احساس اتنا بڑھا ہوا ہے کہ وہ خود اپنے اداروں میں بھی اپنے نوجوانوں کو رعایت نہیں دیتے، تاکہ ان کا زیادہ محنت کا جذبہ سرد نہ ہونے پائے۔

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے امریکہ میں سائنس کی تعلیم حاصل کی ہے اور اب وہیں ایک تعلیمی ادارہ میں کام کرتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ امریکہ میں آپ کی ملاقات کیا کچھ یہودیوں سے ہوئی۔ انھوں نے کہا ہاں۔ خود ہمارے ادارہ میں کئی یہودی کام کر رہے ہیں۔ ہمارا ڈائرکٹر بھی یہودی ہے۔

میں نے پوچھا کہ کہا جاتا ہے کہ یہودی امریکہ میں بہت کامیاب ہیں جب کہ وہ وہاں کی ایک چھوٹی اقلیت ہیں۔ ان کی اس غیر معمولی کامیابی کا راز کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ایک لفظ میں اس کا راز امتیاز (Excellence) ہے۔ انھوں نے امتیازی لیاقت کو اپنا نشانہ بنایا ہے، اور جب امتیازی لیاقت کا درجہ آجائے تو کوئی بھی آپ کی کامیابی کو روک نہیں سکتا۔

انھوں نے مزید کہا کہ امریکہ میں یہودیوں نے جو تعلیمی ادارے قائم کیے ہیں، ان میں انھوں نے بڑا عجیب اصول رائج کیا ہے۔ ان کے تعلیمی اداروں میں غیر یہودی طالب علموں کو اسکالرشپ کا مستحق بننے کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ امتحان میں ۶۰ فی صد نمبر حاصل کریں۔ مگر یہودیوں کے لیے ان کا معیار بے حد سخت ہے۔ یہودی طالب علموں کو اسکالرشپ حاصل کرنے کے لیے ۷۵ فی صد نمبر لانا ضروری ہے۔ اگر ان کے نمبر ۷۵ فی صد سے کم ہوں تو ان کو اسکالرشپ (وظیفہ) نہیں دیا جائے گا۔

یہودی خود اپنے اداروں میں ایسا کیوں کرتے ہیں۔ ان کا یہ عمل بظاہر سختی معلوم ہوتا ہے۔ مگر وہ سختی نہیں بلکہ سب سے بڑی ہمدردی ہے۔ اس طرح وہ اپنے نوجوانوں میں محنت کا جذبہ ابھارتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے نوجوانوں میں یہ حوصلہ پیدا کرتے ہیں کہ وہ دوسروں کو پیچھے چھوڑ کر ان سے آگے نکل جائیں۔

موجودہ دنیا مقابلہ کی دنیا ہے۔ یہاں جو لوگ رعایت کے طالب ہوں ان کو صرف پچھلی سیٹوں پر جگہ ملتی ہے، اور جو لوگ امتیازی لیاقت کا ثبوت دیں وہ اگلی سیٹوں پر جگہ پانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

کمزور کڑی

زندگی ایک نازک امتحان ہے۔ زندگی کا راز کسی نے تمثیل کے انداز میں ان مختصر لفظوں میں بیان کیا ہے کہ کسی زنجیر کی طاقت اس کی اُس کڑی سے جانچی جاتی ہے جو زنجیر کی سب سے کمزور کڑی ہو:

The strength of the chain is tested through its weakest link.

کسی زنجیر میں ایک سو کڑیاں ہوں۔ اس کی ۹۹ کڑیاں مضبوط ہوں۔ صرف ایک کڑی کمزور ہو۔ ایسی زنجیر جب استعمال کی جائے گی تو وہ ۹۹ کڑیوں کی مضبوطی کے باوجود ٹوٹ جائے گی۔ اور اس کے ٹوٹنے کا سبب وہی ایک کڑی ہوگی جس کو مضبوط نہیں بنایا گیا تھا۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا حال اسی قسم کی زنجیر جیسا ہو رہا ہے۔ پچھلے سو برس کے اندر مسلمانوں کے درمیان بے شمار رہنما اٹھے۔ انھوں نے مسلمانوں کو مختلف حیثیتوں سے تیار کرنے کی کوشش کی۔ مثلاً ــــــ فخر ماضی، قومی تشخص، جذبۂ ملی، جوش جہاد، شوق شہادت، ولولۂ انقلاب، وغیرہ۔ مگر ایک کام ایسا تھا جو سرے سے انجام نہیں دیا گیا۔ یہ کام تھا، مسلمانوں کو باشعور بنانا۔

باشعور بنانا کیا ہے۔ باشعور بنانا یہ ہے کہ آدمی کو زندگی کی سائنس بتائی جائے۔ اس کو فطرت کے ان قوانین سے باخبر کیا جائے جن کی رعایت کرتے ہوئے اُس کو دنیا میں زندگی گزارنا ہے۔ اس کو ان حقائقِ حیات کا علم دیا جائے جن کے بغیر موجودہ دنیا میں کامیاب زندگی کی تعمیر نہیں کی جاسکتی۔ بے شعور آدمی صرف اپنے آپ کو جانتا ہے، باشعور آدمی اپنے ساتھ دوسروں کو بھی جانتا ہے۔ بے شعور آدمی جذباتی ردعمل کے تحت کام کرتا ہے، باشعور آدمی عقلی فیصلہ کے تحت عمل کرتا ہے۔ بے شعور آدمی کا طریقہ غیر منظم ہنگامہ آرائی کا ہوتا ہے، باشعور آدمی کا طریقہ منصوبہ بند اقدام کا۔

موجودہ صدی مسلم دنیا میں تحریکوں کی صدی ہے۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کے درمیان بے شمار تحریکیں اٹھیں۔ ان تحریکوں نے سب کچھ کیا مگر وہی ایک ضروری کام نہیں کیا جس کو تعمیر شعور کہا جاتا ہے۔ مسلمانوں کی یہ بے شعوری ان کی مضبوط زنجیر کی کمزور کڑی ثابت ہوئی۔ جو کچھ انھوں نے دوسرے اعتبار سے بظاہر پایا تھا، وہ عین اسی کمزور کڑی کے مقام پر انھوں نے کھو دیا۔

اس کی ایک مثال ہندستان کے فرقہ وارانہ فسادات ہیں۔ یہ فسادات کوئی استثنائی چیز نہیں ہیں۔ دنیا کے ہر سماج میں وہ اسباب موجود رہتے ہیں جن کو اگر بڑھنے کا موقع دیا جائے تو وہ خوں ریز فساد کی صورت اختیار کر لیں گے۔

ان حالات میں وہی کرنا چاہئے جس کو حدیث میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: ان الفتنة نائمة لعن الله من ایقظها۔ یعنی اسباب فساد کو خوابیدہ حالت میں پڑا رہنے دیا جائے۔ اس کی نوبت نہ آنے دی جائے کہ اسباب فساد بڑھ کر واقعۂ فساد کی صورت اختیار کر لیں۔ انسانی سماج سے فساد کے امکان کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ حسن تدبیر کے ذریعہ ایسا کیا جا سکتا ہے کہ امکان کو واقعہ بننے سے روک دیا جائے۔ تاہم یہ ایک شعوری عمل ہے۔ مسلمان چوں کہ اس معاملہ میں شعور سے بہرہ مند نہ تھے، اس لئے وہ فساد کے خلاف تدبیر کا انداز بھی اختیار نہ کر سکے۔

کسی بستی کے مسلمانوں کو یہ خبر ملتی ہے کہ فریق ثانی ان کے خلاف سازش یا اشتعال انگیزی کر رہا ہے۔ اس قسم کی خبر سننے کے بعد مسلمانوں کے اندر فوری طور پر جو ردعمل ہوتا ہے وہ صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے مقابلہ کے لئے اقدام۔ اس معاملہ میں ان کی بےشعوری اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ ہزاروں بار کے ناکام تجربہ کے باوجود اب تک وہ اپنے اس طریق کار پر نظر ثانی نہ کر سکے۔ یہی تمام فسادات کا خلاصہ ہے۔

اس وقت سب سے زیادہ ضروری کام یہ ہے کہ مسلمانوں کو یہ شعور دیا جائے کہ ایسے مواقع پر صحیح طریق کار یہ ہے کہ وہ مقابلہ کے ذہن سے نہ سوچیں بلکہ تدبیر کے ذہن سے سوچیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے یہی طریقہ ثابت ہوتا ہے۔ اور عقل بھی اسی کی صحت کی تصدیق کرتی ہے۔

مسلمانوں کے اندر اگر یہ شعور پیدا ہو جائے کہ اس قسم کی خبر سننے کے بعد وہ مقابلہ کے انداز میں سوچنے کے بجائے حکیمانہ تدبیر کے انداز میں سوچیں تو فسادات کا مسئلہ اس طرح ختم ہو جائے گا جیسے کہ اس کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

زندگی میں اختلاف اور نزاع کی صورت لازمی طور پر پیش آتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ آدمی اگر باشعور ہو تو وہ معاملہ کو خوش تدبیری کے ذریعہ حل کرے گا۔ اور اگر آدمی باشعور نہ ہو تو وہ جوش اور ردعمل کا مظاہرہ کرے گا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ شکایت کا ایک معمولی واقعہ بڑھ کر بربادی اور ہلاکت تک پہنچ جائے گا۔ اس کو تقابلی طور پر سمجھنے کے لئے کچھ متعین مثال لیجئے۔

پہلی مثال

محمد نعیم صاحب (پیدائش ۱۹۶۲) راجستھان (گنگاپور) کے رہنے والے ہیں۔ وہ الرسالہ کے قاری ہیں۔ ۲۸ اپریل ۱۹۹۱ کو دہلی میں ان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کوٹہ کے فساد (اکتوبر ۱۹۸۸) کی تفصیلات بتائیں۔ انھوں نے کہا کہ کوٹہ میں ہندوؤں کی طرف سے گنیش چترتھی کا جلوس نکالا گیا تھا۔ وہ نعرہ لگاتا ہوا گھنٹہ گھر کے علاقہ میں پہنچا۔ یہ مسلم علاقہ ہے۔ یہاں وہ اشتعال انگیز نعرے لگانے لگے مثلاً ہندستان میں رہنا ہوگا، بندے ماترم کہنا ہوگا۔ اب کچھ مسلمان سڑک پر نکل آئے اور ان کو نعرہ بازی سے روکنا چاہا۔ مگر وہ لوگ نہیں رکے۔ اس کے بعد مزید مڈبھیڑ ہوئی۔ یہاں تک کہ ٹکراؤ کی نوبت آگئی اور پھر باقاعدہ فساد شروع ہوگیا۔ پندرہ مسلمان اس میں مارے گئے اور کروروں روپیے کی جائدادیں جلادی گئیں۔

اس کے بعد انھوں اس کے برعکس ایک مثال بتائی۔ انھوں نے کہا کہ کوٹہ کے فساد سے ایک دن پہلے اسی راجستھان کے مقام بارہ میں ہندوؤں نے اسی طرح گنیش چترتھی کا جلوس نکالا۔ یہ جلوس چلتا ہوا مانگرول دروازہ پہنچا۔ وہاں ایک مسجد کے سامنے خوب زور زور سے نعرہ لگانے لگا۔ یہاں بھی وہی نعرہ تھا کہ: ہندستان میں رہنا ہوگا، بندے ماترم کہنا ہوگا۔ مسجد میں نیچے دکانیں ہیں، اوپر مسجد ہے۔ یہاں چھت پر مسلم نوجوانوں کی ایک تعداد جمع ہوگئی۔ وہ لوگ نعرہ کو سن کر غصہ تھے اور جلوس کے خلاف کارروائی کرنا چاہتے تھے۔ محمد نعیم صاحب ایک جماعت کے ساتھ بارہ گئے تھے اور اس وقت مانگرول کی اسی مسجد میں اپنے دس ساتھیوں کے ہمراہ موجود تھے۔ محمد نعیم صاحب فوراً مسلم نوجوانوں کے پاس آئے جو اس وقت جوش میں بھرے ہوئے تھے۔ ان کو مسجد کے اندر لے گئے۔ ان سے کہا کہ آپ غصہ کیوں ہو رہے ہیں۔ ان کا نعرہ لفظ ہی تو ہے۔ وہ کوئی پتھر یا تیر تو نہیں جو آپ کے جسم کو لگ رہا ہو۔ پھر ان لوگوں کو صحابہ کے واقعات سنائے کہ انھوں نے کس طرح صبر کیا۔ اس طرح آدھ گھنٹہ تک انھوں نے مسلم نوجوانوں کو روکے رکھا۔ یہاں تک کہ جلوس چلا گیا۔

ایک ہی واقعہ ایک جگہ فساد بن جاتا ہے اور دوسری جگہ فساد نہیں بنتا۔ اس فرق کا سبب یہ ہے کہ ایک جگہ مسلمانوں نے بے صبری کی، اور دوسری جگہ انھوں نے صبر و اعراض کا طریقہ اختیار کیا۔ ایک جگہ انھوں نے بم پر بم مارا، اور دوسری جگہ انھوں نے بم کو ڈیفیوز کر دیا۔

دوسری مثال

یہ الور (راجستھان) کا واقعہ ہے جس کو مولانا محمد حنیف صاحب نے دہلی میں دسمبر ۱۹۹۰ میں مجھے بتایا۔ الور کے کچھ فرقہ پرست ہندوؤں نے یہ سازش کی کہ الور میں فساد کیا جائے اور مسلمانوں کو لوٹا اور جلایا جائے۔ یہ واقعہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۹۰ سے کچھ پہلے کا ہے۔

اسی زمانہ میں انھوں نے ایک مقامی ہندی اخبار میں ایک بناوٹی خبر چھپوائی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ خان پور کے علاقہ کے میو وہاں کے ہندوؤں کو دھمکی دے رہے ہیں کہ ۳۰ اکتوبر کو اگر بابری مسجد کو نقصان پہنچا تو ہم تم لوگوں کو ذبح کر دیں گے۔ اس دھمکی کی وجہ سے اس علاقے کے ہندو بھاگ رہے ہیں، حتی کہ ایک ہندو کا نام دے کر کہا گیا کہ فلاں ہندو اسی بنا پر وہاں سے بھاگ کر باہر چلا گیا ہے۔ یہ مسلمان مسجدوں میں ہتھیار جمع کر رہے ہیں۔

یہ خبر ہندی اخبار میں چھپی تو الور میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تناؤ کا ماحول پیدا ہو گیا۔ کچھ ہندو لڑکوں نے مظاہرہ کیا۔ اندیشہ ہوا کہ الور میں فساد ہو جائے گا۔

اب ایک صورت یہ تھی کہ الور کے مسلمان "مقابلہ" کے انداز میں سوچتے۔ وہ ہتھیار جمع کرنے میں لگ جاتے۔ مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس کے بجائے کچھ سمجھ دار مسلمان الور کے دوسرے کئی ہندی اخباروں کے ذمہ داروں سے ملے۔ انھوں نے بتایا کہ فلاں اخبار جھوٹی خبریں چھاپ کر شہر میں فساد کا ماحول پیدا کر رہا ہے۔ اخبار والوں نے کہا کہ آپ تردید لکھ کر دے دیجئے، ہم اس کو اپنے اخبار میں چھاپ دیں گے۔ مگر یہ مسلمان اس راز کو سمجھتے تھے کہ صرف مسلمان کی تردید اس فضا کو ختم کرنے کے لئے کافی نہیں۔ چنانچہ انھوں نے اصرار کیا کہ آپ خود اپنے اسٹاف کے کچھ لوگوں کو موقع پر بھیج کر براہ راست اس کی تحقیق کرائیں۔ وہ لوگ راضی ہو گئے۔ چنانچہ مسلمانوں نے دو گاڑیوں کا انتظام کیا اور تین ہندی اخباروں کے نمائندوں کو ساتھ لے کر خان پور کے علاقہ میں گئے۔

وہاں انھوں نے تفصیل کے ساتھ حالات کا جائزہ لیا۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں سے ملے۔ ان مسجدوں میں گئے جن کی بابت مذکورہ ہندی اخبار نے کہا تھا کہ وہاں ہتھیار جمع کئے جا رہے ہیں۔ وہ اس ہندو کے گھر بھی گئے جس کی بابت خبر میں بتایا گیا تھا کہ وہ مسلمانوں کی دھمکی سے خوف زدہ ہو کر اپنے گھر سے بھاگ گیا ہے۔ انھوں نے اس آدمی کے بھائی سے ملاقات کی۔ بھائی نے بتایا کہ دھمکی کی بات

بالکل بے بنیاد ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ اس وقت باہر چلا گیا ہے مگر اس کا یہ سفر عارضی طور پر ایک ذاتی سبب کی بنا پر ہے نہ کہ کسی قسم کی دھمکی کی بنا پر۔

ہندی اخباروں کی اس پارٹی نے اپنی ذاتی تحقیق میں یہ پایا کہ مذکورہ خبر سراسر بے بنیاد اور گھڑی ہوئی تھی۔ اس کا کوئی جز بھی سچائی پر مبنی نہ تھا۔ اس کے بعد ان اخباروں کے ہندو نامہ نگاروں نے مفصل رپورٹ مرتب کی اور اس کو اپنے اخباروں میں شائع کیا جس میں کہا گیا تھا کہ ہم لوگ خود خان پور کے علاقہ میں گئے اور وہاں ذاتی طور پر تمام باتوں کی تحقیق کی اور ہم نے پایا کہ یہ خبر سراسر غلط ہے۔ اس کے بعد تناؤ اور فساد کا ماحول اپنے آپ ختم ہو گیا۔

اب اس کے برعکس مثال لیجئے۔ یہ مثال کانپور سے تعلق رکھتی ہے۔ ۱۷ جنوری ۱۹۹۱ کو میری ملاقات جناب نیاز احمد کانپوری (Tel.213169) سے ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ یوپی میں ہندی کے دو اخبار ہیں، دینک جاگرن، دینک آج۔ ان اخباروں میں باہم مقابلہ جاری رہتا ہے۔ وہ اس کوشش میں رہتے ہیں کہ کوئی سنسنی خیز خبر نکالیں اور اس کو بڑھا چڑھا کر چھاپیں تاکہ ان کا اخبار زیادہ بک سکے۔

دینک جاگرن نے "۳۰ اکتوبر ۱۹۹۰" سے کچھ پہلے یہ خبر چھاپی کہ کانپور کے مسلمان ہتھیار جمع کر رہے ہیں۔ مسلمان ہندوؤں کے خلاف فساد کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں فرضی طور پر کچھ مسلم محلوں بابوپوروہ چمن گنج، فیتھ فل گنج وغیرہ کا نام بھی چھاپ دیا۔ اس کے فوراً بعد مسلمانوں نے یہ کیا کہ احتجاجی طور پر دینک جاگرن کی کاپیاں لے کر کئی روز تک ان کو سڑکوں پر جلاتے رہے۔ مسلم ہوٹلوں میں دینک جاگرن کا بائیکاٹ کیا گیا، وغیرہ۔

اس سلسلہ میں دو طرفہ طور پر مختلف قصے ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ نام نہاد انصاف پارٹی کے ایک مقامی لیڈر کے کہنے پر مسلمانوں نے "کانپور بند" کی کال دی۔ ۸ دسمبر کو کانپور کے مسلمانوں کی دکانیں بند کرائی گئیں۔ مسلم نوجوانوں نے جلوس نکالے۔ بعض محلوں میں دکانیں بند کروانے کے سلسلہ میں جھڑپیں ہوئیں۔ جلوس کے لوگ تشدد پر اتر آئے۔ اس کے بعد پولیس آئی۔ پولیس نے ہوائی فائر کیا۔ اس کے نتیجہ میں بھگدڑ مچی اور کچھ مسلمانوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ بعد کو جب مسلمان چھوڑے گئے تو مسلمانوں نے دوبارہ جلوس نکالا۔ اس جلوس کے دوران ایک واقعہ پیش آیا جس کے نتیجہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں ٹکراؤ ہو گیا۔ پولیس اور مسلمانوں کے درمیان باقاعدہ لڑائی ہوئی۔ مسلمان اپنی چھتوں پر چڑھ کر پولیس

کے خلاف پتھر اور بم وغیرہ آزادانہ استعمال کرتے رہے۔ یہ واقعہ ۱۱ دسمبر ۱۹۹۱ کا ہے۔

یہ فساد تین دن تک باقاعدہ جاری رہا۔ جناب نیاز احمد صاحب کے بیان کے مطابق ۱۲ مسلمان مارے گئے۔ ۱۰۹ دکانوں اور مکانوں کو جلادیا گیا۔ وغیرہ۔

وہی واقعہ جوالور میں خوش تدبیری کے نتیجہ میں ایک قطرہ خون بہائے بغیر ختم ہوگیا، وہی واقعہ کانپور میں جان ومال کی تباہی کا سبب بن گیا۔ اور اس کے نتیجہ میں نفرت اور تعصب کا جو زہر مقامی طور پر پھیلا اور پریس کے ذریعہ پورے ملک کے لوگوں کے دلوں میں داخل ہوا، وہ اس کے علاوہ ہے۔

یہ دنیا ایک امتحان گاہ ہے۔ یہاں ہمیشہ ایسا ہوگا کہ مختلف عنوان سے ایک اور دوسرے کے درمیان نزاع اور کش مکش کی صورتیں پیدا ہوں۔ ایسا ایک خاندان کے افراد کے درمیان بھی ہوگا اور ملک کے مختلف فرقوں کے درمیان بھی۔ ایسے واقعات ایک قومی سماج میں بھی پیش آئیں گے اور دو قومی سماج میں بھی۔

ایسی حالت میں جو لوگ ایسا کریں کہ وہ ہر ناخوشگوار واقعہ پر جھنجھلا کر لڑنے لگیں تو وہ صرف اپنی ناکامی کا گڑھا کھودیں گے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ ایسے مواقع پر ردعمل کے بجائے حکیمانہ عمل کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ آگ کو بھڑکانے کے بجائے آگ کو بجھانے کی تدبیر کی جائے۔ فساد کے بم پر بم نہ مارا جائے، بلکہ فساد کے بم کو خوش تدبیری سے ڈیفیوز (ناکارہ) کردیا جائے۔

اس طرح کے معاملات کا یہی ایک واحد حل ہے۔ اس کے سوا ہر دوسرا طریقہ فساد میں اضافہ کے سوا کسی اور انجام تک پہنچنے والا نہیں۔ آج سب سے زیادہ ضروری کام یہ ہے کہ مسلمانوں کو باشعور بنایا جائے۔ یہ مسئلہ بے شعوری کے سبب سے پیدا ہوا ہے اور مسلمانوں کو باشعور بنا کر اسے ختم کیا جاسکتا ہے۔

مسائل، مواقع

زندگی میں مسائل بھی ہوتے ہیں اور مواقع بھی، ٹھیک اسی طرح جس طرح گلاب کے درخت میں کانٹے بھی ہوتے ہیں اور پھول بھی۔ ہندستانی مسلمانوں کا یہ المیہ ہے کہ ان کے لکھنے اور بولنے والے طبقہ نے ان کے سامنے صرف مسائل کی مبالغہ آمیز داستان سنائی۔ انھوں نے مسلمانوں کو مواقع سے باخبر نہیں کیا۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمان خلاف واقعہ طور پر یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اس ملک میں ان کے لیے مسائل ہی مسائل ہیں، یہاں ان کے لیے زندگی اور ترقی کے مواقع موجود نہیں۔

یورپ کے سفر میں میری ملاقات ایک ہندستانی مسلمان سے ہوئی۔ وہ ایک یورپی شہر میں ایک انگریزی اخبار کے ادارتی اسٹاف میں تھے۔ انھیں ایک باعزت زندگی حاصل تھی اور ان کے بچے وہاں کے ایک اچھے اسکول میں تعلیم پا رہے تھے۔ ہندستانی مسلمانوں کا ذکر آیا تو میں نے کہا کہ ہندستان کے مسلمانوں کا بنیادی مسئلہ تعلیم ہے۔ تعلیم میں پیچھے ہونے کی وجہ سے وہ ہر شعبہ میں پیچھے ہیں۔ اور اگر وہ تعلیم میں آگے بڑھ جائیں تو اس کے بعد وہ اپنے آپ زندگی کے ہر شعبہ میں آگے بڑھ جائیں گے۔ اس سلسلہ میں تعلیم کی اہمیت بتاتے ہوئے میں نے سابق امریکی صدر لنڈن جانسن کا یہ قول دہرایا :

Learning is the basic to our hopes for America

میری بات سن کر انھوں نے کرسی پر اپنا پہلو بدلا اور بے پروائی کے انداز میں بولے : آپ لرننگ (learning) کی بات کرتے ہیں اور یہاں تو اب ڈی لرننگ (de-learning) کی تحریک چل رہی ہے۔

ان کی بات سن کر مجھے سخت جھٹکا لگا۔ میں نے کہا کہ جناب، یہ بتائیے کہ آپ یہاں جو زندگی حاصل کئے ہوئے ہیں وہ لرننگ کی بنیاد پر ہے یا ڈی لرننگ کی بنیاد پر۔ اور اپنے بچوں کو آپ لرننگ کے ادارہ میں داخل کیے ہوئے ہیں یا ڈی لرننگ کے میدان میں گھومنے کے لیے انھیں چھوڑ دیا ہے۔ میرے اس سوال پر وہ مسکرا کر خاموش ہو گئے۔

اس طرح کے مسلسل تجربات کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ نام نہاد مسلم دشمن طاقتیں نہیں ہیں بلکہ خود مسلمانوں کے نام نہاد دانشور اور ان کے رہنما ہیں۔ یہ لوگ خود اپنے معاملات نہایت ہوشیاری کے ساتھ حل کئے ہوئے ہیں۔ مگر جب وہ پریس اور پلیٹ فارم سے

مسلمانوں کو خطاب کرتے ہیں تو وہ ان کو اس کے بالکل برعکس چیز کی خبر دیتے ہیں جس کو وہ اپنی ذاتی زندگی میں اختیار کیے ہوئے ہیں۔

ایک علامتی مثال

ہندستان کے ایک مشہور مسلم دانشور کی ایک انگریزی کتاب پنگوئن بکس (Penguin Books) سے چھپی ہے۔ ۴۴۵ صفحہ کی اس کتاب کا نام ہے محمدؐ اور قرآن :

Muhammad and the Quran (1991)

اس کتاب کے آغاز میں ڈیڈیکیشن کا ایک صفحہ شامل ہے۔ اس میں مصنف نے کہا ہے کہ ——— میرے بیٹوں مسٹر اکمل اور مسٹر کمال کے نام، جنھوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ اس مذہب کے بارہ میں صحیح واقفیت حاصل کریں جن کے اندر وہ پیدا ہوئے ہیں، تاکہ وہ ہارورڈ یونی ورسٹی اور ایل یونی ورسٹی میں اپنے دوستوں سے معلوماتی تبادلہ کر سکیں جہاں اب بھی اسلام کے بارہ میں غلط فہمیاں موجود ہیں۔ بنجمن ڈزرائیلی کے الفاظ میں، وہ اپنی غلط آگہی کی تصحیح کر سکیں :

> To my sons, Akmal and Kamal, who wanted to have a correct perception of the religion into which they have been born, so that they could share the knowledge with their friends of Harvard and Yale, where misconceptions about Islam still persist. In the words of Benjamin Desraeli, they may have to 'learn to unlearn.'

اسلام کے بارہ میں دوسروں کی تصحیح فکر کی کوشش قابل قدر ہے۔ تاہم ایک اور معاملہ میں خود مصنف اور ان کے جیسے ہزاروں مسلم دانشور ہیبت ناک غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور انھیں چاہیے کہ وہ اپنی اس غلط فکری کی تصحیح کریں۔ یہ ہندستان میں مسلمانوں کی صورت حال کا مسئلہ ہے جس کے معاملہ میں مصنف سمیت، ہزاروں مسلم دانشور اور رہنما ہلاکت خیز حد تک شدید غلط فکری کا شکار ہیں۔

وہ غلط فکری یہ ہے کہ ان مسلم دانشوروں اور رہنماؤں میں سے ایک ایک شخص ہندستان میں اعلیٰ حیثیت حاصل کیے ہوئے ہے۔ ان کے بیٹے اسی ملک کے حالات میں بڑی بڑی ترقیاں کر رہے ہیں۔ مگر جب مسلم ملت کا مسئلہ زیر بحث آتا ہے تو وہ خود اپنی اس دریافت کردہ حقیقت سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔ اب اچانک انھیں نظر آنے لگتا ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کے لیے تباہی و بربادی کے سوا کوئی اور انجام

نہیں۔ وہ اپنے خاندان کو ترقی کے اعلیٰ مدارج پر پہنچا رہے ہیں، مگر انھیں نہیں معلوم کہ وہ ملت کے وسیع تر خاندان کو کس طرح ترقی کا راستہ دکھائیں۔

مذکورہ مسلم دانشور کی مثال لیجئے، ایک طرف ان کا حال یہ ہے کہ ان کے بیٹے ۱۹۴۷ کے بعد کے ہندستان میں پیدا ہوتے ہیں۔ انھیں یہاں وہ امکانات مل جاتے ہیں جن کو استعمال کرکے وہ بہترین تعلیم حاصل کریں۔ اس کے بعد انھیں مغرب میں مواقع مل جاتے ہیں تاکہ وہاں کی یونی ورسٹیوں میں داخلہ لے کر مزید اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے اپنے لیے شاندار مستقبل کی تعمیر کرسکیں۔ مگر انھیں مسلم دانشور کے سامنے جب ملت کا مسئلہ آتا ہے تو وہ ملت کے بارہ میں ان تمام امکانات سے بالکل بے خبر ہو جاتے ہیں۔ اپنے بچوں کے لیے انھیں اسی ملک میں روشن مستقبل دکھائی دیتا ہے اور قوم کے بچوں کے لیے صرف تاریک مستقبل۔

یہاں میں مذکورہ مسلم دانشور کے ایک مضمون کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جس کا تعلق ہندستانی مسلمانوں سے ہے اور جو دہلی کے انگریزی اخبار ہندستان ٹائمس (۲۴ نومبر ۱۹۹۱) میں شائع ہوا ہے۔

موصوف اپنے مضمون میں بتاتے ہیں کہ مسلمان اس ملک میں نہایت بری حالت (miserable condition) میں ہیں۔ ہندو فرقہ پرست جماعتوں کی مسلم دشمنی مسلمانوں کے لیے سخت نقصان دہ ثابت ہو رہی ہے۔ ان جماعتوں نے اکثریتی فرقہ کے اندر متعصبانہ ذہنیت پیدا کر دی ہے۔ مسلمان سرکاری دفتروں میں جاتے ہیں تو ان کے ساتھ سرد مہری کا سلوک کیا جاتا ہے۔ حکومت کو مسلمانوں کی تباہی و بربادی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اندرا گاندھی کے زمانہ میں گوپال سنگھ کمیشن اور گجرال کمیشن نے اقلیتی مفاد کے لیے سفارشیں پیش کیں مگر اب تک ان کی تعمیل نہ جا سکی۔ فرقہ وارانہ فساد نے مسلمانوں کو عدم تحفظ کے احساس میں مبتلا کر دیا ہے۔ وغیرہ، وغیرہ۔

مذکورہ دانشور کا پورا مضمون اسی قسم کی مایوس کن باتوں سے بھرا ہوا ہے۔ اس کو میں نے پڑھا تو بے اختیار میری زبان سے نکلا: کاش یہ دانشور مذکورہ مضمون کے بجائے ایک اور مضمون لکھتے اور اس میں یہ بتاتے کہ ان کے بچوں نے کس طرح اسی ہندستان میں پڑھ کر اتنی ترقی کی کہ وہ امریکہ کی یونی ورسٹیوں میں پہنچ گئے اور اب وہ شاندار مستقبل کی طرف اپنا سفر طے کر رہے ہیں۔ اگر وہ ایسا کرتے تو وہ ہندستانی مسلمانوں کو زیادہ فائدہ پہنچاتے۔ کیوں کہ اس سے مسلمانوں کو تجرباتی طور پر یہ معلوم ہوتا کہ وہ اسی ملک میں اعلیٰ ترین ترقی کر سکتے ہیں۔ مذکورہ مضمون تو انھیں مایوسی کے سوا کوئی اور تحفہ دینے والا نہیں۔

سروے کی ضرورت

ایک صاحب نے ایک مسلم رہنما کا تذکرہ کیا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ ہندستان میں مسلمانوں کو تباہ کیا جارہا ہے اور یہ عمل ۱۹۴۷ سے نہایت منظم طور پر جاری ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ اس معاملہ کا سروے کیجئے۔ اور سب سے پہلے خود ان رہنما حضرات کا جائزہ لیجئے جو اس ملی حادثہ کی خبر دے رہے ہیں۔ یہ رہنما حضرات بھی مسلم ملت کا جزء ہیں۔ اس لیے ان کا بھی وہی انجام ہونا چاہیے جو ملت کے دوسرے افراد کا انجام ہو رہا ہے۔

میں نے کہا کہ آپ باریش رہنماؤں اور بے ریش رہنماؤں کی ایک فہرست بنائیے۔ اس کے بعد ایک ایک شخص کے بارہ میں پتہ کیجئے کہ ۱۹۴۷ میں اس کی کیا حالت تھی اور آج اس کی کیا حالت ہے۔

آپ معلوم کیجئے کہ ۱۹۴۷ میں ان کی ذات پر ماہانہ کتنا خرچ ہوتا تھا اور آج ان کی ذات پر ماہانہ کتنا خرچ ہوتا ہے۔ ۱۹۴۷ میں ان کے پاس سفر کے لیے کون سی سواری تھی اور آج ان کے پاس سفر کے لیے کون سی سواری ہے۔ ۱۹۴۷ میں وہ کس مکان میں رہتے تھے اور آج وہ اور ان کا خاندان کس مکان میں رہتا ہے۔ ۱۹۴۷ میں سالانہ وہ ہوائی جہاز کا کتنا سفر کرتے تھے اور آج وہ جہاز کا کتنا سفر کرتے ہیں۔ ۱۹۴۷ میں ان کی کتنی کتابیں چھپی تھیں اور اب ان کی کتنی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ ۱۹۴۷ میں وہ کتنے اداروں کی صدارت اور نظامت کر رہے تھے اور آج وہ کتنے اداروں کی صدارت اور نظامت کر رہے ہیں۔ ۱۹۴۷ میں ان کی قومی یا بین اقوامی پوزیشن کیا تھی اور آج ان کی قومی یا بین اقوامی پوزیشن کیا ہے۔

اس سروے میں آپ حیرت انگیز طور پر پائیں گے کہ بلا استثناء ہر رہنما، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، ۱۹۴۷ کے بعد اس نے غیر معمولی ترقی کی ہے۔ پھر جب مسلم رہنما اس ملک میں شاندار ترقیاں حاصل کر رہے ہیں تو عام مسلمان آخر کس بنا پر ترقی سے محروم رہیں گے۔

اصلی سبب

اس عجیب و غریب تضاد کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب بالکل سادہ ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہر سماج میں، خواہ وہ کوئی مسلم سماج ہو یا کوئی مشترک سماج، ہمیشہ دونوں قسم کے حالات موجود رہتے ہیں عُسر کے حالات بھی اور یُسر کے حالات بھی۔ مسائل بھی اور مواقع بھی۔ ایسا قانون فطرت کے تحت ہوتا ہے۔ اس لیے کوئی بھی سماج کبھی اس سے خالی نہیں ہو سکتا۔

اب نام نہاد مسلم دانشور اور مسلم رہنما یہ کر رہے ہیں کہ جب اپنی ذات کا اور اپنے بیٹوں کا معاملہ ہوتا ہے تو وہ مسائل کو نظر انداز کرتے ہیں اور مواقع کو استعمال کرتے ہیں۔ اور جب وہ ملت کے مسئلہ پر بولتے ہیں تو اس کے برعکس وہ ایسا کرتے ہیں کہ مواقع کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور مسائل کو بڑھا چڑھا کر لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ان کے اسی تضاد کا یہ نتیجہ ہے کہ ملت تباہ ہے اور وہ خود اسی ملک میں شاندار ترقیاں حاصل کر رہے ہیں۔

موجودہ دنیا کبھی بے مسائل نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ دنیا مواقع حیات سے خالی ہو جائے۔ عقل مند آدمی وہ ہے جو مسائل سے صرف نظر کرے اور مواقع کو بھر پور طور پر استعمال کرے۔ یہی اس دنیا میں کامیابی کا واحد راز ہے۔ جو لوگ اس حکمت کو اختیار کریں وہ اس دنیا میں کبھی ترقی اور کامیابی سے محروم نہیں رہ سکتے۔

مسلمانوں کے نام نہاد رہنما یہ متضاد رویہ کیوں اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اس کی ایک معلوم وجہ ہے۔ اگر وہ مسلمانوں کو وہ آزمودہ تدبیر بتائیں جس سے انھوں نے کامیابی حاصل کی ہے تو ان کو "موافقت" کی زبان بولنی پڑے گی۔ کیوں کہ یہ دراصل موافقت کا طریقہ ہے جس نے ان کو ملک کے اندر اور ملک کے باہر ترقی کے مواقع دے رکھے ہیں۔

مگر انھیں ڈر ہے کہ ایسا کرتے ہی وہ مسلمانوں کے درمیان اپنی قیادت کھو دیں گے۔ کیونکہ مسلمان اپنے موجودہ مزاج کی بنا پر، موافقت کی باتوں کو بزدلی سمجھتے ہیں اور ٹکراؤ کی باتوں کو جہاد۔ مسلمانوں کے درمیان ٹکراؤ کی باتیں کرنے سے لیڈری ملتی ہے۔ اور جو شخص موافقت اور ایڈجسٹمنٹ کی بات کرے وہ فوراً مسلمانوں کی نظر میں غیر مقبول ہو جاتا ہے۔

یہ نام نہاد لیڈر خوب جانتے ہیں کہ ترقی کا راز حالات سے موافقت میں ہے اور وہ اپنی ذات کے معاملہ میں مکمل طور پر اسی طریقہ کو اختیار کیے ہوئے ہیں۔ مگر جب وہ اسٹیج پر آتے ہیں تو وہ ٹکراؤ کی زبان بولتے ہیں تاکہ مسلمانوں کے اندر اپنی مقبولیت کو باقی رکھ سکیں۔

کرنے کا کام

۱۹۹۱ کی بات ہے۔ کچھ مسلم نوجوان میرے پاس آئے۔ انھوں نے کہا کہ ہم ایک کانفرنس کرنا چاہتے ہیں، آپ بھی اس میں ہمارا تعاون کیجیے۔ میں نے پوچھا کہ اس کانفرنس کا موضوع (theme) کیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ "اقدام امت"۔ میں نے کہا کہ اگر آپ ایک لفظ بدل دیں تو میں آپ کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے تیار ہوں۔ انھوں نے پوچھا کہ وہ کیا لفظ ہے۔ میں نے کہا کہ آپ اس کو اقدام امت کانفرنس نہ کہیں بلکہ اس کو تیاریٔ امت کانفرنس کی حیثیت دے دیں۔ انھوں نے اس تبدیلی کو قبول نہیں کیا اور واپس چلے گئے۔

زندگی میں ہمیشہ دو مرحلے ہوتے ہیں۔ ایک تیاری کا مرحلہ، اور دوسرا اقدام کا مرحلہ۔ دوسرا مرحلہ ہمیشہ مرحلۂ اول کے بعد آتا ہے نہ کہ مرحلۂ اول سے پہلے۔ اس وقت مسلم امت اقدام کے مرحلہ میں نہیں ہے بلکہ وہ تیاری کے مرحلہ (preparatory period) میں ہے۔ مرحلہ کے مطابق کام کرنا عمل ہے، اور مرحلہ کے خلاف کام کرنا صرف وقت اور مال کا ضیاع ہے۔

خدا کا طریقہ یہ ہے کہ جب وہ زمین پر ایک پھل دار درخت اگانا چاہتا ہے تو وہ پھل سے اس کا آغاز نہیں کرتا بلکہ بیج سے اس کا آغاز کرتا ہے۔ وہ بیج سے چل کر بتدریج پھول اور پھل تک پہنچتا ہے۔ اس طرح گویا خدا تمام انسانوں کو فطرت کی زبان میں یہ پیغام دے رہا ہے کہ میرا طریقہ آغاز سے شروع کرنا ہے:

My way is to begin from the beginning.

اس کے برعکس مسلم دانشوروں اور مسلم رہنماؤں کا حال یہ ہے کہ وہ پہلے ہی مرحلہ میں آخری نتیجہ کی طرف چھلانگ لگانا چاہتے ہیں، وہ تیاری کے بغیر اقدام کا نعرہ لگاتے ہیں۔ اس قسم کا ہر مسلمان گویا اپنے عمل کے ذریعہ یہ کہہ رہا ہے کہ میرا طریقہ آخری مقام سے شروع کرنا ہے:

My way is to begin from the top.

یہ طریقہ یقینی طور پر فطرت کے خلاف ہے۔ اور اس دنیا کے بارہ میں خدا کا فیصلہ یہ ہے کہ جو شخص فطرت کے نظام کے مطابق کام کرے وہ کامیاب ہو، اور جو شخص فطرت کے نظام سے مطابقت

نہ کرے وہ ناکام و نامراد ہو کر رہ جائے۔ ایسی حالت میں کیوں کر ممکن ہے کہ ہماری کوششیں کامیابی کی منزل تک پہنچ سکیں۔

قرآن میں قوموں کے عروج و زوال کا اصول نہایت واضح طور پر بتا دیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ قومیں خود اپنے عمل کی بنیاد پر اٹھتی ہیں اور اپنی ہی عملی کمزوریوں کی بنا پر تنزل کا شکار ہوتی ہیں۔ قوموں کا ابھرنا بھی داخلی اسباب کے تحت ہوتا ہے اور ان کا گرنا بھی داخلی اسباب کے تحت (ان اللہ لایغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسہم)

یہ ایک ایسا عالم گیر اصول ہے جس میں کوئی استثنا نہیں۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ سب سے پہلے اپنے آپ کو اس خدائی قانون کا مصداق بنائیں۔ وہ اپنی داخلی اصلاح کے لیے سرگرم ہو جائیں۔ وہ احتجاج غیر کے بجائے تعمیر خویش کی بنیاد پر اٹھنے کی کوشش کریں۔ اس کے سوا کوئی بھی دوسری صورت نہیں جو ان کو فلاح اور ترقی کی طرف لے جانے والی ہو۔

مسلمان اپنے قائدین کی رہنمائی میں اب تک جو کچھ کرتے رہے ہیں وہ زیادہ تر مطالبہ، احتجاج اور مظاہرہ کی سیاست ہے۔ انھوں نے اپنے ذاتی استحکام پر توجہ دینے کے بجائے دوسروں سے شکایت پر اپنی ساری توجہ مرتکز رکھی ہے۔ یہ طریقہ سراسر بے فائدہ ہے۔ وہ صرف مسائل کو بڑھانے والا ہے، وہ کسی بھی درجہ میں مسائل کو حل کرنے والا نہیں۔

یہ دنیا مقابلہ کے اصولوں پر بنائی گئی ہے۔ یہاں کسی شخص یا کسی قوم کا مسئلہ ہمیشہ اس کی داخلی کمی کی بنا پر پیدا ہوتا ہے اور داخلی کمی کو دور کر کے ہی اس کو حل کیا جا سکتا ہے۔ مظاہرہ کی سیاست کا انحصار ہمیشہ خارج پر ہوا کرتا ہے۔ پھر کوئی خارج رخی سیاست کیوں کر کسی قوم کے مسئلہ کو حل کر سکتی ہے جب کہ اس کے مسائل داخل رخی اسباب کے تحت پیدا ہوئے ہوں۔

درخت اپنی ابتدائی صورت میں بیج کا نام ہے۔ جیسا بیج ویسا درخت۔ اسی طرح کسی قوم کا خارجی مقام ہمیشہ اس کے داخلی استحکام کی نسبت سے متعین ہوتا ہے۔ جیسی تیاری ویسی قوم۔ یہ قانون اتنا حتمی اور یقینی ہے کہ اس میں کبھی کوئی استثنا ممکن نہیں۔ وہ اہل ایمان کے لیے بھی اتنا ہی قطعی ہے جتنا غیر اہل ایمان کے لیے۔ وہ ایک قوم کے لیے بھی اسی طرح درست ہے جس طرح کسی دوسری قوم کے لیے۔

یہاں ۱۰ نکات کی صورت میں ملی تعمیر کا ایک پروگرام درج کیا جاتا ہے۔

دس نکاتی پروگرام

۱۔ مسلمانوں کے اندر ایمانی شعور اور دینی جذبہ پیدا کرنا۔ ان کو اس قابل بنانا کہ وہ اللہ کے حقوق اور بندوں کے حقوق کو سمجھیں اور ان کو ذمہ دارانہ طور پر ادا کریں۔

۲۔ مسلمانوں میں اخلاقی بیداری پیدا کرنا۔ ان کے اندر سچائی، امانت داری، انصاف اور شرافت کی صفات ابھارنا تاکہ وہ لوگوں کے درمیان بہتر انسان بن کر رہ سکیں۔

۳۔ مسلمانوں میں باہمی اتحاد کا جذبہ ابھارنا۔ ان کے اندر یہ مزاج پیدا کرنا کہ وہ اختلاف رکھنے کے باوجود لوگوں کے ساتھ متحد ہو کر رہ سکیں۔

۴۔ جھگڑوں کو طے کرنے کے لیے کمیٹیاں بنانا۔ مسلمانوں کو آمادہ کرنا کہ جب بھی کوئی نزاع کی صورت پیدا ہو تو اس کو اپنی کمیٹی کے سامنے لے آئیں اور کمیٹی جو بات طے کرے اس پر وہ راضی ہو جائیں۔

۵۔ فضول خرچی کو روکنا۔ رسموں اور تیوہاروں اور تقریبات میں جو غیر ضروری اخراجات کیے جاتے ہیں ان کو روکنا اور ہر معاملہ میں سادہ طریقہ کو رواج دینا۔

۶۔ مساجد و مدارس کو بہتر بنانا۔ یہ کوشش کرنا کہ وہ ہر اعتبار سے نمونہ کے ادارے بن جائیں اور مسلمانوں کے لیے ہر جگہ حقیقی دینی مرکز کے طور پر کام کرنے لگیں۔

۷۔ مسلمانوں کو تعلیم میں آگے بڑھانا۔ مقامی ذرائع کو استعمال کرتے ہوئے یہ کوشش کرنا کہ ہر مسلمان ضرور پڑھے۔ پوری قوم صد فی صد تعلیم یافتہ بن جائے۔

۸۔ مسلمانوں کی معاشی حالت کو سدھارنا۔ ان کو ہنر سکھانا۔ ان کو تجارت اور صنعت میں آگے بڑھانے کی تدبیریں اختیار کرنا۔ معاشی مسائل کو درست کرنے کے لیے لوگوں میں یہ ذہن بنانا کہ وہ مطالبہ اور احتجاج کے طریقہ کو چھوڑیں اور تعمیر خویش کے طریقہ کو اختیار کریں۔

۹۔ وقف کی جائدادوں کے بہتر استعمال کی کوشش کرنا۔ ان کو منظم کرنا اور ان کے اوپر تعلیمی اور رفاہی ادارے بنانا، ان کو مسلمانوں کی معاشی اور تعلیمی ترقی کے لیے استعمال کرنا۔

۱۰۔ ملکی سیاست کے طریقہ کو چھوڑ کر مقامی سیاست کے طریقہ کو اختیار کرنا۔ وہ معاملات جن کا تعلق سیاست سے ہوتا ہے، مثلاً قومی جھگڑے، الکشن میں ووٹ دینے کا مسئلہ، اس قسم کے تمام امور مقامی دائرہ میں رکھ کر حل کرنا۔ ان کو ملکی اور عمومی اشو بنانے سے کامل پرہیز کرنا۔

ہندستانی مسلمان

پونہ کے تعلیم یافتہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کی طرف سے مجھے دعوت دی گئی کہ میں ۶ نومبر ۱۹۹۱ کو ان کے ایک مشترکہ اجتماع سے خطاب کروں۔ تقریر کا موضوع جو ان کی طرف سے دیا گیا وہ تھا:
مسلمان آزادی کے بعد کے ہندستان میں (Muslims in post-independent India)

مجھے خاص طور پر دو پہلوؤں سے مسلمانوں کی حالت کا جائزہ لینا تھا۔ معاشی اور مذہبی۔ اپنی عادت کے مطابق، میں نے خالص واقعاتی انداز میں اس موضوع کی تحقیق شروع کر دی۔ مطالعہ اور تحقیق کے بعد مجھ پر ایک نئی حقیقت کا انکشاف ہوا۔ وہ یہ کہ عام خیال کے برعکس، ہندستان میں آزادی (۱۹۴۷) کے بعد مسلمانوں کی حالت پہلے سے کافی بہتر ہوئی ہے۔ میں نے جس مسلمان کا بھی جائزہ لیا اور جس مسلم بستی کے بارہ میں بھی تحقیق کی، تقریباً بلا اختلاف ہر ایک کو پایا کہ اس کی موجودہ حالت اس کی سابقہ حالت سے واضح طور پر بہتر ہے۔

یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کے کچھ مسائل ہیں۔ انھیں کچھ مشکلات درپیش ہیں۔ مگر کسی گروہ کی حالت کو جانچنے کے لئے یہ کوئی صحیح معیار نہیں کہ وہ مشکلات و مسائل سے خالی ہو۔ کیوں کہ موجودہ دنیا میں ایسا ہونا ممکن ہی نہیں۔ اس دنیا کے لئے خدا کا قانون یہ ہے کہ یہاں ہمیشہ عُسر اور یُسر دونوں موجود رہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو زندگی کی جدوجہد ہی سرے سے ختم ہو جائے گی۔ اور جس سماج سے زندگی کی جدوجہد ختم ہو جائے وہاں زندہ انسانوں کا باغ نہیں اگتا، بلکہ مردہ انسانوں کا قبرستان وجود میں آتا ہے۔

ایسی حالت میں مسلمانوں کے معاملہ کو کسی خود ساختہ معیار سے جانچا نہیں جا سکتا۔ ان کے معیار کو لازمی طور پر ممکن معیار سے جانچنا ہوگا نہ کہ کسی خیالی معیار سے۔

میں نے اپنی تحقیق میں یہ نہیں کیا کہ مسلمانوں کے اخباروں اور رسائل میں اس موضوع پر جو مضامین چھپے ہیں یا چھپ رہے ہیں ان پر اعتماد کر لوں۔ بلکہ میں نے آزادانہ طور پر خود اپنی واقفیت کے تحت اس کے بارہ میں رائے قائم کرنے کی کوشش کی۔ میری تلاش مجھے اس کے بالکل برعکس نتیجہ تک لے گئی جو عام طور پر ہندستانی مسلمانوں کے بارہ میں ایک مسلّمہ کے طور پر دہرائی جاتی رہی ہے۔

میں نے سب سے پہلے مسٹر اور مولوی طبقہ میں ان افراد کو دیکھا جو موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے نمائندہ سمجھے جاتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر افراد کو میں براہ راست یا بالواسطہ طور پر جانتا ہوں۔ میں نے پایا کہ ان میں سے ایک ایک شخص ۱۹۴۷ سے پہلے کے مقابلہ میں آج زیادہ بہتر حالت میں ہے۔ خواہ کوئی بارِیش قائد ہو یا بے ریش قائد، دونوں بلا استثناء پہلے سے بہتر زندگی گزار رہے ہیں۔

پھر میں نے اپنے وسیع خاندان کو اور اپنے رشتہ داروں کو دیکھا۔ دوبارہ میں نے پایا کہ یہ تمام لوگ پہلے سے بہت بہتر حالت کے مالک ہیں۔ اس کے بعد میں نے ان شہروں اور بستیوں کے مسلمانوں پر غور کیا جہاں میں کم یا زیادہ مدت تک رہا ہوں یا جہاں میں جاتا رہتا ہوں۔ ان کے بارہ میں بھی تقریباً بلا استثنا میرا مشاہدہ یہ تھا کہ وہ قبل از آزادی کے دور کے مقابلہ میں بعد از آزادی کے دور میں زیادہ بہتر حالت میں نظر آتے ہیں۔

کئی ہفتے تک میں اس موضوع سے تعلق رکھنے والے حقائق کا جائزہ لیتا رہا۔ آخر کار میرے ذہن نے فیصلہ کر دیا کہ ۱۹۴۷ کے بعد کے دور میں مسلمانوں نے واضح طور پر اس ملک میں ترقی کی ہے۔ آج وہ پہلے سے کہیں زیادہ بہتر حالت میں ہیں۔

اس تحقیق کے دوران میں ایک مسلمان سے ملاقات کے لئے گیا۔ وہ ایک گاؤں میں ایک کسان کے گھر پیدا ہوئے۔ اس کے بعد انھوں نے تعلیم حاصل کی اور گزیٹڈ افسر ہو گئے۔ چند سال پہلے اکثر ان سے میری ملاقات ہوتی تھی۔ ہر ملاقات میں وہ یہ شکایت کرتے تھے کہ یہاں بہت زیادہ تعصب ہے۔ یہاں مسلمانوں کے لئے ترقی کے مواقع نہیں۔ مجھ کو دیکھئے، میں کئی سال سے اس محکمہ میں افسر ہوں۔ مگر میری مزید ترقی رکی ہوئی ہے۔ ہندو لابی مجھے آگے بڑھنے نہیں دیتی۔

تین سال کے وقفہ کے بعد میں پتہ کے مطابق، ان کے مکان پر ان سے ملنے کے لئے گیا۔ پہلے وہ ایک فلیٹ میں رہتے تھے۔ اب میں نے دیکھا کہ وہ ایک بہت بڑے بنگلہ میں ہیں۔ پہریدار اور ملازم لگے ہوئے ہیں۔ بنگلہ کے چاروں طرف تقریباً ۱۰ ایکڑ زمین ہے جس میں ہرے بھرے درخت بنگلہ کی شان کو بڑھا رہے ہیں۔ وہاں انھوں نے کئی قسم کی فصل بھی اگا رکھی ہے۔ معلوم ہوا کہ پچھلے دو سال سے وہ ترقی کر کے ایک بڑے عہدہ پر پہنچ چکے ہیں اور عہدہ کی نسبت سے یہ بنگلہ انھیں قیام کے لئے دیا گیا ہے۔

میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک موصوف کے پاس رہا۔ اس پوری مدت میں وہ پر فخر طور پر صرف اپنے بنگلہ ، اپنے عہدہ اور اپنے ساز و سامان کا تذکرہ کرتے رہے۔ چند سال پہلے ہر ملاقات میں وہ اکثریتی فرقہ کے تعصب کا ذکر کیا کرتے تھے۔ موجودہ ملاقات میں وہ صرف اپنی بڑائی کا چرچا کرتے رہے۔

اس تجربہ کے بعد میری سمجھ میں آیا کہ وہ اصل کمی کیا ہے جو لوگوں کو ملک کی حقیقی صورت حال سے بے خبر کئے ہوئے ہے۔ وہ دراصل اعتراف حقیقت کا فقدان ہے۔ ایک شخص کو کوئی برائی پہنچے تو وہ حقیقت حیات کے سبب سے پہنچتی ہے۔ مگر اس کو وہ ہندو تعصب کے خانہ میں ڈال کر شکایت کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اور اگر ایک شخص کو کوئی بہتری ملے تو وہ اللہ کا انعام ہوتا ہے جو شکر کا طالب ہوتا ہے۔ مگر وہ اس کو ذاتی کارنامہ سمجھ کر فخر و ناز میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس طرح آدمی دونوں صورت کو اس کے حقیقی زاویہ سے دیکھنے سے محروم رہتا ہے۔ وہ نہ ملے ہوئے کا خوب چرچا کرتا ہے ، مگر ملے ہوئے سے دوسروں کو آگاہ نہیں کرتا۔

سروسوں کا مسئلہ

ہندستانی مسلمانوں کی زبوں حالی کو بتانے کے لئے عام طور پر جو چیز پیش کی جاتی ہے وہ سرکاری ملازمتوں کا معاملہ ہے۔ دہلی سے مسلمانوں کا ایک انگریزی ماہنامہ نکلتا ہے۔ وہ اپنے تقریباً ہر اشو میں ایسے اعداد و شمار چھاپتا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان کس طرح سرکاری ملازمتوں میں اپنے عددی تناسب سے کم حصہ پائے ہوئے ہیں۔ دوسرے مسلم اخبارات و رسائل بھی عام طور پر اسی پہلو کو اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔ ان کا مشترک طور پر یہ کہنا ہے کہ مسلمان اس ملک کی سرکاری ملازمتوں میں دو فیصد سے زیادہ نہیں ، جب کہ آبادی کی نسبت سے ان کی تعداد اس سے زیادہ ہونی چاہئے۔

مگر اعداد و شمار کی یہ منطق درست نہیں۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مسلمان کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم میں بہت پیچھے ہیں۔ جب کہ انھیں اداروں کی ڈگریاں سروسوں کے لئے فیصلہ کی اصل بنیاد ہوتی ہیں۔ پھر جو گروہ سروسوں کے لئے مطلوبہ لیاقت میں دوسروں سے پیچھے ہو وہ ان سروسوں میں دوسروں کے برابر کس طرح حصہ پا سکتا ہے۔

مردم شماری کے مطابق، مسلمان اس ملک کی آبادی کا تقریباً بارہ فیصد حصہ ہیں۔ اس تعداد میں تقریباً نصف کے برابر عورتیں شامل ہیں۔ اپنی سماجی روایات کے مطابق، مسلمان اس کو پسند نہیں کرتے کہ ان کے گھروں کی خواتین سرکاری دفتروں میں جاکر کام کریں۔ اس طرح خود مسلمانوں کے اپنے نظریہ کے مطابق، ان کی آبادی کا نصف حصہ سرکاری ملازمتوں کی فہرست سے حذف قرار پا جاتا ہے۔ اب بقیہ چھ فیصد میں اگر تین فیصد کو تعلیم کی کمی کی بنا پر حذف کر دیا جائے تو اس کے بعد دو فیصد کا موجودہ تناسب بہت زیادہ غلط نظر نہیں آئے گا۔

اس سے قطع نظر، جہاں تک مادی خوش حالی کا تعلق ہے۔ سرکاری ملازمت کے شعبہ کو اس کے لیے معیار (کرائٹیرین) کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ اس کی کم از کم دو متعین وجہیں ہیں۔ ایک یہ کہ سرکاری ملازمت کا تعلق حکومت سے ہوتا ہے اور حکومت پر قابض افراد ہمیشہ ملازمتوں کی تقسیم میں اپنے سیاسی مفاد کا لحاظ کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ یہ حکام اگر مخلص ہوں، تب بھی مختلف ملکی اور بین اقوامی مصالح کی بنا پر انھیں سرکاری ملازمتوں کے سلسلہ میں ایسی پالیسی اختیار کرنی پڑتی ہے جس میں فیصلہ کی بنیاد آبادی میں مختلف فرقوں کا عددی تناسب نہیں ہوتا بلکہ وسیع تر مقاصد کی رعایت ہوتی ہے۔ اس بنا پر یہ صورت حال ہر سماج اور ہر حکومتی نظام میں ہمیشہ موجود رہتی ہے۔

مثال کے طور پر پاکستان کے سندھی مسلمانوں کو یہ شکایت ہے کہ مرکزی حکومت کی سروسوں میں پنجابی مسلمان اپنے عددی تناسب سے بہت زیادہ حصہ پر قابض ہیں اور سندھی مسلمانوں کو ان کے عددی تناسب سے بہت کم حصہ ملا ہے۔ عراق میں بیشتر اعلیٰ سرکاری ملازمتیں صدر صدام حسین کے قبیلہ کے افراد کو حاصل ہیں۔ ایران میں اعلیٰ سرکاری مناصب زیادہ تر شیعہ فرقہ کے افراد کو دئے جاتے ہیں۔ سنی فرقہ کے افراد اس سے بڑی حد تک محروم ہیں۔ لیبیا میں بیشتر حکومتی عہدے قذافی کی پارٹی کے لوگوں کے پاس ہیں۔ دوسرے لوگوں کو حکومتی عہدوں میں بہت کم حصہ ملا ہے۔ یہی حالت بلا استثنا تمام مسلم ملکوں میں کسی ایک یا دوسرے اعتبار سے پائی جاتی ہے۔

انڈیا میں بھی یہ فرق مختلف سطحوں پر موجود ہے۔ مگر یہ فرق صرف ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نہیں ہے بلکہ ہندوؤں اور ہندوؤں کے درمیان بھی ہے۔ مثال کے طور پر اعلیٰ سرکاری ملازمتوں میں برہمن فرقہ کا تناسب دوسرے ہندو فرقوں سے زیادہ ہے۔ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ

ہندی تعلیم یافتہ طبقہ کے مقابلہ میں زیادہ سرکاری عہدوں پر قبضہ کئے ہوئے ہے۔ یہی فرق مسلمانوں کی نسبت سے بھی بعض اسباب کی بنا پر پایا جاتا ہے۔ یہ عمومی طور پر ہرایک کا مسئلہ ہے نہ کہ صرف مسلمانوں کا مسئلہ۔

دوسرے یہ کہ سرکاری ملازمتوں کا تعلق ملکی انتظام (administrative) سے زیادہ اور معاش سے بہت کم ہے۔ سرکاری ملازمت کا حصہ معاشی تقسیم کے نظام میں چند فیصد سے زیادہ نہیں۔ حصول معاش کا میدان ایک بے حد وسیع میدان ہے۔ کسی گروہ کو اگر سرکاری ملازمتوں میں کم حصہ ملے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ معاشی تقسیم میں بھی اس کا حصہ کم ہوگا۔ سرکاری ملازمت کے باہر بہت سے شعبے پھر بھی اس کے لئے کھلے رہتے ہیں اور عین ممکن ہے ان دوسرے شعبوں میں عمل کرکے وہ اس سے بہت زیادہ پالے جتنا اس کو سرکاری ملازمت میں شرکت کے ذریعہ حاصل ہوتا۔

اس اصول کے حق میں بہت سی تاریخی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ اس کی ایک قریبی مثال آزادی سے پہلے ریاست حیدرآباد کا معاملہ ہے۔ آزادی سے پہلے ریاست حیدرآباد میں سرکاری ملازمتیں زیادہ تر مسلمانوں کو دی جاتی تھیں۔ ہندوؤں کا حصہ سرکاری ملازمت کے شعبہ میں بہت کم تھا۔ اس کے باوجود ریاست حیدرآباد کے ہندو معاش کے شعبوں میں ریاست کے مسلمانوں سے بدرجہا زیادہ بہتر تھے۔ کیوں کہ وہاں کے ہندو ریاست کی بیشتر تجارتوں پر قابض ہوگئے تھے۔ انھوں نے تجارت کے ذریعہ اس سے زیادہ معاشی فائدہ حاصل کرلیا جتنا انھوں نے سرکاری ملازمت کے شعبہ میں کھویا تھا۔

مذکورہ اسباب کی بنا پر میرا یہ کہنا ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کی معاشی حالت کو جانچنے کے لئے ہمیں ان کی واقعی معاشی حالت کو دیکھنا چاہئے نہ کہ سروسوں میں ان کے عددی تناسب کو۔ سرکاری سروسوں میں تناسب کو اس معاملہ میں نمائندگی کا درجہ حاصل نہیں۔

مادی کامیابی

میں اتر پردیش کا رہنے والا ہوں۔ ہمارے خاندان کی ایک شادی کی تقریب ۱۹۸۷ میں بمبئی میں ہوئی۔ اس تقریب میں خاندان کے پچاس سے زیادہ آدمی شریک ہوئے۔ یہ سب کے سب بنارس سے ہوائی جہاز کے ذریعہ سفر کرکے بمبئی پہنچے تھے۔ میں بھی انھیں میں سے ایک تھا۔

ہم لوگ بمبئی کے ایک ہوٹل میں ٹھہرائے گئے۔

اس قیام کے دوران ایک بار میرے ایک عزیز میرے ہوٹل کے کمرہ میں آئے۔ ان کے ہاتھ میں بمبئی کے ایک صاحب خالد لطیف گابا (۱۹۸۱ - ۱۸۹۹) کی ۲۹۰ صفحہ کی ایک کتاب تھی۔ اس کتاب کا نام منفعل آوازیں (Passive Voices) ہے اور وہ پہلی بار ۱۹۷۵ میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب آزادی کے بعد ہندستانی مسلمانوں کی حالت کے بارہ میں ہے۔ کتاب کے نام سے ظاہر ہے کہ مصنف کے نزدیک ہندستانی مسلمان سراسر مظلومی کی حالت میں ہیں۔ انھوں نے کتاب کے نام کی توجیہہ کرتے ہوئے کتاب کے دیباچہ میں یہ الفاظ لکھے ہیں:

> It would be difficult to sum up the status and conditions of Muslims in India better in two words than 'Passive Voices.'

میرے مذکورہ عزیز نے کتاب کے مندرجات سے اتفاق کرتے ہوئے ہندستانی مسلمانوں کی مظلومیت بیان کرنا شروع کیا۔ میں نے کہا کہ میری رائے آپ کی رائے کے بالکل برعکس ہے۔ میرے نزدیک ہندستان کے مسلمان آزادی کے بعد پہلے سے بہت بہتر ہو گئے ہیں۔ موجودہ مسلمانوں کا کیس مظلومیت کا کیس نہیں ہے بلکہ ترقی کا کیس ہے۔

میرے عزیز تعجب کے ساتھ میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے کہا کہ آپ کو تعجب اس لئے ہو رہا ہے کہ آپ مسلمانوں کی حالت کو اخباروں میں پڑھتے ہیں۔ خود مسلمانوں کو دیکھ کر مسلمانوں کی حالت کے بارہ میں رائے قائم نہیں کرتے۔ اور ہمارے اخبارات سب کے سب زرد صحافت (yellow journalism) کے اصول پر چلائے جا رہے ہیں۔ وہ پوری صورت حال کو جیسا ہے ویسا بیان نہیں کرتے۔ بلکہ صرف بعض سنسنی خیز پہلو کو لے کر ان کو نمایاں کرتے رہتے ہیں۔

میں نے کہا کہ آپ خود اپنے آپ کو دیکھئے۔ آج آپ کی جو معاشی اور سماجی حالت ہے وہ اس سے بہت بہتر ہے جو ۱۹۴۷ کے انقلاب کے وقت آپ کی معاشی اور سماجی حالت تھی۔ آج آپ کوٹھی اور کار کے مالک ہیں، حالاں کہ پہلے آپ کے پاس بائیسکل کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

۱۹۸۷ میں ہمارے خاندان کے پچاس افراد ہوائی جہاز سے سفر کرکے بمبئی میں تقریب نکاح میں شرکت کے لئے آئے ہیں۔ حالاں کہ میں اور آپ دونوں جانتے ہیں کہ ہمارا خاندان ۱۹۴۷ میں اس پوزیشن میں نہ تھا کہ وہ اتنے اعلیٰ معیار پر شادی کی تقریب کر سکے۔ ۱۹۴۷ سے

پہلے ہمارے وسیع خاندان اور ہمارے تمام رشتہ داروں کے درمیان صرف ایک موٹر کار تھی ، آج صرف ہمارے خاندان اور رشتہ داروں کے پاس دو سو سے زیادہ کاریں موجود ہیں۔ وغیرہ۔

آپ کسی بھی مسلم خاندان کا سروے کیجئے۔ اور پتہ کیجئے کہ ۱۹۴۷ سے پہلے اس کی سماجی اور اقتصادی حالت کیا تھی اور آج کیا ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ تقریباً ہر مسلم خاندان نے نمایاں ترقی کی ہے۔ پہلے اگر وہ بائیسکل والا تھا تو آج وہ کار والا ہے۔ پہلے اگر اس کے پاس چھوٹا مکان تھا تو اب اس کے پاس بڑا مکان ہے۔ پہلے وہ صرف پبلک کال آفس سے ٹیلی فون کر سکتا تھا تو آج اس کے گھر پر خود اپنا ٹیلی فون لگا ہوا ہے۔ پہلے اس کا خاندان صرف محدود مقامی ذرائع پر انحصار کرتا تھا تو آج اس کے خاندان کے کئی افراد باہر کی دنیا میں جا کر بڑی بڑی حیثیت حاصل کئے ہوئے ہیں۔ وغیرہ

یہ میں کوئی انوکھی بات نہیں کہہ رہا ہوں۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس کا تجربہ ہر آدمی اپنے قریبی مسلمانوں کا سروے کر کے معلوم کر سکتا ہے۔ کسی بھی مقام پر جا کر وہاں کے مسلمانوں سے ملئے اور دریافت کیجئے کہ ۱۹۴۷ سے پہلے ان کی اقتصادی حالت کیا تھی اور آج کیا ہے۔ آپ پائیں گے کہ تقریباً ہر مسلم خاندان کی حالت پہلے سے کہیں زیادہ بہتر ہو چکی ہے۔

یہاں تک کہ مسلمانوں کے وہ لکھنے اور بولنے والے لوگ جو اس اعلان کے چیمپئن بنے ہوئے ہیں کہ آزادی کے بعد مسلمان اس ملک میں ایک تباہ حال قوم بنا دئے گئے ہیں۔ آپ ان کے ذاتی حالات کا پتہ کیجئے۔ آپ دیکھئے کہ وہ اور ان کی اولاد آج کس حال میں ہیں۔ آپ یقینی طور پر پائیں گے کہ ان میں سے ہر شخص پہلے سے سوگنا زیادہ بہتر ہو چکا ہے۔ میں ذاتی طور پر ان قائدین میں سے کئی افراد کو جانتا ہوں جو ۱۹۴۷ سے پہلے ایک معمولی خاندان سے تعلق رکھتے تھے آج وہ اور ان کے بچے اسی ملک میں ہر قسم کے مادی ساز وسامان کے ساتھ شاندار زندگی گزار رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ کہنا کہ مسلمان آزادی کے بعد پستی میں ڈال دئے گئے ہیں ، ایک قسم کی خلاف زمانہ بات (anachronic statement) ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج ہم صنعتی دور (industrial age) میں ہیں۔ صنعت وتجارت کی ترقی نے کمائی کے بے حساب نئے طریقے پیدا کر دئے ہیں۔ موجودہ دور صنعت اور روزگار کے انفجار (explosion) کا دور ہے۔ اس کے بعد یہ

بالکل ناممکن ہو چکا ہے کہ کوئی قوم کسی دوسری قوم کی معاشی ترقی کو روک سکے۔

قدیم زرعی دور میں کسب معاش کے ذرائع بے حد محدود تھے۔ صرف چند سادہ قسم کے کاروبار تھے جن میں مشغول ہو کر کوئی شخص اپنے لئے مختصر آمدنی کر سکتا تھا۔ مگر صنعتی انقلاب نے کمائی کی صورتوں میں ناقابل بیان حد تک اضافہ کر دیا ہے۔ آج صنعت و حرفت کی اتنی زیادہ قسمیں ظہور میں آچکی ہیں کہ ملین اور بلین کے الفاظ بھی اس کی تعداد کو بتانے کے لئے ناکافی ہیں۔

صنعتی انقلاب کے دور میں روزگار کے پھیلاؤ کی بنا پر اب یہ سرے سے ممکن ہی نہیں رہا ہے کہ کوئی قوم یا حکومت کسی گروہ کو خوشحال بننے سے روک سکے۔ آج کسی شخص یا گروہ کی اپنی بے عملی یا نادانی اس کو محروم کر سکتی ہے، مگر کوئی خارجی طاقت اس کو محروم کرنے پر قادر نہیں۔

ایک تقابلی مثال اس معاملہ کو مزید واضح کرتی ہے۔ رومن ایمپائر جو آٹھویں صدی قبل مسیح میں شروع ہو کر پانچویں صدی عیسوی میں ختم ہوگئی اور اس کی مشرقی شاخ (بازنطینی ایمپائر) جو ساتویں صدی عیسوی تک طاقت ور حالت میں باقی رہی، اس سلطنت کے ایک ہزار سال سے زیادہ مدت میں ان کی پالیسی یہ تھی کہ ان کی ماتحت قومیں سائنسی علوم میں ترقی نہ کر سکیں۔ کیوں کہ سائنسی ترقی کو وہ اپنی سلطنت کے لئے خطرہ سمجھتے تھے۔ رومی حکمراں اپنے اس منصوبہ میں کامیاب رہے اور ان کے طویل دور حکومت میں ان کی ماتحت قوموں کی ترقی نہ ہو سکی۔

اس کے برعکس بیسویں صدی کے وسط میں دوسری عالمی جنگ ہوئی۔ اس کے بعد امریکہ جاپان کے اوپر قابض ہو گیا۔ امریکہ نے بھی چاہا کہ وہ ہمیشہ کے لئے جاپان کو اپنا محکوم بنائے رہے۔ وہ وہاں ایسی کوئی ترقی نہ ہونے دے جو امریکہ کے لئے چیلنج کے ہم معنی بن جائے۔ مگر امریکہ اپنے اس منصوبہ میں کامیاب نہ ہو سکا۔ صرف چالیس سال کی مدت میں جاپان ایک صنعتی اور اقتصادی دیو کی صورت میں ظاہر ہو گیا جو امریکہ کے لئے کمیونسٹ حکومتوں سے بھی زیادہ بڑا خطرہ تھا۔

اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ رومن ایمپائر کو صنعتی انقلاب سے پہلے کام کرنے کا موقع ملا۔ اور امریکی ایمپائر کو صنعتی انقلاب کے بعد۔ صنعتی انقلاب سے پہلے ذرائع کی محدودیت کسی حکمراں کو اس قسم کا موقع دے دیتی تھی کہ وہ ایک قوم کی ترقی کو روک سکے۔ مگر صنعتی انقلاب کے بعد ذرائع کی غیر معمولی کثرت نے اس قسم کے امکان کو آخری حد تک ختم کر دیا ہے۔ آج اگر کوئی حکومت کسی قوم کے اوپر ترقی کے

ایک سو دروازے بند کرے تو وہاں ترقی کے مزید ایک ہزار دروازے کھلے ہوئے ہوں گے، جن سے وہ قوم اپنا راستہ پالے گی اور ترقی کی طرف اپنا سفر شروع کر دے گی۔ کہیں ایک چھوٹا چشمہ ہو تو اس کے بہاؤ کو روکا جا سکتا ہے۔ مگر پانی جب سیلاب کی صورت اختیار کر لے تو اس کے بعد اس کے طوفان کو روکنا کسی کے لئے ممکن نہیں رہتا۔

مذہبی حالت

یہ عام معاشی حالت کی بات تھی۔ اب مذہبی اعتبار سے دیکھئے۔ ستمبر ۱۹۹۱ میں ایک ہفتہ کے لئے میں لاہور میں تھا۔ وہاں ہر روز صبح کو پہلی آواز جو میرے کان میں آتی تھی وہ مسجد کی اذان کی آواز تھی جو لاؤڈ اسپیکر پر بلند ہو کر پوری فضا میں پھیل جاتی تھی۔ ٹھیک یہی صورت حال انڈیا میں بھی ہے۔ دہلی میں میں نظام الدین کالونی میں رہتا ہوں۔ یہاں ہر روز صبح کے سناٹے کو جو چیز توڑتی ہے وہ دوبارہ اذان کی آواز ہے جو نظام الدین کی مسجدوں سے لاؤڈ اسپیکر پر بلند ہوتی ہے اور کئی کیلومیٹر تک کی فضا اس سے گونج اٹھتی ہے۔ یہی ملک کے تمام شہروں اور قصبوں کا حال ہے۔

لاہور میں بادشاہی مسجد کے اونچے مینار تھے تو بھوپال کی تاج المساجد کے مینار اس سے بھی زیادہ اونچے ہیں۔ اس کے علاوہ انڈیا میں تین لاکھ سے زیادہ مسجدیں ہیں، اور ان میں سے بہت سی مسجدیں وہ ہیں جو ۱۹۴۷ کے بعد کے دور میں بنی ہیں، اور مزید توسیع و ترقی تو تقریباً ہر مسجد کی ہوئی ہے۔ اسلام آباد میں اگر جامعہ اسلامیہ ہے تو دہلی میں حکیم عبدالحمید صاحب کا قائم کردہ عظیم اسلامی ادارہ جامعہ ہمدرد ہے جو کسی بھی مسلم ملک کے اس قسم کے ادارہ سے کم نہیں۔ انڈیا میں مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ اسی طرح ترقی کر رہے ہیں جس طرح پاکستان میں کوئی اسلامی تعلیمی ادارہ ترقی کر سکتا ہے۔

آج لاکھوں کی تعداد میں سارے ملک میں اسلامی مدرسے پھیلے ہوئے ہیں۔ پرانے مدرسے مثلاً ندوہ اور دیوبند ۱۹۴۷ سے پہلے معمولی مدرسے کی طرح تھے۔ آج وہ اپنی وسعت کے اعتبار سے یونیورسٹی کی مانند نظر آتے ہیں۔ آپ کے پڑوس مالیگاؤں میں ایک نیا بہت بڑا مدرسہ جامعہ محمدیہ کے نام سے قائم ہوا ہے جو رقبہ اور عمارت کے اعتبار سے قدیم مدارس سے بھی زیادہ بڑا ہے۔ اس طرح سیکڑوں کی تعداد میں بہت بڑے بڑے نئے مدرسے سارے ملک میں قائم کئے گئے

ہیں۔ رام پور میں جامعۃ الصالحات کے نام سے مسلم لڑکیوں کا مدرسہ قائم ہوا ہے۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ پوری مسلم دنیا میں وہ مسلم لڑکیوں کا سب سے بڑا مدرسہ ہے۔ اس طرح مختلف قسم کے اسلامی ادارے ہزاروں کی تعداد میں یہاں قائم ہوئے ہیں اور آزادی کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔

تبلیغی جماعت مسلمانوں کی ایک مذہبی جماعت ہے۔ اس کا پھیلاؤ ۱۹۴۷ سے پہلے جتنا تھا۔ اس کے مقابلہ میں آج وہ سیکڑوں گنا زیادہ بڑھ چکی ہے۔ دوسری مسلم جماعتوں میں بھی اسی طرح اپنے سرمایہ (asset) اور اپنے پیروؤں کے اعتبار سے بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ انڈیا میں آج ہر دن مسلمانوں کی بڑی بڑی کانفرنسیں اسلام کے مختلف موضوعات پر ہو رہی ہیں۔ جب کہ پہلے اس قسم کی کانفرنسوں کا انعقاد بہت کم ہوتا تھا۔ اسلامی کتابیں اور اسلامی جرائد آج پہلے سے بھی زیادہ شائع ہو رہے ہیں۔ وغیرہ

صحافت وقیادت

۱۹۴۷ کے بعد انڈیا میں جو بری چیز ظہور میں آئی ہے وہ حقیقۃً مسلمانوں کی مظلومی نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی فرضی مظلومی کو بیان کرنے والی صحافت اور قیادت ہے۔ اس ملک میں مسلمانوں کے لئے اگر کوئی خطرہ ہے تو وہ اسی نام نہاد صحافت وقیادت کا وجود ہے، اس کے علاوہ یہاں مسلمانوں کے لئے اور کوئی حقیقی خطرہ نہیں۔

آج مسلمانوں کی صحافت اور قیادت جن افراد کے ہاتھ میں ہے وہ بدقسمتی سے سطحی قسم کے لوگ ہیں۔ انھوں نے اپنی صحافت اور قیادت کو کامیاب بنانے کا یہ سستا نسخہ اختیار کیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے اندر خطرہ کی نفسیات (fear psychosis) پیدا کر کے ان کا استحصال کریں۔ چنانچہ وہ موجودہ ہندستانی سماج سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر کچھ برے واقعات نکالتے ہیں اور ان کو مبالغہ آمیز انداز میں پیش کر کے مسلمانوں کو غلط طور پر یہ تاثر دیتے ہیں کہ تم ہندستان میں ظلم و زیادتی کا شکار ہو رہے ہو۔

اس کی ایک مثال بمبئی کا فروری ۱۹۸۹ کا فساد ہے۔ بمبئی کے کچھ لیڈروں نے مقامی مسلمانوں کو اکسایا۔ چنانچہ انھوں نے برطانی شہری سلمان رشدی کی کتاب (The Satanic Verses) کے خلاف بمبئی میں ایک بڑا جلوس نکالا۔ جلوس کے نتیجہ میں فضا خراب ہوئی۔ یہاں تک کہ پولیس نے گولی

چلائی۔ کچھ مسلمان ناحق طور پر ہلاک ہوگئے۔ مسلمانوں کو مالی نقصان بھی پہنچا۔ مسلم اخباروں میں پولیس کے مظالم کی داستان ہفتوں اور مہینوں تک چھپتی رہی۔

یہ المیہ صرف ہماری صحافت اور قیادت کی استحصال پسندی کی وجہ سے پیش آیا۔ جیسا کہ معلوم ہے، راجیو گاندھی کی قیادت میں انڈیا پہلا ملک تھا جس نے اکتوبر ۱۹۸۸ میں سلمان رشدی کی مذکورہ کتاب پر پابندی لگادی۔ حتی کہ پاکستان سے بھی پہلے اس نے اس کتاب کی اشاعت وتقسیم کو انڈیا میں قانونی طور پر روک دیا۔

اب سوال یہ ہے کہ اس کے بعد انڈیا میں اس مسئلہ پر احتجاجی جلوس کا کیا مطلب ہے۔ اس کے بعد تو انڈیا میں شکر کا جلسہ ہونا چاہئے۔ مسلمانوں کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ وہ ایک ایسے ملک میں ہیں جو ایک اسلام دشمن کتاب پر مسلم ملکوں سے بھی پہلے پابندی لگاتا ہے۔ نہ کہ اس پر احتجاجی جلوس نکالا جائے اور غیر ضروری طور پر اپنے لئے ایسے مسائل پیدا کئے جائیں جن کا باعتبار واقعہ کوئی وجود نہیں۔

قومی ترقی میں حصہ

اوپر کی تفصیلات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ آزادیٔ ہند سے پہلے کے دور کے مقابلہ میں آزادیٔ ہند کے بعد کے دور میں مسلمان ترقی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ تاہم اس موضوع کا ایک اور پہلو ہے۔ اور وہ یہ کہ مجموعی قومی ترقی (total national growth) میں ان کا حصہ کتنا ہے۔

یہاں میں یہ اعتراف کروں گا کہ اس دوسرے اعتبار سے مسلمان یقینی طور پر پیچھے ہیں۔ مثلاً صحافت اور تعلیم کے اداروں میں ان کا حصہ دوسرے فرقوں کے اعتبار سے بہت کم ہے۔ صنعت اور تجارت کے میدان میں وہ ہندو اور جینی اور پارسی کے مقابلہ میں ابھی تک پیچھے ہیں۔

مگر اس معاملہ میں ہمیں حقیقت پسندانہ رائے قائم کرنا چاہئے نہ کہ کوئی جذباتی رائے۔ اصل یہ ہے کہ زمانی اعتبار سے خوش حال ہونے کے لئے تو زمانی عوامل ہی کافی تھے۔ چنانچہ زمانی اسباب کے تحت مسلمانوں کو موجودہ دور میں خوش حالی کا ایک حصہ مل گیا۔ مگر دوسری ہمسایہ قوموں کے مقابلہ میں اپنا متناسب حصہ پانے کے لئے قومی اہلیت کا ثبوت دینا تھا۔ یہاں رہنماؤں کی غلط رہنمائی اس میں مانع بن گئی کہ مسلمان ملک کی قومی ترقی میں اپنا وہ حصہ پاسکیں جو اپنی عددی طاقت کی نسبت سے انھیں ملنا

چاہیے تھا۔

مسلمانوں کی قیادت نے خاص طور پر دو پہلوؤں سے مسلمانوں کو نہایت شدید نقصان پہنچایا ہے۔ ایک یہ کہ انھوں نے اپنی نااہلی کی بنا پر مسلمانوں کو جدید تعلیم میں پیچھے کر دیا۔ جب کہ جدید تعلیم موجودہ زمانہ میں ہر قسم کی ترقیوں کی واحد لازمی شرط بن چکی ہے۔

مسلم قیادت کی دوسری شدید ترنااہلی یہ ہے کہ وہ اپنی غلط پالیسی کی بنا پر مسلمانوں کو فسادات کی مصیبت میں الجھائے ہوئے ہیں۔ آزادی کے بعد ہندستان میں چھوٹے بڑے تقریباً چالیس ہزار فساد ہو چکے ہیں۔ اور ان سب کی اصل ذمہ داری بلاشبہ نااہل مسلم قیادت پر ہے۔ ان فسادات کی بنا پر یہی یہ المیہ پیش آیا کہ مسلمان قومی ترقی میں اپنا قرار واقعی حصہ پانے سے محروم رہے۔ اور جو کچھ پایا تھا اس کا بھی ایک حصہ وہ بار بار کھوتے رہے۔

تعلیم کا میدان

۱۹ویں صدی کے وسط میں یہ واقعہ ہوا کہ برطانی حکومت نے انگریزی تعلیم کو باقاعدہ طور پر ملک میں رائج کیا اور فارسی کے بجائے انگریزی کو ملک کی سرکاری زبان کی حیثیت دے دی۔ اس وقت مسلم قیادت جن لوگوں کے ہاتھ میں تھی وہ انگریزوں سے سخت نفرت کرتے تھے۔ اس نفرت کو وہ یہاں تک لے گئے کہ انھوں نے انگریز اور انگریزی میں فرق نہیں کیا۔ وہ بیک وقت انگریزی قوم اور انگریزی زبان اور علوم دونوں کے دشمن بن گئے۔

مسلم قیادت کے اس مزاج کا اثر مسلم عوام پر پڑا۔ مسلمان عام طور پر انگریزی زبان اور انگریزی میں پڑھائے جانے والے علوم سے متنفر ہو گئے۔ حتی کہ سرسید (۱۸۹۸ - ۱۸۱۷) نے جب انگریزی تعلیم پر زور دیا تو ان کو انگریزوں کا ایجنٹ بتا کر ان کی سخت مخالفت کی گئی۔ ان کو مسلم عوام سے کاٹ دیا گیا۔ اس بنا پر مسلمان دوسرے فرقوں کے مقابلہ میں انگریزی تعلیم میں تقریباً ایک سو سال پیچھے ہو گئے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج ہمارے یہاں عربی زبان میں عالمی سطح کے علما موجود ہیں مگر انگریزی زبان میں ایسے کسی مسلم رائٹر کا نام مشکل ہی سے لیا جا سکتا ہے۔

تاہم ۱۹۴۷ کے انقلاب کے بعد حالات کے زیر اثر مسلمانوں کے اندر نیا ذہن پیدا ہوا ہے۔ اب مسلمان تیزی سے جدید تعلیم کے میدان میں داخل ہو رہے ہیں۔ چنانچہ آج ہمارے یہاں

ڈاکٹر خلیل اللہ جیسے میڈیکل اکسپرٹ اور پروفیسر خسرو جیسے ماہر معاشیات پیدا ہو رہے ہیں۔ مسلمانوں میں مسٹر رضوی اور مسٹر سبحانی جیسے نوجوان ابھر رہے ہیں جنھوں نے آئی اے ایس کے مقابلہ میں پورے ملک میں ٹاپ کیا ہے۔ وغیرہ

فرقہ وارانہ فسادات

دوسرا مسئلہ فرقہ وارانہ فسادات کا ہے۔ ان فسادات نے مسلمانوں کو زبردست نقصان پہنچایا ہے۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ ان فسادات کا تعلق ہندستان کے موجودہ نظام سے نہیں ہے بلکہ ان کا تعلق خود مسلمانوں کی زرد قیادت اور زرد صحافت سے ہے۔ یہ دراصل ہماری نام نہاد صحافت وقیادت ہے جو فرقہ وارانہ فساد کی اصل ذمہ دار ہے۔

ان فسادات کی منطق کیا ہے۔ اس کے لئے میں دوبارہ آپ کے پڑوسی شہر بمبئی کی مثال دوں گا۔ آزادی ہند سے تقریباً ۲۰ سال پہلے بمبئی میں ہندوؤں کا ایک جلوس نکلا۔ یہ جلوس چلتا ہوا ایک خاص سڑک پر پہنچا جہاں ایک مسجد واقع ہے۔ مسجد کے متولی کو مسجد کے سامنے ہندو جلوس گزارنے پر اختلاف ہوا۔ متولی نے روکا۔ جب جلوس والے نہیں رکے تو اس نے بمبئی کی عدالت میں اس کے خلاف کیس کر دیا۔ متولی کا یہ مطالبہ تھا کہ عدالت یہ حکم جاری کرے کہ آئندہ کوئی ہندو جلوس اس کی مسجد کے سامنے سے نہیں گزرے گا۔

اس وقت بمبئی میں ایک مسلمان وکیل تھے۔ انھوں نے اس کیس میں مسلم متولی کی طرف سے پیروی کی۔ انگریز جج نے یہ حکم جاری کر دیا کہ مذکورہ مسجد کے پاس یہ نوٹس لگا دی جائے کہ آئندہ کوئی ہندو جلوس اس مسجد کے سامنے سے نہیں گزارا جائے گا۔ مسلمان وکیل کی اس کامیاب پیروی پر مسلمان خوش ہو گئے۔ ان کو اتنی مقبولیت ہوئی کہ وہ مسلمانوں کے عظیم لیڈر بن گئے۔

مگر یہ قیادت نہیں تھی بلکہ غلط رہنمائی تھی۔ مذکورہ مسلمان وکیل کو مسلمانوں سے یہ کہنا چاہئے تھا کہ جلوس کے مسئلہ کا حل جلوس کو روکنا نہیں ہے بلکہ اس کو نظرانداز کرنا ہے۔ تم اپنا الگ ملک بناؤ گے تو وہاں بھی مختلف لوگ جلوس نکالیں گے۔ پھر تم کیا کرو گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں مسلمانوں کے لئے انتخاب جلوس اور بے جلوس میں نہیں تھا۔ بلکہ جلوس اور فساد میں تھا۔ مگر مسلمانوں کی زرد قیادت اور ان کی زرد صحافت مسلمانوں کو یہ رہنمائی نہ دے سکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جلوس کو روکنے کی کوشش

میں جگہ جگہ فساد ہونے لگے۔ جو آج تک جاری ہیں۔ اسی بنیاد پر ہندستان میں بھی فساد ہو رہا ہے اور اسی بنیاد پر پاکستان میں بھی۔

اس مسئلے کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے ۲۵ سال پہلے میں نے ایک تعمیری مہم شروع کی۔ میں نے مسلمانوں کے اندر یہ ذہن پیدا کرنے کی کوشش کی کہ فرقہ وارانہ فساد کا حل جلوس کو روکنا نہیں ہے بلکہ جلوس کو نظرانداز کرنا ہے۔ ۲۵ سالہ کوشش کے بعد اب خدا کے فضل سے اس کے اثرات ظاہر ہو رہے ہیں۔ انڈیا میں سیکڑوں مقامات پر صرف اس لئے فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا کہ مسلمانوں نے اپنے نئے ذہن کے تحت جلوس کو روکنے کے بجائے ان سے اعراض کرنے کی پالیسی اختیار کی۔ اس کی کچھ مثالیں اس کتاب میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

فرقہ وارانہ فسادات کے سلسلہ میں مسلمانوں کے اندر یہ جو نیا رجحان پیدا ہوا ہے یہ انشاء اللہ بڑھے گا۔ یہاں تک کہ وہ وقت آئے گا جب کہ مسلمانوں کے اندر یہاں کے ماحول میں عدم تحفظ کا احساس مکمل طور پر ختم ہو جائے۔ وہ ملک میں ترقی کے راستہ پر مزید آگے بڑھیں گے اور خود ملک کی ترقی میں اضافہ کریں گے۔

خاتمۂ کلام

آپ غالباً یہ سوال کریں کہ تمہاری رائے اور دوسروں کی رائے اتنی زیادہ مختلف کیوں ہے۔ ہندستانی مسلمانوں کے کیس کو دوسرے لوگ مظلومیت کا کیس بتاتے ہیں اور تم ان کے کیس کو قومی ترقی کا کیس بتا رہے ہو۔ اس فرق کا سبب زاویۂ نظر کا فرق ہے۔ میرا ریلسٹک اپروچ ہے اور دوسرے لوگوں کا نان ریلسٹک اپروچ۔ لوگ چیزوں کو اپنی خواہش کے مطابق دیکھنا چاہتے ہیں۔ جب کہ میں یہ دیکھتا ہوں کہ موجودہ دنیا میں کیا چیز ممکن ہے اور کیا چیز ممکن نہیں۔ کیونکہ قانون حیات کے تحت جو چیز ناممکن ہو اس کو آپ اپنی خواہش کے تحت اپنے لئے قابل حصول نہیں بنا سکتے۔

یہ دنیا خدا نے بنائی ہے اور وہ لازماً اسی نظام پر چلے گی جو نظام خدا نے اس کے لئے مقرر کر دیا ہے۔ اس دنیا کے لئے خدا نے یہ اصول مقرر کیا ہے کہ یہاں پھول کے ساتھ کانٹا بھی موجود رہے۔ اب ایک شخص اگر اپنے ذہن میں یہ تصور قائم کرلے کہ پھول کو کانٹے کے بغیر ہونا چاہئے۔ ایسا شخص جب باغ کو دیکھے گا تو اس کی نظر کانٹے پر اٹک جائے گی۔ وہ باغ کو کانٹوں کا جنگل سمجھنے لگے گا۔ اس

کے برعکس جو شخص یہ جانے کہ پھول کے ساتھ کانٹے کا وجود لازمی ہے، وہ جب باغ کو دیکھے گا تو سارا باغ اس کو پھولوں کا چمنستان نظر آئے گا۔

ایسا ہی کچھ معاملہ انسانی زندگی کا ہے۔ انسانی زندگی کو خدا نے مقابلہ اور مسابقت کی بنیاد پر قائم کیا ہے۔ اس نظام فطرت کی بنا پر اس دنیا میں ہمیشہ ایک دوسرے کے درمیان دوڑ جاری رہتی ہے۔ اس دوڑ میں ٹکراؤ کی نوبت آجاتی ہے۔ حتی کہ قرآن کے مطابق عداوت کی صورتیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہ خدا کا تخلیقی منصوبہ ہے اور اس منصوبہ کا یہ تقاضا ہے کہ دنیا میں خوش گوار باتوں کے ساتھ ناخوش گوار باتیں بھی ضرور موجود رہیں۔ چونکہ یہ خدا کا مقرر کیا ہوا قانون ہے اس لئے اس کے اثرات ہر جگہ پائے جائیں گے، خواہ وہ کوئی ہندو ملک ہو یا کوئی مسلم ملک۔

نقطۂ نظر کے اس فرق کا یہ نتیجہ ہے کہ جس چیز کو لوگ ظلم سمجھتے ہیں اس کو میں چیلنج کہتا ہوں۔ جس چیز کو لوگ تعصب اور امتیاز کہتے ہیں اس کو میں زندگی کی حقیقت سمجھتا ہوں۔ جس چیز کو لوگ سازش کا نام دیتے ہیں وہ میرے نزدیک مقابلہ کے مظاہر ہوتے ہیں۔

دوسرے لوگ اپنے غیر حقیقت پسندانہ معیار کی بنا پر یہ چاہتے ہیں کہ ہندستانی مسلمانوں کی زندگی میں کوئی ناخوش گوار پہلو نہ پایا جائے۔ اور جب وہ ایسا پہلو دیکھتے ہیں تو اس کے خلاف احتجاج شروع کر دیتے ہیں۔ مگر میں اس معاملہ کو حقیقت واقعہ کے معیار پر دیکھتا ہوں۔ اس لئے میں "کانٹے" والے پہلو کو نظر انداز کر کے "پھول" والے پہلو کو دیکھتا ہوں۔ اور پھر مجھے نظر آنے لگتا ہے کہ موجودہ دنیا میں قانون فطرت کے تحت جو کچھ ملنا ممکن ہے وہ مسلمانوں کو بھی اسی طرح مل رہا ہے جس طرح غیر مسلموں کو۔ مسلمان اگر اپنے لئے مزید کچھ چاہتے ہیں تو دوبارہ وہ قانون فطرت کے تحت عمل کر کے اس کو پا سکتے ہیں نہ کہ مطالبہ اور احتجاج کے ذریعہ۔

روشن مستقبل

صبر کامیابی کا زینہ

كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ۔ وَاللّٰهُ مَعَ الصَّابِرِينَ (البقرۃ ۲۴۵)

کتنی ہی چھوٹی جماعتیں اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آئی ہیں، اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی گروہ کا تعداد میں کم ہونا یا طاقت ور گروہ کی طرف سے زیادتیوں کا شکار ہونا اس کے لیے کوئی محرومی یا مایوسی کی بات نہیں۔ کیوں کہ اس دنیا کے خالق نے دنیا کے اندر جو مواقع رکھے ہیں وہ اس بات کو ممکن بناتے ہیں کہ کمزور گروہ خود طاقت ور گروہ پر غالب آجائے۔

ایسا کیونکر ہوتا ہے۔ اس کا راز، آیت کے مطابق، صبر ہے۔ جو لوگ صبر کے مراحل سے گزرتے ہیں، جو چیلنج سے دوچار ہوتے ہیں، جن کو زندہ رہنے کے لیے زیادہ محنت اور جوکھم کی ضرورت پیش آتی ہے وہ اس عمل کے دوران اس قابل ہو جاتے ہیں کہ وہ زیادہ تعداد اور زیادہ قوت والے گروہ کو مغلوب کر کے ان کے اوپر فتح حاصل کر لیں۔

کسی انسان یا کسی انسانی گروہ کے لیے صبر کا مرحلہ پیش آنا ایسا ہی ہے جیسے پانی کا حرارت سے سابقہ پیش آنا۔ پانی کو جب گرمی پہنچائی جاتی ہے تو ۱۰۰ درجہ سنٹی گریڈ پر پہنچ کر وہ ابلنے لگتا ہے۔ اس کے مالیکیول ٹوٹ کر منتشر ہونے لگتے ہیں جس کو بھاپ کہا جاتا ہے۔ اس طرح حرارت پانی کے ذخیرہ کو پانی کے بجائے گیس میں تبدیل کر دیتی ہے۔ گیس کی صورت اختیار کرنے کے بعد پانی اتنا طاقتور ہو جاتا ہے کہ وہ بڑی بڑی مشینوں کو متحرک کر دیتا ہے۔ پانی گیس بننے کے بعد وہ کارنامہ انجام دیتا ہے جو عام پانی کبھی انجام نہیں دے سکتا تھا۔

اسی طرح جب کسی فرد یا گروہ کے ساتھ صبر آزما حالات پیش آئیں، اس کے وجود کو چیلنج کیا جانے لگے تو اس کی شخصیت میں ایک انفجار پیدا ہوتا ہے، اس کی چھپی ہوئی صلاحیتیں ابھرنے لگتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ "پانی" کے درجہ سے اٹھ کر "بھاپ" کے درجہ میں پہنچ جاتا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ جب بھی کسی گروہ کو صبر والے حالات سے سابقہ پیش آیا تو اس کے امکانات جاگ اٹھے۔ وہ ایک ناقابل تسخیر طاقت بن کر ابھر آیا۔ صبر نے اس کو معمولی انسان کے درجہ سے اٹھا کر غیر معمولی انسان بنا دیا۔ صبر نے اس کو اس قابل بنا دیا کہ وہ اپنے سے زیادہ اور اپنے سے طاقت ور لوگوں پر بھی غلبہ حاصل کر لے۔

خدا کی حفاظت میں

اسلام دینِ محفوظ ہے۔ مسلمان اس دینِ محفوظ کے حامل ہیں۔ مسلمانوں کی اس حیثیت نے ان کو بھی ایک محفوظ گروہ بنا دیا ہے۔ جس طرح اسلام کو مٹانا ممکن نہیں، اسی طرح مسلمانوں کو مٹانا بھی ممکن نہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کے لئے خدا کی یہ حفاظت جاری رہے گی، یہاں تک کہ قیامت آجائے۔

مسلم امت کے ساتھ خدا کے اس معاملہ کا اظہار بار بار ہوا ہے۔ دور اول میں کہ میں مسلمانوں کے قیام کو ناممکن بنا دیا گیا۔ عین اس وقت مدینہ کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لئے ایک طاقت ور مرکز فراہم کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد عرب قبائل میں عمومی بغاوت پیدا ہوگئی جس کو تاریخ میں فتنۂ ارتداد کہا جاتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی خصوصی مدد سے فتنہ کے پیدا ہوتے ہی اس کو کچل دیا۔ خلافت راشدہ کے زمانہ میں رومی شہنشاہیت اور ایرانی شہنشاہیت نے مسلمانوں کو ختم کرنا چاہا۔ مگر اللہ کی مدد سے مسلمان خود ان شہنشاہیتوں کو ختم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس کے بعد یورپ کی مسیحی سلطنتوں نے متحدہ طور پر مسلم دنیا پر حملہ کر دیا تاکہ شام و فلسطین پر قبضہ کریں۔ مگر دو سو سالہ جنگ کے باوجود ان کو مکمل شکست ہوئی۔ آخری عباسی خلیفہ کے زمانہ میں تاتاری قبائل نے مسلم سلطنت کو تاراج کر دیا۔ سمرقند سے لے کر بغداد تک تمام مسجدوں کو ڈھا دیا۔ مگر صرف پچاس سال کے اندر تاریخ بدل گئی۔ تاتاریوں نے اسلام قبول کر لیا۔ انھوں نے ڈھائی ہوئی مسجدوں کو دوبارہ تعمیر کیا اور ان مسجدوں میں سجدہ کر کے خدا کے مقابلہ میں اپنے عجز کا اقرار کیا۔

انیسویں صدی کے وسط میں مغل سلطنت ختم ہوئی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں عثمانی خلافت کا خاتمہ ہوگیا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوا کہ اب مسلمانوں کے لئے دنیا میں کوئی مستقبل نہیں۔ مگر دوسری جنگ عظیم کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ دنیا کے نقشہ پر پچاس سے زیادہ کی تعداد میں آزاد مسلم ممالک وجود میں آگئے ہیں اور تمام اسلامی سرگرمیاں از سرِ نو نئی قوت و وسعت کے ساتھ جاری ہوگئی ہیں۔

مسلمانوں کو امت مرحومہ کہا جاتا ہے، یہ بات صحیح نہیں۔ البتہ مسلمان امت محفوظہ ہیں۔ یعنی ان کے اندر ربگاڑ کے باوجود ان پر عذاب مستأصل نہیں آئے گا، اور کوئی قوم ان پر اتنا قابو نہ پاسکے گی کہ وہ ان کو بالکل مٹا دے۔ اس کا سبب کوئی نفضیلت نہیں ہے۔ یہ دنیوی حفاظت مسلمانوں کو تمام تر ختم نبوت کے

طفیل میں حاصل ہوئی ہے۔

موجودہ زمانہ میں اس سنت الٰہی کا ظہور بہت بڑے پیمانہ پر ہوا ہے۔ موجودہ زمانہ میں جو مسلم رہنما اٹھے، انھوں نے اپنی غلط رہنمائی سے مسلمانوں کا یہ حال کر دیا کہ وہ اپنے اندر کسی بھی قسم کی بنیاد (base) فراہم نہ کر سکے۔ بے شمار ہنگامہ خیز تحریکیں صرف ان کی قوتوں کو ضائع کرتی رہیں۔ کوئی بھی تحریک انھیں وقت کی چیزوں میں سے کوئی چیز نہ دے سکی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے برتر انتظام کے تحت انھیں ہر چیز فراہم کر دی۔

لیڈروں کی غلط رہنمائی کے نتیجہ میں مسلمان جدید اقتصادیات میں اپنی جگہ نہ بنا سکے۔ قریب تھا کہ وہ زمانۂ جدید کے ہریجن بن کر رہ جائیں۔ مگر عین وقت پر تیل کا خزانہ ظاہر ہوا۔ مسلم ملکوں کی زمین کے نیچے اللہ تعالیٰ نے دنیا کے تیل کے ذخائر کا ۵۰ فی صد سے بھی زیادہ حصہ رکھ دیا۔ اس قدرتی خزانہ نے مسلمانوں کے اقتصادی پچھڑے پن کی تلافی کر دی۔

کائنات میں ایسے حقائق چھپے ہوئے تھے جو قرآن کے کتاب الٰہی ہونے کی تصدیق کرنے والے تھے۔ مگر مسلم قائدین اپنے جھوٹے مشغلوں کی وجہ سے حقائق کائنات کی دریافت کے عمل میں نہ لگ سکے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کام مغربی قوموں سے لیا۔ انھوں نے حقائق فطرت کو دریافت کر کے اس آیت کی عملی تفسیر فراہم کر دی کہ ہم ان کو آفاق وانفس میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے تاکہ ان پر واضح ہو جائے کہ یہ حق ہے (حم السجدہ)

اللہ تعالیٰ کو اس دین کی آواز سارے کرۂ ارض کے ہر چھوٹے اور بڑے گھر میں پہنچانی تھی۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے عالم فطرت کے اندر وسائل اعلام کے نہایت اعلیٰ ذرائع چھپا رکھے تھے۔ مگر مسلم رہنما یہاں بھی ان چیزوں کو دریافت کرنے میں ناکام رہے۔ اللہ تعالیٰ نے دوسری قوموں کو اس تحقیق پر لگا دیا۔ یہاں تک کہ وہ تمام اشاعتی ذرائع وجود میں آگئے جن کو پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا کہا جاتا ہے۔ ان ذرائع کے ظہور میں آنے کے بعد اب یہ نہایت آسان ہو گیا کہ ان کو استعمال کر کے اسلام کی آواز تمام کرۂ ارض میں پھیلا دی جائے۔

اس طرح کے بہت سے پہلو ہیں جو بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح اپنی مدد سے مسلمانوں کی کوتاہیوں کی تلافی کی ہے۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ خدا کے اس معاملہ کو جانیں اور ان کو استعمال کرتے ہوئے اس خدمت اسلام میں لگ جائیں جس کے لئے ان کے رب نے ان کے ساتھ حفاظت ونصرت کا یہ خصوصی معاملہ فرمایا ہے۔

روشن مستقبل

مسلمان ایک ایسے پیغمبر کی امت ہیں جس کی بابت عالمی مؤرخین نے یہ اعتراف کیا ہے کہ وہ پوری تاریخ کے سب سے زیادہ کامیاب (supremely successful) انسان تھے۔ قرآن کے مطابق، آپ دنیا میں اس لیے آئے تاکہ تمام انسانوں کے لیے بہترین نمونہ (اسوۂ حسنہ) قائم کریں۔ اس لحاظ سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ آپ نہ صرف خود سب سے زیادہ کامیاب انسان تھے بلکہ آپ نے اپنی زندگی کے نمونہ سے سب سے بڑی کامیابی کا راز بتایا ہے۔ آپ نے خود کامیاب ہو کر کامیابی کا نمونہ قائم کیا ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت ترین مشکلیں پیش آئیں۔ آپ نے خود فرمایا کہ جتنا مجھے ستایا گیا اتنا کسی کو نہیں ستایا گیا۔ آپ نے ان مشکلوں اور ایذاؤں کے باوجود عظیم ترین کامیابی حاصل کی۔ ایک مستشرق نے بجا طور پر آپ کی بابت لکھا ہے کہ آپ کو اگرچہ مشکلات پیش آئیں مگر آپ نے مشکلات کا مقابلہ اس عزم سے کیا کہ ناکامی سے کامیابی کو نچوڑ لیں:

He faced adversity with the determination
to wring success out of failure.

یہی وہ بات ہے جس کو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ عسر کے ساتھ یُسر ہے (الانشراح) اس قرآنی تعلیم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے نمونہ کو سامنے رکھتے ہوئے مسلمانوں کے لیے کسی بھی حال میں مایوسی کی ضرورت نہیں۔ جب خود خالق کائنات نے یہ ابدی اعلان فرما دیا ہے کہ اس دنیا میں عسر (مشکل) کے ساتھ یُسر (آسانی) ہے۔ بالفاظ دیگر، یہاں ہر ڈِس ایڈوانٹج کے ساتھ ایڈوانٹج بھی لازمی طور پر موجود رہتا ہے تو ایسی حالت میں ہم کو اندیشہ کرنے کی کیا ضرورت۔

قرآن کی اس خبر کی صحت کو پیغمبر اسلام نے اس اعلیٰ درجہ پر ثابت کیا کہ آپ نے ناکامی سے کامیابی کو نچوڑ لیا اور ہر قسم کی مشکلوں کے باوجود تاریخ کی سب سے بڑی کامیابی حاصل کی۔ ایسی حالت میں مسلمان کو ہمیشہ پُر امید رہنا چاہیے، اس کو کسی بھی حال میں مایوسی کو اپنے دل میں جگہ نہیں دینا چاہیے۔

مسلمان ایک روشن مستقبل کے کنارے کھڑے ہوئے ہیں ——— ان کا پیغمبر ان کو ابدی طور پر یہ پیغام دے رہا ہے۔

ہندستان میں

۱۹۶۷ میں راقم الحروف کی ادارت میں الجمعیۃ ویکلی نکلنا شروع ہوا تھا۔ اس کے پہلے شمارہ یکم ستمبر ۱۹۶۷ کے اداریہ میں میں نے لکھا تھا کہ اس وقت مسلمانوں کا سب سے بڑا اور سب سے پہلا مسئلہ یہ ہے کہ ان کے اندر حقیقت پسندانہ نقطہ نظر (realistic approach) پیدا کیا جائے۔

راقم الحروف کا خیال تھا اور ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کے لیے ہر قسم کی ترقی کے مواقع پوری طرح موجود ہیں۔ یہاں مکمل طور پر اس کا امکان موجود ہے کہ وہ باعزت اور خوش حال اور ترقی یافتہ گروہ بن کر رہ سکیں۔ مگر صرف ایک چیز کی کمی نے یہاں ان کے لیے غیر ضروری قسم کے مسائل پیدا کر رکھے ہیں، اور یہ کمی حقیقت پسندانہ نقطہ نظر کی ہے۔ مسلمانوں کے اندر اگر حقیقت پسندی آجائے تو کوئی بھی چیز ان کی ترقی کو روکنے والی نہیں بن سکتی۔

"۳۰ اکتوبر ۱۹۹۰" کو پیش آنے والے حالات نے ملک میں جو نیا رخ اختیار کیا ہے، وہ بظاہر تشویشناک ہے، مگر مجھے یقین ہے کہ یہ عَسٰی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ (البقرہ ۲۱۶) کا مصداق ہے۔ اس بظاہر ناپسندیدہ صورت حال میں ان کے لیے عظیم خیر چھپا ہوا ہے۔

وہ خیر کیا ہے۔ وہ خیر یہی حقیقت پسندی ہے۔ موجودہ دنیا میں کامیابی کا سب سے بڑا راز حقیقت پسندانہ مزاج ہے۔ آدمی کی فطرت خود بخود اس کو حقیقت پسندی کی طرف رہنمائی کرتی ہے، مگر موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے نام نہاد لیڈر اپنی سطحی اور جذباتی باتوں سے مسلمانوں کو بہکائے ہوئے تھے۔ اب حالات نے ان نااہل لیڈروں کی نااہلی کو دو اور دو چار کی طرح ثابت کر دیا ہے۔ قوی امید ہے کہ اب مسلمان ان لیڈروں کو چھوڑ دیں گے۔ اب وہ فطرت اور قرآن اور اسوۂ رسولؐ کی روشنی میں اپنی راہ عمل بنائیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تاریخ کے سب سے زیادہ حقیقت پسند انسان تھے۔ اسی لیے آپ نے تاریخ کی سب سے بڑی کامیابی حاصل کی۔ موجودہ حالات اب مسلمانوں کو ایسے مقام پر لے آئے ہیں جہاں وہ خود بخود حقیقت پسند بن جائیں گے۔ اور ان کی زندگی کا یہ نیا موڑ بلاشبہ ان کی کامیابی اور ترقی کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔

زمین و آسمان کا پورا نظام حقائق کی بنیاد پر چل رہا ہے۔ انسان بھی اس دنیا میں حقائق کی رعایت کر کے کامیاب ہو سکتا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ مسلمانوں نے اب اس راز کو پا لیا ہے۔ اور اس راز کو پالینے ہی کا دوسرا نام کامیابی ہے۔

قدرت کا پیغام

مسلمانوں سے میں قدرت کی زبان میں کہوں گا کہ زمین و آسمان کے اشاروں کو سمجھو، اور کائنات میں نشر ہونے والے پیغام کو سنو۔ کیوں کہ یہ دنیا ہر آن تمہارے لیے امید کی خبریں نشر کر رہی ہے۔

یاد رکھو، تاریک رات کا آنا روشن صبح کے آنے کی تمہید ہے۔ خزاں کا موسم یہ خبر دیتا ہے کہ جلد ہی بہار کا موسم آنے والا ہے۔ یہ قدرت کا اٹل قانون ہے۔ یہ قانون جس طرح مادی دنیا کے لیے ہے اسی طرح وہ انسانی دنیا کے لیے ہے، اور یقینی طور پر خود تمہارے لیے بھی۔

بظاہر اس وقت مسلمانوں کو صبر آزما حالات کا سامنا ہے۔ مگر یہ حالات عین خدا کی رحمت ہیں۔ یہ مسلمانوں کے مس خام کو کندن بنانے کا خدائی انتظام ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ صبر مومن کا ہتھیار ہے (الصبر معول المومن) صبر ایک قسم کا تربیتی کورس ہے جو آدمی کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو جگاتا ہے۔ صبر آدمی کے اندر پختگی کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ صبر آدمی کو بلند انسانی اوصاف کا حامل بناتا ہے۔ صبر آدمی کو یہ طاقت دیتا ہے کہ وہ اعلیٰ اسلامی اخلاقیات پر قائم ہو سکے۔ صبر آدمی کو معمولی انسان کے درجہ سے اٹھا کر غیر معمولی انسان کے درجہ میں پہنچا دیتا ہے۔ صبر کسی فرد یا قوم کا سب سے بڑا خزانہ ہے۔

صبر مایوسی کی بات نہیں، صبر خوش خبری کا لمحہ ہے۔ صبر اس بات کی علامت ہے کہ خدا کی مدد قریب آگئی ہے۔ کیوں کہ قرآن میں اعلان کیا گیا ہے کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے، اللہ صبر کا ثبوت دینے والوں کو دنیا کا امام بنا دیتا ہے۔

صبر کی طاقت

حضرت موسیٰ اور حضرت مسیح کے درمیانی زمانہ میں بنی اسرائیل کے یہاں جنگ کا ایک واقعہ ہوا۔ اس وقت بنی اسرائیل کے جوانوں کی تعداد کم تھی اور دشمن کی فوج تعداد اور اسباب میں بہت زیادہ تھی۔ اس فرق کو دیکھ کر بنی اسرائیل کے لوگ ڈر گئے۔ انھوں نے کہا کہ ہم کو دشمن سے لڑنے کی طاقت نہیں (البقرہ ۲۴۹)

بائبل کے بیان کے مطابق، اس وقت بنی اسرائیل کے سردار (یونتن) نے اپنے ساتھی سے کہا کہ آ ہم اُدھر ان نامختونوں کی چوکی کو چلیں۔ ممکن ہے کہ خداوند ہمارا کام بنا دے۔ کیوں کہ خداوند کے لئے بہتوں یا تھوڑوں کے ذریعہ سے بچانے کی قید نہیں (۱۔سموئیل ۱۴ : ۶)۔ یہی بات قرآن میں ان الفاظ میں نقل کی گئی ہے :

قال الذین یظنون انھم ملاقو اللہ کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ باذن اللہ واللہ مع الصابرین (البقرۃ ۲۴۹)	جو لوگ یہ جانتے تھے کہ وہ اللہ سے ملنے والے ہیں، انھوں نے کہا کہ کتنی ہی چھوٹی جماعتیں اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آئی ہیں، اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

اس آیت میں قلیل اور کثیر کا لفظ صرف عددی معنوں میں اقلیت اور اکثریت کے لئے نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ وہ کمزور اور طاقت ور کے معنی میں بھی ہے۔ عربی زبان میں قلیل اور کثیر کا لفظ اس توسیعی مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جاہلی دور کے عرب شاعر کا یہ شعر اس کی ایک مثال ہے :

فان الٔف فی شرارکم قلیل فانی فی خیارکم کثیر

قرآن کی اس آیت میں دراصل اس بات کا اعلان ہے کہ کسی گروہ کا قلیل التعداد یا کمزور ہونا اس بات کا ثبوت نہیں کہ وہ کثیر التعداد یا طاقت ور فریق کے مقابلہ میں ہمیشہ ناکام رہے۔ اس دنیا کا نظام اس طرح بنا ہے کہ یہاں کمزور بھی طاقت ور پر غالب آسکتا ہے۔ یہاں اقلیت بھی اکثریت کو مفتوح کر سکتی ہے۔

اس فتح و کامرانی کا راز آیت میں صبر بتایا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صبر کوئی

انفعالی کیفیت یا بزدلی کی چیز نہیں۔ صبر ایک فعال صفت ہے۔ وہ ایک بہادرانہ خصوصیت ہے۔ صبر اتنی عظیم چیز ہے کہ جو لوگ اس کا ثبوت دیں وہ خدا کی خصوصی نصرت کے مستحق بن جاتے ہیں۔ حتی کہ اس کا نتیجہ اس صورت میں نکلتا ہے کہ ایک بظاہر کمزور گروہ ایک بظاہر طاقت ور گروہ کے اوپر غلبہ حاصل کر لیتا ہے

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں ایک گروہ اور دوسرے گروہ کے درمیان ہمیشہ مقابلہ جاری رہتا ہے۔ اس مقابلہ میں کبھی ایک گروہ غالب آجاتا ہے اور دوسرا گروہ اس کے مقابلہ میں بظاہر مغلوب اور کمزور ہو کر رہ جاتا ہے۔

جب کوئی گروہ دوسرے کے مقابلہ میں کمزور پڑ جائے اور اس کو نقصان اٹھانا پڑے تو اس کے بعد کمزور گروہ کے رد عمل کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک غیر صابرانہ رد عمل، دوسرا صابرانہ رد عمل۔

غیر صابرانہ رد عمل یہ ہے کہ آدمی مایوسی اور احساس شکست کا شکار ہو کر رہ جائے۔ وہ پست ہمت ہو کر بیٹھ جائے۔ وہ سمجھ لے کہ اب میرے لئے یہاں کچھ نہیں ہے۔ وہ دوسرے گروہ کو اپنی مصیبتوں کا ذمہ دار ٹھہرا کر اس کے خلاف فریاد اور احتجاج کرنے لگے۔ یہ تباہی کی صورت ہے۔ دوسروں نے اگر اس کو ابتدائی نقصان پہنچایا تھا تو اس کے بعد وہ خود اپنے آپ کو نقصان پہنچا کر اپنی تباہی کی تکمیل کر لیتا ہے۔

دوسرا رد عمل صابرانہ رد عمل ہے۔ یہ وہ شخص ہے جو چوٹ لگنے کے بعد اپنے آپ کو سنبھالتا ہے۔ اس کا ذہن شکایت کرنے کے بجائے تدبیر کے رخ پر چلنے لگتا ہے۔ وہ مایوسی میں پڑنے کے بجائے امید کے پہلوؤں پر غور کرتا ہے۔ وہ کھوئے ہوئے کا غم کرنے کے بجائے یہ چاہتا ہے کہ ملے ہوئے کو استعمال کرے۔

جو لوگ زک اٹھانے کے بعد اس طرح صبر کے طریقہ کو اختیار کریں وہ گویا اپنے آپ کو حالات سے اوپر اٹھاتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اس حالت کی طرف لے جاتے ہیں جہاں ان کے اندر چھپے ہوئے امکانات جاگیں۔ ان کی شخصیت مزید طاقت کے ساتھ ابھر آئے۔

غیر صابر آدمی نقصان کو نقصان کے روپ میں دیکھتا ہے۔ صابر آدمی نقصان کو اپنے لئے چیلنج سمجھتا ہے۔ وہ حالات کا مقابلہ کر کے اپنے آپ کو آگے لے جانا چاہتا ہے۔ اور جو لوگ نقصان کا اس

طرح استقبال کریں، وہ ہمیشہ آگے بڑھتے ہیں۔ وہ اپنی ناکامی کو دوبارہ عظیم تر کامیابی میں تبدیل کر لیتے ہیں۔

جب ایسا ہو کہ ایک گروہ دوسرے گروہ کے اوپر ظلم کرے، اور مظلوم گروہ بھی اس کے جواب میں ظالمانہ کارروائی کرنے لگے تو دونوں گروہ اخلاقی اعتبار سے برابر ہو گئے۔ ایسے دونوں گروہوں کو اللہ ان کی اپنی ذات کے حوالے کر دیتا ہے۔ ان میں سے کسی کو بھی اللہ کی مدد حاصل نہیں ہوتی۔

لیکن اگر ایسا ہو کہ ایک گروہ دوسرے گروہ کو اپنے ظلم اور سرکشی کا نشانہ بنائے۔ مگر مظلوم گروہ جوابی کارروائی کرنے کے بجائے اس پر صبر کر لے، تو خدا صابر گروہ کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ وہ مظلوم گروہ کی مدد کر کے اس کو ظالم گروہ کے اوپر فاتح بنا دیتا ہے۔

مظلوم گروہ کو یہ فائدہ تمام تر صبر کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔ صبر کوئی بے عملی کی حالت نہیں، صبر سب سے بڑا عمل ہے۔ صبر یہ ہے کہ آدمی اپنے اندر اٹھتے ہوئے جذبات کو منفی رخ سے ہٹا کر مثبت رخ کی طرف پھیر دے۔

صبر کی صفت اللہ تعالیٰ کو بے حد پسند ہے۔ جو شخص صبر کرے وہ بے پناہ شخصیت کا مالک بن جاتا ہے۔ تمام قوانین فطرت اس کے حق میں متحرک ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی خصوصی مدد کے تحت وہ ایک ناقابل تسخیر ہستی بن جاتا ہے۔

صبر آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ردعمل کی نفسیات سے اوپر اٹھائے۔ وہ ظالم کی بدخواہی کے جواب میں اس کے ساتھ خیر خواہی کر سکتا ہے۔ وہ برے عمل کا جواب بھلے عمل سے دینے کا مزاج پیدا کرتا ہے۔ صابر آدمی ظالم کے ظلم پر اس کے خلاف بد دعا نہیں کرتا بلکہ اللہ تعالیٰ سے اس کی ہدایت کی دعا مانگتا ہے۔

صبر آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ ایسا نہ کرے کہ وہ اشتعال انگیزی کے وقت مشتعل ہو جائے اور عاجلانہ کارروائی میں اپنی طاقت کو ضائع کرے۔ صبر آدمی کو بے پناہ حد تک طاقتور بنا دیتا ہے۔ وہ آدمی کی خفیہ صلاحیتوں کو جگاتا ہے۔ وہ آدمی کے چھپے ہوئے امکانات کو بیدار کرتا ہے۔ وہ آدمی کے اندر منصوبہ بند کام کرنے کا مزاج پیدا کرتا ہے۔ صبر آدمی کو معمولی انسان کے درجہ سے اٹھا کر غیر معمولی انسان کے درجہ میں پہنچا دیتا ہے۔

فتح باب

۱۳ نومبر ۱۹۹۰ کا واقعہ ہے۔ ایک جگہ میں نے دیکھا کہ کچھ ہندو بیٹھے ہوئے ہیں اور ایک مسلمان ان سے اسلام کے بارے میں گفتگو کر رہا ہے۔ ہندوؤں کا کہنا تھا کہ تمہارا مذہب مار کاٹ کا مذہب ہے۔ مسلمان نے پوچھا کہ کیسے تم ایسا کہتے ہو۔ ہندو نے کہا کہ تم لوگ صبح ہی صبح اٹھ کر اپنی مسجدوں سے اللہ اکبر، اللہ اکبر کی پکار بلند کرتے ہو۔ اس کا مطلب یہی تو ہے کہ اللہ کے نام پر کافروں کو مارو۔ اللہ کے لیے لوگوں کو قتل کرو۔

مسلمان نے کہا کہ یہ آپ بالکل الٹی بات کہہ رہے ہیں۔ کیا آپ نے کبھی دیکھا ہے کہ اللہ اکبر کہنے کے بعد مسلمان اپنی مسجدوں میں کیا کرتے ہیں۔ مسلمان اس کے بعد وہ کام کرتے ہیں جس کو رکوع اور سجدہ کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ جھکتے ہیں اور اپنا سر زمین پر رکھ دیتے ہیں۔ پھر جب وہ نماز ختم کرتے ہیں تو کہتے ہیں: السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ یعنی تمام لوگوں پر سلامتی اور رحمت ہو۔

یہ مسلمان بظاہر کوئی عالم نہ تھا۔ اور نہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی یونیورسٹی کا پڑھا ہوا ہے۔ یہ بات اس نے فطرت کے زور پر کہی نہ کہ علم کے زور پر۔ یہ بات دراصل "معلم فطرت" نے اس کو بتائی تھی۔ جھوٹے رہنما جہاں گمراہ کرنے کے لیے موجود نہ ہوں، وہاں فطرتِ خداوندی انسان کی رہنما بن جاتی ہے۔ اور بلاشبہ فطرتِ خداوندی سے زیادہ بہتر کوئی معلم انسان کے لیے نہیں۔

میں نے مسلمان کی مذکورہ باتیں سنیں تو ایسا محسوس ہوا گویا میں اندھیرے سے نکل کر روشنی میں آگیا ہوں۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ موجودہ حالات نے ملت اسلام کے لیے تاریخ کا ایک نیا باب کھول دیا ہے۔ موجودہ حالات خود اپنی اندرونی منطق کے تحت مسلمانوں کو اسلام کا سچا مبلغ بنا رہے ہیں۔ یہ حالات خود بخود مسلمانوں کو بتا رہے ہیں کہ وہ اس اسلام کو لوگوں کے سامنے پیش کریں جو سچا اسلام ہے اور اسی کے ساتھ وہ موجودہ حالات میں ان کے لیے ایک ڈھال کا کام کرتا ہے۔

یعنی وہ اسلام جو دین فطرت ہے۔ جو انسان کے روحانی تقاضوں کا جواب ہے۔ جس میں محبت اور تواضع کی تعلیم ہے۔ جس کے اندر امن اور رحمت کا پیغام ہے۔ جو انسان کو یہ سکھاتا ہے کہ وہ اعلیٰ اخلاقی اصولوں کے ساتھ دنیا میں زندگی گزارے۔ وہ سورج کی طرح دنیا میں رہے جو ہر ایک کو اپنی روشنی پہنچاتا ہے، وہ پھول کی طرح معاملہ کرے جو اپنے دشمن کو بھی رنگ اور خوشبو کا تحفہ دیتا ہے۔

موجودہ صدی کے نصف اول تک دنیا میں مغربی استعمار کا دور تھا۔ اس زمانہ میں مسلم رہنماؤں نے لڑائی کا راستہ اختیار کیا۔ ان کو جنگ و جدال والا اسلام اپنے حق میں زیادہ مفید نظر آیا۔ چنانچہ ہندستان میں اور ساری دنیا میں ایک خود ساختہ اسلام کی دھوم مچادی گئی۔ حتی کہ یہی اسلام لوگوں کی نظر میں اصل اسلام بن گیا۔ اس زمانہ کے تمام مسلم رہنما ردعمل کی نفسیات کا شکار ہو کر قولی یا عملی لڑائی میں مشغول ہو گئے۔ یہی زمانہ ہے جبکہ اقبال نے کہا:

تیغوں کے سایہ میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں ۔۔۔ خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا

اس زمانہ میں مسلم اداروں نے تلوار کو اپنا شعار بنایا۔ ابوالکلام آزاد نے امام حسینؓ کو شہید اعظم اور تاریخ کا سب سے بڑا ہیرو بنا کر پیش کیا۔ ابوالاعلیٰ مودودی نے الجہاد فی الاسلام لکھی۔ وغیرہ۔ اس قسم کی تحریروں اور تقریروں نے اسلام کو لوگوں کی نظر میں جنگ اور ٹکراؤ کا مذہب بنا دیا۔ مسلمان اس بات کو بھول گئے کہ ان کے رسولؐ کو خدا نے ساری دنیا کے لیے رحمت بنا کر بھیجا تھا۔ اور اسلام کے جس سبق کو مسلمان بھلا دیں، اس کو غیر مسلم بدرجۂ اولیٰ فراموش کر دیں گے۔

مگر اب نئے حالات کا دباؤ اس غلط ذہن کی تصحیح کر رہا ہے۔ اب مسلمان عین حالات کے تقاضے کے تحت، اس اسلام کی طرف لوٹ رہے ہیں جو اصلی اور حقیقی اسلام ہے۔ اب نہ صرف یہ ہوگا کہ مسلمان اسلام کی صبر و اعراض اور نصح و امانت والی تعلیمات کی اہمیت کو از سر نو دریافت کریں گے، بلکہ خود اپنی فکری مدافعت کے لیے اس کو ضروری سمجھیں گے کہ اسلام کے رحمت والے پیغام کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کریں۔ تاکہ دوسروں کی نظر میں ان کی صحیح تصویر بنے۔ دوسروں کی نظر میں ان کا وقار پیدا ہو۔ وہ عزت اور امن کے ساتھ اس ملک میں رہ سکیں۔ وہ ایسے دین کے حامل قرار پائیں جو آدمی کو لوگوں کی نظر میں محبوب و مطلوب بنا دیتا ہے۔

اب تک مسلمانوں کے لیڈر انھیں خود ساختہ اسلام کا نمائندہ بنائے ہوئے تھے۔ اب نئے حالات انھیں اس طرف لے جا رہے ہیں کہ وہ خدا کے سچے دین کے نمائندہ بنیں یہ واقعہ مسلمانوں کے لیے مستقبل کی تعمیر ہے۔ وہ اسلامی دعوت کے لیے فتح باب کی حیثیت رکھتا ہے۔

ان حالات پر جب میں غور کرتا ہوں تو مجھے تاریخ دوبارہ وہاں جاتی ہوئی نظر آتی ہے جہاں وہ تاتاری حملہ کے بعد عالم اسلام میں پہنچی تھی۔ عباسی دور میں مسلمانوں کے درمیان اسلام کا جو ڈھانچہ موجود تھا، وہ ایک ایسا ڈھانچہ تھا جس میں انسان کے لیے بہت کم کشش باقی رہ گئی تھی۔ اسلام کا توسیعی سیلاب رک گیا تھا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے اس مصنوعی ڈھانچہ کو توڑ دیا۔ اس کے بعد مسلمانوں کے درمیان وہ اسلام آگیا جو سچا

اسلام تھا، جو انسانی فطرت کے ساتھ پوری مطابقت رکھتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام دوبارہ سیلاب کی طرح پھیلنے لگا۔ قومیں کی قومیں اسلام میں داخل ہوگئیں۔ نئے خون کی اس آمیزش کے بعد مسلمانوں نے دوبارہ اسلام کی ایک طاقت ور تاریخ بنائی جو صدیوں تک جاری رہی۔

عباسی دور کے اسلام کی ایک فکری مثال لیجئے۔ ہماری موجودہ فقہ زیادہ تر اسی عباسی دور میں بنی ہے۔ عباسی دور مسلمانوں کے لیے فتح و غلبہ کا دور تھا۔ اس کے زیر اثر مسلمانوں میں حاکمانہ نفسیات پیدا ہوگئی۔ مسلمان اپنے آپ کو "داعی" کے بجائے "فاتح" سمجھنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فقہ میں کئی ایسے مسائل داخل ہو گئے جو محض اس وقت کے سیاسی حالات کا نتیجہ تھے نہ کہ حقیقی معنوں میں اسلامی تعلیم کا نتیجہ۔

مثلاً ہمارے فقہار نے پوری دنیا کو دو حصوں میں بانٹ دیا۔ ایک حصہ کو انھوں نے دار الاسلام کہا اور دوسرے حصہ کو دار الحرب۔ یہ تقسیم یقینی طور پر زمانی حالات کا نتیجہ تھی۔ یہ فقہ اگر عہد نبوت میں بنتی جبکہ ایک طرف دعوت الی اللہ کا کام جاری تھا۔ دوسری طرف مدینہ میں اسلام کا با اختیار مرکز قائم ہو رہا تھا۔ تیسری طرف جارح اور حملہ آور قبائل سے اسلام کی دفاعی جنگ ہو رہی تھی۔ تو نقشہ مختلف ہوتا۔

ان حالات میں فقہار اگر عالم انسانی کی تقسیم کرتے تو وہ اس کو دو کے بجائے تین حصوں میں بانٹتے ـــــــ دار الدعوۃ، دار الاسلام، دار الحرب (دار الحرب فقہار کے معروف معنی میں نہیں، بلکہ اس معنی میں کہ وہ ملک جس سے جارحیت کی بنا پر مسلمانوں کو دفاعی جنگ لڑنی پڑے اور اس طرح مسلمان ان سے برسر جنگ ہو گئے ہوں) مگر زمانی حالات کی بنا پر فقہار کی تقسیم میں دار الدعوۃ حذف ہو گیا، حالانکہ وہ اسلام کا اہم ترین حصہ تھا۔

حقیقی اسلام جس کا نمونہ رسولؐ اور اصحاب رسول نے قائم کیا ہے، اس کے مطابق مسلمانوں کا مزاج بنے تو وہ یہ ہوگا کہ مسلمان دنیا کی قوموں کو اسلام کے پیغام رحمت کا مخاطب بنائیں۔ جہاں مسلمانوں کو فیصلہ کن اکثریت حاصل ہو وہاں کی عملی زندگی کا نقشہ اسلامی احکام کی بنیاد پر قائم کریں۔ اور اگر کوئی قوم ان کے خلاف جارحیت کرے تو اس سے مقابلہ کر کے اسلام کا دفاع کریں۔ مگر مذکورہ فقہی تقسیم میں دعوت کا پہلو سرے سے حذف ہو گیا۔ اس میں صرف دوسرا اور تیسرا پہلو باقی رہا، اور وہ بھی ناتمام صورت میں۔

فقہار کی تقسیم کے مطابق، اُس وقت کے مسلمانوں میں جو ذہن بنا وہ حاکمانہ ذہن تھا نہ کہ داعیانہ

ذہن۔ دار الاسلام اور دار الحرب کی عالمی تقسیم کے بعد عملی طور پر مسلمانوں کے اندر یہی فکر ابھر سکتا تھا اور یہی فکر ابھرا کہ مسلمان کے لیے کرنے کا کام صرف دو ہے —— حاصل شدہ حصۂ زمین پر حکومت کرنا۔ اور زمین کا جو حصہ ابھی حاصل نہیں ہوا اس کو لڑکر اپنے قبضہ میں لانا تاکہ اس پر حکومت کی جا سکے۔

مسلمانوں کا یہی غیر صحیح ذہن تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے تاتاری قبائل کو مدعو سمجھنے کے بجائے انھیں اپنا حریف سمجھا۔ چنگیز خاں کے وفد کا احترام کرنے کے بجائے انھوں نے ان کی تحقیر کی۔ خوارزم شاہ کے حکم کے تحت تاتاری وفد کے اموال چھین لیے گئے اور انھیں قتل کر دیا گیا (البدایہ والنہایہ ۸۳/۱۳)

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں اور تاتاریوں کے درمیان داعی۔ مدعو کا رشتہ قائم نہ ہو سکا۔ اس کے بجائے ان کے درمیان حریف اور دشمن کا رشتہ قائم ہو گیا۔ چنگیز خاں کے دل میں ابتداءً مسلمانوں کے لیے نرم گوشہ تھا۔ مگر مذکورہ واقعہ کے بعد اس کے دل میں مسلمانوں کے خلاف غصہ اور انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ تاتاری لشکر اپنی تمام وحشت و بربریت کے ساتھ عالم اسلام پر ٹوٹ پڑا۔ ان کا غصہ صرف اس وقت ختم ہوا جب کہ انھوں نے عالم اسلام کو اپنے قدموں کے نیچے پامال کر دیا۔

اس دور میں جو عملی خرابی پیدا ہوئی، اس کو میں ایک مثال کے ذریعہ واضح کروں گا۔ ساتویں صدی ہجری میں تاتاری جب عباسی خلافت کو زیر و زبر کر چکے اور نتیجۃً تاتاری احساسِ غلبہ اور مسلمان احساسِ مغلوبیت سے دوچار ہو گئے، اس زمانہ کا واقعہ ہے۔ ایک تاتاری نوجوان تغلق تیمور ایرانی علاقہ میں شکار کھیل رہا تھا۔ اس کی ملاقات ایک ایرانی مسلمان سے ہوئی۔

تاتاری نوجوان گھوڑے پر سوار تھا۔ اس نے احساس برتری کے تحت اپنے کتّے کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ تم مسلمانوں سے تو میرا یہ کتّا اچھا ہے۔ اگر یہ مسلمانوں کے غلبہ اور حکمرانی کا دور ہوتا تو مذکورہ مسلمان اس بات کو سن کر فوراً اپنی تلوار نکالتا اور تاتاری نوجوان کی گردن مار کر کہتا کہ اب بتاؤ میں اچھا ہوں یا تمہارا کتّا اچھا ہے۔

مگر اس وقت مسلمان احساس مغلوبیت سے دوچار تھے۔ حالات نے انھیں شکستگی کے مقام پر پہنچا دیا تھا۔ ان کے دلوں میں کبر اور سرکشی کے بجائے تواضع اور دردمندی کے جذبات بھرے ہوئے تھے۔ چنانچہ تاتاری نوجوان کا جملہ سن کر مسلمان کی زبان سے نکلا: "اگر ہم کو سچا دین نہ ملتا تو یقیناً ہم کتّے سے زیادہ برے ہوتے"۔ مسلمان کے اس پرسوز جملہ نے تاتاری نوجوان کو تڑپا دیا۔ اس کے بعد وہ سچے دین کی تحقیق میں لگ گیا۔

یہاں تک کہ آخر کار اس نے اسلام قبول کر لیا (ایمانی طاقت ۲۶-۲۷)

مسلمانوں پر جو مصیبت آتی ہے، وہ قرآن کے مطابق، مصیبت نہیں ہوتی بلکہ آزمائش ہوتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے دلوں کو پاک کرے اور ان کی فکر کی تصحیح کرے (آل عمران ۱۵۴) موجودہ حالات مجھے ٹھیک اسی نوعیت کے نظر آرہے ہیں۔

عباسی دور کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تاتاریوں کے ذریعہ جھنجھوڑا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی حاکمانہ فکر دوبارہ دعوتی فکر میں تبدیل ہوئی۔ ان کا احساس برتری ٹوٹا اور اس کی جگہ تواضع، پرسوزی اور حقیقت پسندی کا احساس ابھر آیا۔ ان چیزوں نے مسلمانوں میں دوبارہ وہ اوصاف پیدا کیے جو داعی کے اوصاف ہوتے ہیں۔ وہ تاتاریوں کے درمیان اس سیدھے اور سچے اسلام کے نمائندہ بن گئے جو انسان کو خود بخود اپنی طرف کھینچتا ہے۔

اس طرح مسلم دنیا میں ایک نیا عمل جاری ہوا جس کو دعوتی عمل کہا جا سکتا ہے۔ اس نے تاتاریوں کے دلوں کو مسخر کرنا شروع کر دیا۔ تاتاری قبائل اسلام میں داخل ہونے لگے۔ یہاں تک کہ پچاس سال کے اندر بیشتر تاتاریوں نے اور خود ان کے شاہی خاندان نے اسلام قبول کر لیا۔ وہ لوگ جو اسلام کو صفحہ ہستی سے مٹانے کا نعرہ لے کر اٹھے تھے، وہ اسلام کے خادم اور سپاہی بن گئے۔

حالات بتاتے ہیں کہ یہی تاریخ دوبارہ دہرائی جانے والی ہے۔ اور یہ سب کچھ خود اللہ کی طرف سے کیا جارہا ہے، اور اللہ بلاشبہ سب سے بڑا کارساز ہے۔

سبب اپنے اندر

قرآن میں جس طرح ذکر و عبادت کے احکام ہیں، اسی طرح قرآن میں اجتماعی امور کی بابت بھی کھلے بیانات موجود ہیں۔ اس اعتبار سے جب ہم موجودہ معاملہ میں قرآن کی رہنمائی معلوم کرنا چاہتے ہیں تو قرآن نہایت واضح طور پر یہ بتاتا ہوا نظر آتا ہے کہ اس دنیا میں جو افتاد بھی کسی کے ساتھ پیش آتی ہے وہ حقیقۃً ایک کے اوپر دوسرے کی زیادتی نہیں ہوتی، بلکہ وہ کمزور فریق کی کمزوری کی سزا ہوتی ہے جو طاقت ور فریق کی طرف سے اسے بھگتنی پڑتی ہے۔ آخرت میں ہر ایک کا جو حساب ہوگا، وہ ایک الگ معاملہ ہے۔ مگر دنیا کے اعتبار سے جو صورتِ حال ہے وہ یہی ہے۔

قرآن (البقرہ ۳۰) میں واضح طور پر اعلان کیا گیا ہے کہ جو مصیبت بھی تمہارے اوپر پڑتی ہے وہ خود تمہارے اپنے کیے کا نتیجہ ہوتی ہے (وما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم) الشوریٰ ۳۰

ایک مرفوع حدیث کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اے علی، جو بھی بیماری یا سزا یا مصیبت تم کو پہنچتی ہے وہ خود تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہوتی ہے (یا علی، ما اصابکم من مرض او عقوبۃ او بلاء فی الدنیا فبما کسبت ایدیکم) الجامع لاحکام القرآن ۱۶/۳۰

قرآن میں اس اصول کا انطباق سب سے پہلے خود صحابۂ کرام کی جماعت پر کیا جا چکا ہے۔ یہ انطباق بعد کے مسلمانوں کے لیے نہایت سبق آموز ہے۔

ایک مثال غزوۂ احد (۳ ھ) کی ہے۔ یہ جنگ یک طرفہ طور پر مخالفین اسلام کی سازش اور ان کی جارحیت کے نتیجہ میں پیش آئی تھی۔ اس جنگ میں ابتداءً مسلمان کامیاب ہو گئے۔ مگر آخر میں ان کو شکست ہوئی۔ قرآن میں اس پر تبصرہ کیا گیا تو مخالفین اسلام کی کھلی زیادتیوں کے باوجود ہارنے کی ذمہ داری خود مسلمانوں کے اوپر ڈال دی گئی۔ کہا گیا کہ اس جنگ میں شکست کا سبب یہ تھا کہ تم نے کمزوری دکھائی، تم نے معاملہ میں نزاع کیا اور تم نے رسول کی ہدایت کی خلاف ورزی کی (حتی اذا فشلتم وتنازعتم فی الامر وعصیتم من بعد ما اراکم ما تحبون) آل عمران ۱۵۲

دوسری مثال غزوۂ حنین (۸ھ) کی ہے۔ اس جنگ میں بھی تمام تر زیادتی مخالفین اسلام کی تھی۔ انھوں نے غدّارانہ طور پر مسلمانوں کی جماعت پر حملہ کر دیا تھا۔ اس جنگ میں ابتداءً مسلمانوں کو شکست ہوگئی۔ وہ میدانِ جنگ سے بھاگنے لگے۔ تاہم بعد کو وہ پھر سنبھلے اور دوبارہ جنگ کی۔ دوبارہ جنگ میں اللہ تعالیٰ نے انھیں کامیابی عطا فرمائی۔

اس جنگ میں مخالفین نے مسلمانوں کو کافی نقصان پہنچایا تھا۔ اس پر قرآن میں تبصرہ کیا گیا۔ اس تبصرہ میں بھی، مخالفین کی کھلی ہوئی زیادتی کے باوجود خود مسلمانوں کو تنبیہہ کی گئی۔ فرمایا کہ حنین میں ابتداءً جو شکست اور نقصان پیش آیا اس کی وجہ تمہاری یہ کمزوری تھی کہ تم کو اپنی کثرتِ تعداد پر ناز ہوگیا (ویوم حنین اذ اعجبتکم کثرتکم فلم تغن عنکم شیئاً) التوبہ ۲۵

قرآن و حدیث کے ان بیانات کے مطابق، صحیح طریقہ یہ ہے کہ جب ایک فریق دوسرے فریق کی زیادتی کا شکار ہو تو زیادتی کا شکار ہونے والا فریق شکایت اور احتجاج میں اپنا وقت ضائع نہ کرے۔ اس کے برعکس اس کو چاہیے کہ وہ اپنا ذاتی احتساب کرنا شروع کر دے۔

وہ دوسروں کے ظلم کا اعلان کرنے کے بجائے اپنی کوتاہیوں کو تلاش کرے۔ وہ دوسروں سے مطالبہ کرنے کے بجائے خود اپنی حالت کی اصلاح کی طرف توجہ دے۔ کیوں کہ جو کچھ پیش آیا ہے، اس کا سبب خود اس کے اپنے اندر ہے نہ کہ اس کے باہر۔

جس مسئلہ کا سبب آدمی کے اپنے اندر ہو، اس کے بارہ میں دوسروں کے خلاف شور و غل کرنا محض اپنا وقت ضائع کرنا ہے۔ ایسی کوششوں سے اس کو کچھ ملنے والا نہیں۔ اس کے معاملہ کی اصلاح صرف اپنی کمیوں کو دور کرنے سے ہو سکتی ہے، اور پہلی فرصت میں اس کو اسی اصل کام میں لگ جانا چاہیے۔

شکایت اور احتجاج کا طریقہ آدمی کے مسائل میں اضافہ کرتا ہے۔ محنت اور عمل کا طریقہ آدمی کو اس کے حال سے اٹھا کر نئے مستقبل کی طرف لے جاتا ہے۔

بے بنیاد خوف

متحدہ عرب امارات سے ایک عربی مجلّہ منار الاسلام کے نام سے شائع ہوتا ہے۔ اس نے مارچ ۱۹۸۶ میں ہندستانی مسلمانوں کے بارہ میں ایک خصوصی رپورٹ چھاپی تھی۔ اس کا عنوان تھا: القضاء على المسلمين في الهند (ہندستان میں مسلمانوں کا خاتمہ) اس رپورٹ میں ہندستان کی بعض انتہا پسند ہندو تنظیموں کی خفیہ سازشوں کا "انکشاف" کیا گیا تھا جو رپورٹ کے مطابق ہندستان سے مسلمانوں کا خاتمہ کرنے کے لئے ۱۹۳۹ سے سرگرم ہیں۔

رپورٹ میں دکھایا گیا تھا کہ ایک ہندو فرقہ پرست تنظیم نے موجودہ صدی کی چوتھی دہائی میں اپنے کارکنوں پر مشتمل ایک خفیہ وفد اسپین روانہ کیا تھا۔ تاکہ وہاں جاکر وہ گہرائی کے ساتھ اس بات کا جائزہ لے کہ وہاں کے عیسائیوں نے کس طرح اسپین کی سرزمین سے مسلمانوں کا خاتمہ کیا۔ اور پھر ہندستان میں بھی اسپین کی اسی قدیم تاریخ کو دہرایا جاسکے۔

حیدرآباد کے ماہنامہ رہگذر (مئی ۱۹۸۷) میں ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ اس کا عنوان تھا: ہندستان میں مسلمانوں کا صفایا کس طرح کیا جائے گا، ہندو نازی ہسپانیہ کے نقش قدم پر۔ صاحب مضمون نے لکھا تھا کہ:

"ہندستان کے ہندو نازیوں نے اس صدی کے تیسرے اور چوتھے دہے میں اس مضمون کا گہرا مطالعہ کیا کہ کس طرح اسلام کو ہسپانیہ سے نکال باہر کیا گیا۔ انھوں نے اس کا مطالعہ خاص طور پر کیا تاکہ اس کی نقل ہندستان میں بھی کی جائے۔ آج ہندو نازی حکومت کے اندر اور باہر ہر جگہ باقاعدگی سے ہسپانوی طریقے اختیار کر رہے ہیں"۔

مضمون میں دکھایا گیا تھا کہ ہسپانیہ کی منظم عیسائی جماعتوں اور فرڈینینڈ کی حکومت نے وہاں سے مسلمانوں کو ختم کرنے کے لئے نو طریقے اختیار کئے تھے۔ اب یہی نو طریقے ہندستان میں بھی مسلمانوں کے خلاف استعمال کئے جارہے ہیں۔

یہ بات پچھلی نصف صدی سے مختلف شکلوں میں کہی جارہی ہے۔ ہندستانی مسلمانوں کے دینی اور علمی حلقوں میں اس کا بار بار چرچا کیا گیا ہے۔ مسلم خطیبوں نے اپنی تقریروں میں اور اصحاب

قلم نے اپنی تحریروں میں مسلمانوں کو اس مفروضہ خطرہ سے ہوشیار کرنے کی مسلسل کوشش کی ہے۔ ملی تشخص کی حفاظت اور نئی نسل کے مستقبل کے تحفظ کی تحریکیں زیادہ تر اسی مخصوص ذہن کی پیداوار ہیں۔

یہ سراسر بے بنیاد خوف ہے جو لغویت کی حد تک بے معنی ہے۔ یہ ویسی ہی بات ہے جیسے کسی دیہاتی سے ایک شخص نے کہا کہ تمہارا کان کوا لے گیا۔ وہ دیہاتی آدمی کوے کے پیچھے دوڑنے لگا۔ اس نے اپنے کان پر ہاتھ رکھ کر یہ دیکھنے کی کوشش نہ کی کہ اس کا کان بدستور اس کے سر پر موجود ہے۔

اسپین کا مذکورہ واقعہ اب سے پانچ سو سال پہلے پیش آیا۔ وہ زمانہ آج کے دور سے سراسر مختلف تھا۔ اس زمانہ میں بادشاہ کی زبان قانون ہوا کرتی تھی۔ اخبارات اور ریڈیو موجود نہ تھے جو کسی مقامی خبر کو عالمی سطح پر پھیلا سکیں۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل اور اقوام متحدہ جیسے ادارے موجود نہ تھے جو ظلم وزیادتی کے خلاف احتجاج کریں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس وقت عالمی حالات کا وہ دباؤ موجود نہ تھا جو آج ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پچھلے پانچ سو سال کے اندر دنیا کے حالات اتنے زیادہ بدل چکے ہیں کہ اب یہ بالکل ناممکن ہوگیا ہے کہ کوئی بھی طاقت، خواہ وہ سپر پاور ہی کیوں نہ ہو، کسی انسانی مجموعہ کے خلاف اسپین جیسی تاریخ کو دہرا سکے۔

تاہم تھوڑی دیر کے لئے ان تمام ناممکنات کو ممکن فرض کر لیجئے۔ اور متعلقہ اعداد وشمار کی روشنی میں یہ حساب لگائیے کہ بالفرض اگر موجودہ ہندستان میں مسلمانوں کے ساتھ وہ المناک تاریخ دہرائی جائے جو اسپین میں قدیم مسیحی حکمرانوں نے دہرائی تھی تو اس تاریخی عمل کو اپنی آخری حد تک پہنچانے کے لئے کتنا عرصہ درکار ہوگا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ اسپین میں مسلمان ۷۱۲ء میں داخل ہوئے۔ وہاں ان کی حکومت ۷۸۰ سال تک باقی رہی۔ زوال کا شکار ہونے کے بعد، اسپینی مسلمانوں کی سیاسی قوت کا آخری مرکز غرناطہ تھا۔ جو ۱۴۹۲ء میں ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔

۱۴۹۲ء میں جب آخری مسلم سلطان نے مسیحی حکمراں کے حق میں دست برداری لکھ دی اور وہ غرناطہ سے روتا ہوا رخصت ہوا، اس کے بعد چرچ اور حکومت کے منصوبے کے تحت اسپین سے مسلمانوں کو

ختم کرنے کی مہم شروع کر دی گئی۔ مگر ظلم اور سفاکی کے تمام طریقوں کو اختیار کرنے کے باوجود، اس مہم کی تکمیل میں ۱۲۰ سال لگ گئے۔ مسلمانوں کا آخری قافلہ ۱۶۱۲ء میں اسپین سے نکل سکا۔

اب فرض کیجئے کہ ہندستان میں قدیم اسپین کی تاریخ دہرائی جاتی ہے، اور یہ بھی فرض کر لیجئے کہ یہ عمل کسی بھی اندرونی یا بیرونی مداخلت کے بغیر بلا روک ٹوک مسلسل جاری رہتا ہے۔ تمام خلاف قیاس باتوں کو فرض کرنے کے بعد جو صورت حال پیش آئے گی، وہ تاریخی معلومات کے مطابق یہ ہوگی۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) نے اپنے آرٹیکل اسپین کی تاریخ (History of Spain) میں بتایا ہے کہ مسلمانوں کی فتح کے وقت اسپین کے باشندوں کی کل تعداد تخمیناً چالیس لاکھ تھی۔ جو عرب مسلمان اسپین میں داخل ہوئے، ان کی تعداد تقریباً پچاس ہزار تھی۔ اس تعداد میں دو طریقے سے اضافہ ہوا۔ ایک، توالد و تناسل کے ذریعہ۔ اور دوسرا، ان عیسائیوں کی شکل میں جو اسلام قبول کر کے مسلمانوں کی جماعت میں داخل ہو گئے۔ اس طرح آخری دور میں اسپین کے پانچ بڑے شہروں میں مسلمانوں کی مجموعی تعداد تین لاکھ ستاسی ہزار (387,000) تھی۔ (EB-17/419)

حساب کی آسانی کے لئے اسپین سے مسلمانوں کے خاتمہ کی مدت کو ایک سو سال مان لیجئے۔ اور اسپینی مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ کر کے اس کو پانچ لاکھ فرض کر لیجئے۔ اب دیکھئے کہ اسپین کی آزمودہ تدبیر کو اگر ہندستان میں اختیار کیا جائے تو یہاں کے ۲۰ کرور مسلمانوں کا خاتمہ کرنے کے لئے کتنی زیادہ مدت درکار ہوگی۔

علم الحساب بتاتا ہے کہ خاتمۂ نسل کے اس عمل کے پورا ہونے میں چالیس ہزار سال لگ جائیں گے۔ ایک سو سال میں پانچ لاکھ انسانوں کو ہلاک کرنے کی رفتار سے جو مدت قرار پاتی ہے وہ یہی ہے۔

واضح ہو کہ خاتمۂ نسل کے لئے ۴۰ ہزار سال کی یہ مدت بھی اس وقت ہے جب کہ اس درمیان میں کوئی بھی ناموافق صورت حال پیش نہ آئے۔ مثلاً توالد و تناسل کے ذریعہ مسلمانوں کی تعداد میں کوئی اضافہ نہ ہو۔ ہندو اپنی موجودہ طاقت کو مسلسل چالیس ہزار سال تک برقرار رکھیں۔ کوئی عالمی واقعہ اس رفتار میں خلل نہ ڈالے۔ ہندوؤں کے ساتھ وہ واقعہ نہ ہو جو تاتاری ظالموں

کے ساتھ ہوا جنھوں نے پچاس برس کے اندر اسلام قبول کر لیا۔ حتی کہ چالیس ہزار سال تک قیامت کی آمد بھی رکی رہے۔ وغیرہ۔

اس طویل مدت کے دوران اگر کوئی بھی ناموافق صورت حال پیش آجائے تو مذکورہ عمل کی تکمیل کی مدت دگنا یا اس سے بھی زیادہ ہو جائے گی۔ کیا کوئی شخص بقید ہوش و حواس اس قسم کے ایک عمل پر یقین کر سکتا ہے۔ کیا تاریخ میں کسی بھی ایسے انسانی ظلم کی مثال موجود ہے جو چالیس ہزار سال تو درکنار، چار سو سال بھی مسلسل جاری رہا ہو۔ پھر اس قسم کے بے بنیاد مفروضہ سے اندیشہ کرنے کی کیا ضرورت۔

"دوسرا اسپین" نحوی اعتبار سے صحیح مگر حقیقت کے اعتبار سے سراسر غلط ہے۔ بہت سے فیصلہ کن پہلو ہیں جنھوں نے موجودہ زمانہ کو قدیم زمانہ سے بالکل مختلف بنا دیا ہے۔ وہ مذہبی تشدد کا زمانہ تھا، آج مذہبی رواداری کا زمانہ ہے۔ وہ بادشاہت کا دور تھا، اب جمہوریت کا دور ہے۔ وہ واقعہ پریس کے دور سے پہلے پیش آیا۔ اب پریس اور ریڈیو کے دور نے صورت حال کو یکسر بدل دیا ہے۔ اُس وقت کوئی "اقوام متحدہ" نہ تھا، آج اقوام متحدہ کی صورت میں انسانی حقوق کے تحفظ کا بین اقوامی ادارہ موجود ہے جس کا خود ہندستان بھی ایک رکن ہے اور جس کے چارٹر پر اس نے بھی دستخط کئے ہیں۔ وغیرہ، وغیرہ

مزید یہ کہ اس قسم کے بھیانک واقعات کبھی بھی تاریخ میں دوسری بار دہرائے نہیں جاتے۔ اس قسم کا وحشیانہ واقعہ جب ایک بار پیش آکر مشہور عام ہو جائے تو پورا عالمی ضمیر اس کے خلاف متحرک ہو جاتا ہے۔ اس طرح ایسے کسی واقعہ کا ایک بار پیش آنا بذات خود اس کے لئے مانع بن جاتا ہے کہ وہ دوبارہ پیش آئے۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ امریکہ نے جاپان میں ۱۹۴۵ میں دو ایٹم بم گرائے۔ مگر اس کے بعد ویٹ نام کی جنگ پیش آئی تو ایٹم بم رکھتے ہوئے بھی وہ ان کو استعمال نہ کر سکا۔ امریکہ کے لئے یہ جنگ قومی ساکھ کی جنگ تھی۔ اس نے اس بارہ سالہ جنگ میں اپنی تمام طاقت لگا دی۔ حتی کہ امریکہ کی تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا کہ ایک جنگ میں اس کے ۵۸۰۰۰ فوجی ہلاک ہو گئے۔ اس کے باوجود امریکہ کے لئے یہ ممکن نہ ہو سکا کہ وہ اس جنگ کا فیصلہ اپنے حق میں کرنے کے لئے ایٹم بم استعمال

کرے۔ آخر کار امریکہ جنوری ۱۹۷۳ میں یک طرفہ پر اس جنگ سے علیٰحدہ ہوگیا۔ بالفاظ دیگر، امریکہ نے ویت نام میں پسپائی اختیار کرلی مگر وہ دوسری بار ایٹم بم گرانے کی ہمت نہ کرسکا۔

جو لوگ دوسرے اسپین کی باتیں کرتے ہیں وہ صرف یہ ثابت کر رہے ہیں کہ وہ بولنا نہیں جانتے۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے حدیث میں ارشاد ہوا ہے: من کان یومن باللہ والیوم الآخر فلیقل خیرا او لیصمت (جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہئے کہ خیر کی بات بولے ورنہ خاموش رہے)

خلاصۂ کلام

جو لوگ "دوسرے اسپین" کی بات کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ ہندو نازی پچھلے پچاس سال سے خاتمۂ نسل کے اس منصوبہ کو زیر عمل لانے میں مصروف ہیں۔ مگر خود ہی واقعہ اس خطرے کو بے اصل ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ خاتمۂ نسل کی اس منظم کوشش کے باوجود پچھلے پچاس سال کے اندر اس ملک میں مسلمانوں کی تعداد دگنی سے بھی زیادہ ہوگئی ہے۔

عقل کہتی ہے کہ تاریخ کے بارہ میں پیشگی اندازے اکثر غلط ثابت ہوتے ہیں۔ اسلام بتاتا ہے کہ اس دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے، فیصلۂ خداوندی کے تحت ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں عقل اور دین دونوں کا تقاضا ہے کہ اگر کوئی خطرہ فی الواقع عملاً پیش آجائے تو اس سے بچنے کی تدبیر ضرور کرنا چاہئے۔ مگر جو خطرہ پیش نہیں آیا، جو ابھی مستقبل کے مفروضہ خطرہ کی حیثیت رکھتا ہے، اس کی بابت سوچ کر غیر ضروری طور پر اپنے آپ کو پریشان نہ کیا جائے۔

دوسرے اسپین کا معاملہ تو اس سے بھی آگے کا ہے۔ اب تک کے تمام عقلی اور تاریخی اندازوں کے مطابق وہ سرے سے وقوع میں آنے والا ہی نہیں۔ پھر ایسے بے بنیاد خطرہ کا اندیشہ کرنے کی کیا ضرورت۔

ہندستان کدھر

۳۰ اکتوبر ۱۹۹۰ کو ایک ایسا دھماکہ خیز واقعہ ہوا جو غالباً ہندستان کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا۔ وہ شہر جس کا نام ہندو بزرگوں نے ایودھیا رکھا تھا، یعنی وہ مقام جہاں تشدد نہ ہو۔ وہاں ہندو انتہا پسندوں کی ایک بھیڑ خلاف قانون طور پر جمع ہوئی۔ اس نے تشدد کا مظاہرہ کرتے ہوئے بابری مسجد کے اطراف کی پختہ چہار دیواری کو توڑ دیا۔ مسجد کے ایک گنبد کو نقصان پہنچایا پھر وہ اس کے اوپر چڑھ گئے اور اس کے تینوں گنبدوں پر اپنا بھگوا جھنڈا لہرا دیا۔ اس لاقانونیت کو روکنے کے لئے پولیس نے گولی چلائی جس میں ۲۵ سے زیادہ آدمی ہلاک ہو گئے۔

ایودھیا میں مجنونانہ تشدد کا یہ مظاہرہ اس وقت کیا گیا جب کہ بابری مسجد۔ رام جنم بھومی کا قضیہ ملکی عدالت میں زیر سماعت ہے۔ اس بنا پر حکومت نے اور ملک کے تمام منصف مزاج لوگوں نے بار بار یہ اپیل کی تھی کہ ہندو انتہا پسند عدالت کا احترام کرتے ہوئے اس کے فیصلہ کا انتظار کریں۔ عدالتی فیصلہ آنے سے پہلے بطور خود کوئی کارروائی نہ کریں۔ مگر تمام اپیلوں کو نظر انداز کر کے وہ اپنے گھروں سے نکلے تاکہ ایودھیا میں داخل ہو کر یودھ کریں اور پھر پورے ملک میں نفرت اور تشدد کی لہر پھیلا دیں۔ (۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو بابری مسجد مکمل طور پر ڈھا دی گئی)

یہ واقعہ ہندستان کی رواداری کے اس تصور کے سراسر خلاف ہے جو ہزاروں سال سے اس ملک میں چلی آ رہی ہے اور جس کو اب تک ہندستان کا پر فخر سرمایہ سمجھا جا رہا تھا۔ یوپی اور مرکزی حکومت نے چالیس کروڑ روپیہ کے خرچ سے اس کا انتظام کیا تھا کہ وہ رواداری کی اس قدیم روایت کو بچا سکیں۔ مگر مجنونانہ سیلاب کے آگے قانون اور ایڈمنسٹریشن کے بند بھی ٹوٹ گئے۔ کارسیوکوں نے اپنی حد تک تخریب کاری میں کمی نہیں دکھائی۔ اس واقعہ کی رپورٹ کافی تفصیل کے ساتھ اخباروں میں آ چکی ہے۔

ٹائمس آف انڈیا (۳۱ اکتوبر) نے بالکل درست طور پر لکھا ہے کہ ہندو فرقہ کی زیادہ بڑی تعداد کبھی اس سے اتفاق نہیں کرے گی۔ بلکہ ہندوؤں کی نہایت عظیم اکثریت کے لئے یہ واقعہ سخت پریشانی حتی کہ شرم کا باعث ہوگا:

Their "achievement", such as it is, will generate feelings of acute embarrassment, not to speak of shame, among an overwhelming majority of Hindus.

نئی دہلی کے دوسرے انگریزی اخبار ہندستان ٹائمس (یکم نومبر ۹۹۰) نے اس معاملہ کو ایک کارٹون میں کامیاب طور پر دکھایا ہے جو اس کے صفحہ اول پر چھپا ہے۔ اس کارٹون میں کھیل کا ایک میدان دکھایا گیا ہے۔ اس میدان میں ایک طرف ہندستان کے سابق وزیر اعظم وی پی سنگھ کھڑے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف بھارتیہ جنتا پارٹی کے صدر ایل کے اڈوانی پرجوش طور پر کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دونوں اپنا ہاتھ اوپر اٹھا کر اپنی دو انگلیوں سے وکٹری (V) کا نشان بنائے ہوئے ہیں۔ ان کے سامنے ایک دبلا کمزور آدمی نہایت خستہ حالت میں زمین پر گرا ہوا نظر آتا ہے۔ اس ہاری ہوئی لاش کے اوپر لکھا ہوا ہے : انڈیا۔

موجودہ ہندستانی لیڈر جس سیاسی پالیسی پر چل رہے ہیں، یہ کارٹون اس کی نہایت صحیح تصویر ہے۔ یہ لوگ ملک کی بربادی کی قیمت پر اپنی سیاسی تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ وہ نفرت اور تعصب اور تشدد کو جگا کر اس کے ذریعہ سے ملک کے اقتدار پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ اکتوبر ۱۹۹۰ کے آخر میں جو حالات
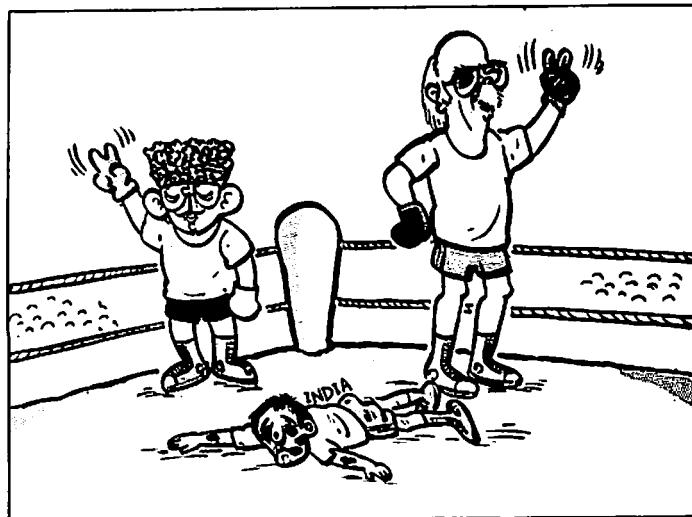
لیڈر کی جیت ملک کی ہار

سامنے آئے ہیں، وہ بتاتے ہیں کہ یہ لیڈر اپنی پالیسی میں کامیاب ہیں۔ ان کی تباہ کن پالیسی نے اگرچہ ملک اور قوم کو بربادی کے آخری کنارے پر پہنچا دیا ہے، تاہم یہ لیڈر خود اس قابل ضرور ہو گئے ہیں کہ وہ، کم از کم وقتی طور پر، اپنی سیاسی فتح کی خوشی کا جشن منا سکیں۔

پچھلے چند سالوں میں ہندستان میں مذہب کے نام پر سیاست کا جو تخریبی کھیل کھیلا گیا ہے، اس میں لیڈر لوگ جیت گئے مگر ملک ہار گیا۔ لیڈروں نے اپنا شاندار قلعہ ضرور کھڑا کر لیا ہے مگر ان کا یہ سیاسی قلعہ صرف ملک کے کھنڈر پر بن کر کھڑا ہوا ہے۔

ہندستان کا ضمیر اس المناک حادثہ پر چیخ اٹھا ہے۔ بجا طور پر لوگ محسوس کر رہے ہیں کہ یہ متشددانہ حملہ " بابری مسجد " پر نہ تھا بلکہ خود ہندو دھرم کی اپنی مقدس روایات پر تھا۔ چنانچہ ملک کے بے شمار لوگوں نے تقریر اور تحریر کے ذریعہ اس کی مذمت کی اور اس کے بارہ میں اپنے درد و کرب کا اظہار کیا۔ ہندوؤں کی کم از کم ۸۵ فی صد تعداد نے اس کو برا بتایا۔

نئی دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمس آف انڈیا (۳۱ اکتوبر ۱۹۹۰) نے اپنے صفحہ اول پر ایک ایڈیٹوریل شائع کیا ہے۔ اس غیر معمولی اڈیٹوریل بعنوان مضطرب ہندستان (Anguished India) میں اس نے لکھا ہے کہ:

> The BJP and the VHP clearly failed to realise that whipping up atavistic passions for political gain would give them at best a pyrrhic victory (p.1).

بھارتیہ جنتا پارٹی اور وشو ہندو پریشد واضح طور پر یہ سمجھنے میں ناکام رہے ہیں کہ سیاسی مقصد کے لئے پشتینی جذبات کو بھڑکا کر وہ زیادہ سے زیادہ جو چیز پائیں گے وہ ان کے لئے صرف ایک تباہ و برباد فتح ہوگی۔

تلخ حقیقت

ہندوؤں کے انتہاپسند لیڈر کیا کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مغل دور میں ہمارے اوپر ظلم کیا گیا ہے۔ اب ہم اس کا انتقام لیں گے۔ اس سے قطع نظر کہ ظلم کا دعویٰ صحیح ہے یا غلط۔ سوال یہ ہے کہ اگر مغل حکمرانوں نے ظلم کیا تو ان کو اپنے "ظلم" سے کیا ملا۔ اس کا نتیجہ جو ان کے حصہ میں آیا وہ صرف یہ تھا کہ ان کی

حکومت کمزور ہوگئی۔ اور آخر کار ۱۸۵۷ میں وہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی۔

اسی طرح ہندوؤں کے انتہا پسند لیڈر کہتے ہیں کہ انگریزوں نے ہمارے اوپر ظلم کیا۔ اس سے قطع نظر کہ ظلم کا دعویٰ صحیح ہے یا غلط۔ دوبارہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انگریزوں کو اپنے "ظلم" سے کیا ملا۔ ان کے حصہ میں صرف یہ آیا کہ ملک کے اندر ان کے اقتدار کی جڑیں اکھڑ گئیں۔ اور ۱۹۴۷ میں آخری طور پر ان کا اقتدار ختم ہوگیا۔

ہندوؤں کے انتہا پسند لیڈر کہتے ہیں کہ ملک کی آزادی کے بعد کانگرس پارٹی کی جو حکومت بنی، اس کی پالیسی اقلیت کو خوش کرنے (appeasement) کی تھی۔ چنانچہ وہ مسلسل ہندوؤں کے اوپر ظلم کرتی رہی۔ اس سے قطع نظر کہ ظلم کا یہ دعویٰ صحیح ہے یا غلط۔ سوال یہ ہے کہ کانگریس کو اس "ظلم" سے کیا ملا۔ اس کو صرف یہ ملا کہ وہ کمزور ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ ۱۹۸۸ کے الکشن نے اس کے حق میں اقتدار سے بے دخلی کا فیصلہ کر دیا۔

ہندوؤں کے انتہا پسند لیڈروں نے دوبارہ ظلم کا طریقہ اختیار کیا ہے، وہ بھی اپنے پیش روؤں کی طرح ظلم کے راستہ پر چل رہے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ انتہا پسند لیڈر اپنے لئے کیا پسند کر رہے ہیں۔ کیا وہ دوبارہ اسی تباہی کی سیٹ پر بیٹھنا چاہتے ہیں جس کو ان کے کہنے کے مطابق، مغلوں اور انگریزوں اور کانگریسیوں نے خالی کیا ہے۔ اگر انھوں نے اپنے لئے اسی راستہ کا انتخاب کیا ہے تو کیا انھیں معلوم نہیں کہ قدرت کا قانون سب کے لئے یکساں ہے۔ وہ ایک گروہ اور دوسرے گروہ کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتا۔ جس ظلم نے پچھلے حکمرانوں کو پیچھے دھکیل دیا، وہی ظلم نئے حکمرانوں کے ساتھ کیا اس کے سوا کوئی اور سلوک کرے گا جو وہ پچھلے حکمرانوں کے ساتھ کرتا رہا ہے۔ پھر یہ انتہا پسند لوگ اپنے لئے کس انجام کا انتظار کر رہے ہیں۔

ہندوؤں کے انتہا پسند لیڈروں کو ممکن ہے کہ اپنی منفی سیاست کا یہ سیاسی فائدہ ملے کہ وہ ووٹروں کی ایک تعداد کی نظر میں ان کے قومی ہیرو بن جائیں۔ اس طرح ممکن ہے کہ وہ اگلا کوئی الکشن جیت لیں اور حکومت کی کرسیوں پر اپنے آپ کو پہنچانے میں کامیاب ہو جائیں مگر جتنا امکان اس بات کا ہے، اس سے زیادہ امکان اس کا ہے کہ ان کی موجودہ مفسدانہ کارروائیوں کی بنا پر قدرت کا قانون ان کے خلاف حرکت میں آجائے۔ اس کے بعد وہ ظالموں کے خانہ میں لکھ دئے جائیں۔

اور آخر کار ذلت کے ساتھ انھیں اقتدار کی کرسیوں سے ہٹا دیا جائے جس طرح پچھلے لوگ ہٹا دئے گئے۔

موجودہ دنیا آزمائش کی دنیا ہے۔ یہاں ہر ایک کو عمل کا موقع دیا جاتا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ قدرت کا قانون یہ بھی ہے کہ جب ایک گروہ سماج کے اندر فساد اور بگاڑ پیدا کرنے لگے تو اس کو ہٹا کر دوسرے گروہ کو اس کی جگہ پر لایا جائے۔ تبدیلیٔ قیادت کا یہ قانون ساری انسانی تاریخ میں برابر جاری رہا ہے۔ اور بلاشبہ ہندستان قدرت کے اس عمومی قانون سے مستثنیٰ نہیں۔

وقار کی لڑائی

۱۹۴۷ سے پہلے ہندستان میں انگریزوں کی حکومت تھی۔ یہ ہندستان کے وقار کے خلاف تھا کہ باہر کی ایک قوم آکر یہاں حکومت کرے۔ چنانچہ اس کے خلاف آزادی کی تحریک شروع ہوئی۔ زبردست قربانیوں کے بعد ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو ہندستان آزاد ہوگیا۔

اب یہ ہونا چاہئے تھا کہ ہندستان کے لوگ ایک ہو کر ملک کو ترقی دینے میں لگ جاتے۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آزادی ملک کے بٹوارہ کے روپ میں آئی۔ ملک کے لوگ دو بڑے فرقوں کی صورت میں بٹ گئے۔ ایک نے مطالبہ کیا کہ "تقسیم ہند" دوسرے نے اس کو رد کرتے ہوئے کہا کہ "اتحادِ ہند" اس حریفانہ سیاست کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد بھی وقار کا مسئلہ ملک سے ختم نہیں ہوا۔ اس کے بعد بھی وہ "ہندو وقار" اور "مسلم وقار" کی صورت میں بدستور باقی رہا۔

۱۹۴۷ سے مسلسل یہ صورت حال جاری ہے کہ جب بھی کوئی نزاعی معاملہ پیدا ہوتا ہے تو موجودہ نفسیات کی بنا پر وہ فوراً دونوں فرقوں کے لئے وقار کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ مثلاً ہندوؤں کا ایک جلوس نعرہ لگاتا ہوا مسلم محلہ سے گزرتا ہے۔ اب وہاں کے مسلمان فوراً یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان کا ملی وقار مجروح ہو رہا ہے۔ وہ مانگ کرتے ہیں کہ جلوس کی روٹ کو بدلا جائے۔ اس کے بعد ہندو وقار جاگ اٹھتا ہے۔ ہندو سمجھتا ہے کہ اگر میں نے اپنے جلوس کا راستہ بدلا تو میرا قومی وقار ختم ہو جائے گا۔ اب دونوں طرف سے ضد بڑھتی ہے۔ دونوں اس منفی نفسیات میں مبتلا ہو جاتے ہیں جس کو قرآن میں حمیت جاہلیہ کہا گیا ہے (الفتح ۲۶)

یہی صورت بابری مسجد ۔ رام جنم بھومی کے قضیہ میں پیش آئی۔ ۱۹۸۶ کے بعد جب یہ نزاع

بڑھی تو مسلمانوں نے کہا کہ ہمارے لئے یہ صرف ایک مسجد کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ ملت کی موت وحیات کا مسئلہ ہے۔ اس لئے ہم اس معاملے میں کسی قیمت پر پیچھے ہٹنے والے نہیں۔ ہندؤوں نے کہا کہ یہ ہمارے لئے صرف ایک مندر کا مسئلہ نہیں بلکہ یہ ہمارے لئے دوسری شکست (second defeat) کا مسئلہ ہے۔ ۱۹۴۷ میں ہم نے بٹوارہ کو مان کر پہلی بار شکست قبول کرلی تھی۔ اب ہماری حکومت ہے۔ اب ہم دوسری بار شکست کو قبول نہیں کریں گے۔ اس طرح ایک سادہ سا مسئلہ دو فرقوں کے لئے وقار کا مسئلہ بن گیا۔ اور جب کوئی مسئلہ وقار کا مسئلہ بن جائے تو اس کی پیچیدگی ہزاروں گنا زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

وقار کی یہ لڑائی پچھلے پچاس سال سے جاری ہے اور اس نے ہندستان کی ترقی کے سفر کو ایک بندگلی (impasse) کے سامنے لاکھڑا کردیا ہے۔ جب تک وقار کا جھگڑا ختم نہ ہو، ملک کی ترقی کا سفر دوبارہ جاری ہونے والا نہیں۔

تاریخ کا تجربہ ہے کہ اس طرح کا مسئلہ کبھی دوطرفہ بنیاد (bilateral basis) پر ختم نہیں ہوتا۔ اس قسم کا پیچیدہ مسئلہ جب بھی ختم ہوتا ہے، وہ یک طرفہ بنیاد (unilateral basis) پر ختم ہوتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ یک طرفہ اقدام کون کرے۔

حالات کا بے لاگ تجزیہ بتاتا ہے کہ ہندو، کم از کم موجودہ حالات میں، اس یک طرفہ اقدام کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوسکتا۔ ہندو نفسیات کی پیچیدگی یہ ہے کہ ابھی تک وہ "فرسٹ ڈیفیٹ" کا صدمہ لئے ہوئے ہے۔ اور اب چوں کہ ملکی نظام میں اس کو بالادستی (upper hand) حاصل ہے، اس لئے وہ کسی بھی حال میں اس چیز کو قبول کرنے پر راضی نہیں جس کو وہ اپنی موجودہ نفسیات کے تحت اپنے لئے سکنڈ ڈیفیٹ کا مسئلہ سمجھتا ہے۔

ذہنی انتشار

آج ملک کے تمام ذہن اس معاملہ میں سخت سراسیمہ ہیں۔ وہ محسوس کررہے ہیں کہ ملک بدترین تباہی کی طرف جارہا ہے۔ مگر جب وہ مسئلہ کا حل معلوم کرنا چاہتے ہیں تو عملی اعتبار سے انھیں کوئی بھی ممکن حل نظر نہیں آتا۔ مسٹر خوشونت سنگھ نے ہندستان ٹائمس (۳ نومبر ۱۹۹۰) میں قوم کی موجودہ حالت (state of the nation) پر ایک نوٹ شائع کیا ہے۔ اس میں وہ ملک کے موجودہ حالات اور اس پر اپنی گہری تشویش کا ذکر کرتے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں کہ مجھے افسوس ہے کہ میں قارئین کو

مایوس کر رہا ہوں جو مجھ سے کوئی مثبت تجویز سننے کے امیدوار ہوں گے۔ مستقبل کے بارہ میں میرا ذہن بھی اتنا ہی منتشر ہے جتنا کسی دوسرے شخص کا:

I am sorry to disappoint readers who expect some positive suggestions from me. I am as confused about the future as everyone else.

حل کیا ہے

اس معاملہ میں سوچنے کا ایک طریقہ خالص فرقہ وارانہ ہے۔ یعنی ہندو مسلمانوں کو قصوروار ٹھہرائیں اور مسلمان ہندوؤں کا قصور ثابت کریں۔ یہ طریقہ صرف متعصبانہ ذہنوں کو اپیل کر سکتا ہے، عام انسان اس کو کوئی اہمیت نہیں دے سکتا۔

دوسرا طریقہ وہ ہے جس کو "منطقی انصاف" کہا جا سکتا ہے۔ یعنی معاملہ کو بالکل منطقی انداز میں دیکھ کر یہ طے کرنا کہ کس کی کتنی غلطی ہے اور کون کتنا قصوروار ہے۔ تمام سنجیدہ لوگ اسی انداز میں لکھ اور بول رہے ہیں۔ مثال کے طور پر مسٹر موہن چراغی نے لکھا ہے:

"میری طرح کروروں ہندو اپنے ہم مذہب جنونی لوگوں کے دیوانہ پن سے گردن جھکانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ کیا اتنے بڑے ملک میں جہاں لاکھوں مندر اور تیرتھ استھان ہیں، ایک اور مندر نہ بننے سے ہندو دھرم کا ناش ہو جاتا۔ قصور صرف ہندو فرقہ پرستوں کا نہیں ہے، مجرم وہ مسلمان لیڈر بھی ہیں جنھوں نے مسلمانوں کی غربت، افلاس، بیکاری اور مایوسی کا فائدہ اٹھا کر اپنے مفادات کے لئے بابری مسجد کو ہندستان میں اسلام کی علامت قرار دے کر ہندو فرقہ پرستی کو پنپنے کا موقع دیا۔ کبھی یوم جمہوریہ کا بائیکاٹ کرنے کی اپیل کر کے، کبھی لانگ مارچ کا نعرہ بلند کر کے اور کبھی آدم فورج بنانے کا اعلان کر کے، وشو ہندو پریشد کے زندہ رہنے کا سامان کیا۔ مجرم تو وہ سیاست داں اور حاکم بھی ہیں جو رام جنم بھومی۔ بابری مسجد کے ڈھانچہ پر سیاسی محل کھڑے کرتے رہے ہیں اور کر رہے ہیں" (قومی آواز ۲ نومبر ۱۹۹۰)

خالص منطقی اعتبار سے یہ بات صدفی صد درست ہے۔ مگر اپنی ساری درستگی کے باوجود یہ اصل مسئلہ کا حل نہیں۔ پیچیدہ اجتماعی مسائل میں اس قسم کا منطقی انصاف کبھی واقعہ نہیں بنتا۔ یہ انداز نظری اعتبار سے جتنا صحیح ہے، عملی اعتبار سے وہ اتنا ہی غیر مفید ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے پیچیدہ جھگڑوں کا عملی حل صرف یہ ہے کہ کوئی ایک فریق تنہا رسک لینے پر آمادہ ہو جائے، وہ تنہا ذمہ داری کو قبول کرتے ہوئے معاملہ کو یک طرفہ طور پر ختم کر دے۔

جب دو طرفہ بنیاد پر مسئلہ کو حل نہ کیا جاسکتا ہو تو اس کے بعد مسئلہ کو حل کرنے کی ایک ہی قابل عمل صورت ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ اس کو یک طرفہ بنیاد پر حل کیا جائے۔ ایسی حالت میں میں اپنے مسلمان بھائیوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ اس قربانی کے لئے اپنے آپ کو تیار کریں۔ وہ ملک کی ترقی کے لئے اور نتیجۃً خود اپنی ترقی کے لئے، یہ قربانی دیں کہ وہ یک طرفہ طور پر اپنے اندر سے وقار کی مذکورہ نفسیات کو ختم کر دیں۔ قرآن کے الفاظ میں وہ، کلمۂ جاہلیت کے مقابلہ میں کلمۂ تقویٰ کا ثبوت دیں (الفتح ۲۶) موجودہ حالات میں اس مسئلہ کا یہی واحد ممکن حل ہے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جب بھی کوئی نزاع پیدا ہو تو مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اس کو یا تو نظر انداز کر دیں یا اسی محدود دائرہ میں رکھ کر اس کو حل کرنے کی کوشش کریں جس محدود دائرہ میں وہ مسئلہ ابتداءً پیدا ہوا تھا۔ مسلمان کسی بھی حال میں ہرگز ایسا نہ کریں کہ اس کو پوری ملت کے وقار کا سوال بنا دیں۔ یہ طریقہ مسلمانوں کے لئے یک طرفہ قربانی کے ہم معنی ہوگا۔ مگر جس دن مسلمانوں نے یہ قربانی دے دی، اسی دن ملک میں ترقی کا نیا سفر شروع ہو جائے گا۔ اور جو سفر شروع ہو جائے وہ آخر کار اپنی منزل پر پہنچ کر رہتا ہے۔

نزاعی مسئلہ کے حل کا یہی وہ یک طرفہ طریقہ ہے جس کا مظاہرہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ (۶۲۸ء) کے موقع پر کیا تھا۔ اس اصول کو ایک لفظ میں ——— حدیبیہ اصول (Hudaibiya principle) کہا جاسکتا ہے۔ اس نازک موقع پر اگر مسلمان اس اصول کا مظاہرہ کریں تو وہ نہ صرف ملک کو رہنمائی دیں گے، نہ صرف اپنا ملی مسئلہ حل کریں گے بلکہ وہ دنیا کے سامنے اسلام کے ایک قیمتی اصول کی شہادت دیں گے۔ اور بلاشبہ اسلام کی شہادت سے زیادہ بڑا عمل اس دنیا میں اور کوئی نہیں۔

دوطرفہ مشکل

دین دیال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (نئی دہلی) کے تحت ۱۵ اگست ۱۹۹۰ کو ایک سمپوزیم ہوا۔ اس میں اعلیٰ ہندو دانشوروں نے حصہ لیا۔ اس کی مکمل کارروائی انسٹی ٹیوٹ کے منتقلی جرنل منتھن (Manthan) کے شمارہ ستمبر ۱۹۹۰ میں چھپی ہے۔

سمپوزیم کے ایک مقرر ٹائمس آف انڈیا کے سابق ایڈیٹر شری گری لال جین تھے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ عام تصور کے خلاف، ملک کے سامنے بنیادی مسئلہ، جیسا کہ میرا خیال ہے، ہندو مسلم مسئلہ نہیں ہے اور نہ کبھی تھا۔ بنیادی مسئلہ دراصل ہندو ہندو مسئلہ ہے۔ یہی پہلے بھی تھا، اور یہی مستقبل بعید تک باقی رہے گا۔ ہندو سماج، جیسا کہ سب کو معلوم ہے، نہایت گہرائی کے ساتھ ذات کی بنیاد پر بٹا ہوا ہے۔ آزادی کے بعد سے ملک کے بااختیار طبقہ کی ہر کوشش جو اس کی اصلاح کے لئے کی گئی اس نے صرف اس کش مکش میں اضافہ کیا۔

اس کا آخری مرحلہ یہ ہے کہ ہم وشوناتھ پرتاپ سنگھ کی عظیم قیادت کے تحت ملک میں خانہ جنگی کے حالات دیکھ رہے ہیں۔ ہندستان کی آزادی خونی حالات میں آئی۔ آزادی بار بار خون میں نہلائی گئی ہے۔ میں یہ اندوہناک احساس رکھتا ہوں کہ جو کچھ ہم نے ماضی میں دیکھا ہے

Contrary to the popular perception, the central issue before the country, as I see it, is not, and has not been, the Hindu-Muslim problem. The central issue has been, and is going to remain for the foreseeable future, the Hindu-Hindu problem. The Hindu society, it is a commonplace, is deeply fragmented along caste lines, and since independence every 'care' has been taken by many of those in charge of the country's affairs to see to it that those conflicts get aggravated. Finally, under the 'great' leadership of Vishwanath Pratap Singh, we face conditions of near civil war.

I view the future of India — I am sorry to say on Independence Day with deep misgivings. Independence itself, you will recall, was born in bloodshed. Independence has since then been bathed in blood again and again. I have the terrible feeling that what we have seen in the past will pale into insignificance in comparsion with what awaits us in the future. I do not believe that anything like sensible political order is likely to emerge in this country in the near future, or indeed forseeable future. The Muslim problem is only one expression of this failure of the Hindus to create and sustain a political order which conforms to their genius and needs.

وہ اس کے مقابلہ میں بہت ہلکا ہے جو مستقبل میں ہمارا انتظار کر رہا ہے۔ میرا یقین نہیں کہ ملک میں آئندہ کوئی ایسی چیز ظاہر ہونے والی ہے جس کو معقول سیاسی نظام کہا جاسکے۔ مسلم مسئلہ ہندوؤں کی اس ناکامی کا صرف ایک اظہار ہے کہ وہ ملک میں ایسا سیاسی نظام قائم نہ کرسکے جو ان کی اہلیت اور ملکی ضرورتوں کے مطابق ہو (صفحہ ۲۶ - ۲۷)

مسٹر گری لال جین نے جو بات یہاں کہی وہ بے حد قابل غور ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندو سماج کی بنیاد چار ورن (caste system) پر ہے۔ کاسٹ سسٹم ہندو ازم کا لازمی جزء ہے۔ ہندو ازم کی نفی کی قیمت پر ہی تقسیم انسانیت کے اس اصول کو چھوڑا جاسکتا ہے۔ ہندو ازم کو مانتے ہوئے اس اصول کا انکار ممکن نہیں۔ کیوں کہ یہ اصول ہندو ازم کی مقدس کتابوں میں واضح طور پر درج ہے۔ مثال کے طور پر رگ وید میں سماج کو چار درجوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اور اس کی وجہ ان کا نیچا اور اونچا ہونا ہے۔ اس کے مطابق برہمن، کشتری، ویش اور شودر، بالترتیب خدا کے منھ، بازو، ران اور پاؤں سے پیدا ہوئے ہیں۔

برہمن کا کام مذہبی رسوم ادا کرنا ہے، کشتری کا کام فوجی ذمہ داریوں کو سنبھالنا ہے۔ ویش کا کام زراعت کرنا اور شودر کا کام خدمت کرنا ہے۔ (EB-X/361)

ہندو سماج میں یہ تصور کتنی گہرائی کے ساتھ جما ہوا ہے، اس کا ایک مظاہرہ ۱۹۹۰ میں منڈل کمیشن کے خلاف تحریک کی صورت میں ہوا۔ یہ تحریک اتنی شدید تھی کہ تقریباً ۱۰۰ ہندو نوجوانوں نے خود سوزی کا انتہائی اقدام کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ منڈل کمیشن نے پست طبقہ کے لوگوں کے لئے سرکاری ملازمتوں میں ۲۷ فیصد رزرویشن دے دیا تھا۔ اوپر کا ہندو طبقہ اس کو دیکھ نہیں سکتا تھا کہ پست طبقہ کے افراد اس طرح سرکاری سروسوں میں ان کے برابر پہنچ جائیں۔ اونچے طبقہ کے ہندو نوجوانوں نے اس کے خلاف اتنی زبردست تحریک چلائی کہ سابق وزیراعظم وی پی سنگھ کی حکومت ہل گئی۔ یہاں تک کہ ۷ نومبر ۱۹۹۰ کو مسٹر سنگھ نے اپنے عہدہ سے استعفا دے دیا جس نے منڈل کمیشن کی تجاویز کو رائج کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

کاسٹ سسٹم ہندو قوم کے اتحاد میں ایک ابدی رکاوٹ ہے۔ اس سسٹم کے ہوتے ہوئے ہندو قوم کبھی متحد نہیں ہوسکتی۔ اور جہاں اتحاد نہ ہو وہاں طاقت کا وجود بھی نہیں۔

پھر ہندو قوم میں اتحاد لانے کا طریقہ کیا ہو۔ صف اول کے ایک ہندو جرنلسٹ (گری لال جین) نے اس پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہندو قوم کے پاس متحد ہونے کی کوئی مثبت بنیاد موجود نہیں ۔ وہ صرف منفی جذبہ کی بنیاد پر متحد ہو سکتی ہے۔ اور یہ منفی جذبہ موجودہ حالات میں صرف مسلم دشمنی ہے۔ موصوف نے لکھا ہے کہ ہم اینٹی مسلم احساس کو بھڑکا کر ہی ہندوؤں کو متحد کر سکتے ہیں۔ مگر منفی بنیاد پر پیدا کیا جانے والا اتحاد کبھی مثبت فائدہ کا سبب نہیں ہو سکتا۔ اس طرح کا اتحاد تخریبی نتیجہ دکھا سکتا ہے مگر وہ تعمیری کارنامہ انجام نہیں دے سکتا۔

مسٹر گری لال جین نے ہندو سماج کی اس مشکل کا ذکر (ٹائمس آف انڈیا ۴ جولائی ۱۹۸۷) کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس طرح ہم دو طرفہ مشکل میں مبتلا ہیں۔ کیوں کہ جو چیز ممکن ہے وہ مطلوب نہیں اور جو چیز مطلوب ہے وہ ممکن نہیں:

Thus what is possible is not desirable,
and what is desirable is not possible.

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندو سماج کتنی زیادہ بے بسی کی حالت میں ہے۔ وہ خود اپنی بنیاد پر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اس کو کھڑا ہونے کے لئے لازمی طور پر ایک خارجی سہارا درکار ہے۔ اگر یہ خارجی سہارا موجود نہ ہو تو اس کی دیوار اپنے آپ گر پڑے گی، بغیر اس کے کہ کسی نے براہ راست طور پر اس کو گرانے کی کوشش کی ہو۔

مسلمانوں کے نادان لیڈر بابری مسجد تحریک کو حد تناسب سے باہر لے گئے۔ انھوں نے بابری مسجد کے نام پر دھواں دھار تحریک چلا کر ہندوؤں کو یہی سہارا فراہم کر دیا۔ ہندوؤں کے انتہا پسند لیڈروں نے مسلمانوں کے پرجوش قائدین کے لفظی طوفان کو بھرپور طور پر استعمال کیا۔ انھوں نے اس کے ذریعہ سے اپنی قوم میں اینٹی مسلم فیلنگ پیدا کر دی۔ وہ چیز جس کو ہندو لہر (Hindu wave) اور ہندو اتحاد کہا جاتا ہے، وہ تمام تر اسی اندھی اینٹی مسلم فیلنگ پر کھڑا ہوا ہے جس کا موقع خود ہمارے نادان لیڈروں نے ۱۹۸۶ اور ۱۹۹۱ کے درمیان اپنی سطحی کارروائیوں کے ذریعہ فراہم کیا

عبرت ناک

بھارتیہ جنتا پارٹی کے صدر مسٹر لال کرشن آڈوانی کی رتھ یاترا یکم اکتوبر ۱۹۹۰ کو سومناتھ سے شروع

ہوئی۔ اس کو دس ہزار کیلو میٹر کا سفر کرکے اجودھیا پہنچنا تھا۔ ۱۶ اکتوبر کو وہ دہلی میں داخل ہوئے۔ یہاں انھوں نے زبردست میٹنگ کی۔ اس میں انھوں نے اعلان کیا کہ ہمارا "رام رتھ" ضرور اجودھیا پہنچے گا اور ہم جنم بھومی پر رام مندر بنا کر رہیں گے۔ کوئی طاقت ہم کو اس سے روک نہیں سکتی۔

دہلی کے انگریزی اخبار اسٹیٹسمین (۱۸ اکتوبر ۱۹۹۰) میں اس میٹنگ کی پوری تفصیل چھپی ہے۔ مسٹر آڈوانی نے جو کچھ کہا، اس میں سے ایک بات یہ تھی کہ بھارتیہ جنتا پارٹی نے وشو ہندو پریشد کے ساتھ اپنا وزن صرف اس وقت ڈالا جب کہ ۱۹۸۶ میں بابری مسجد ایکشن کمیٹی بنائی گئی اور اس کمیٹی نے اس مسئلہ کو ایک عوامی مسئلہ بنا دیا:

BJP had thrown its weight behind the Vishwa Hindu Parisnad only when the Babri Masjid Action Committee had been formed in 1986 and made it a public issue. (p.9)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ بابری مسجد کے نام پر آل انڈیا سطح کی ایکشن کمیٹی بنانا اور اس مسئلہ کو عوامی مسئلہ کی حیثیت سے چاروں طرف پھیلانا، یہ اصل مسئلہ کے حل میں صرف ایک رکاوٹ تھا۔ کیوں کہ اس نے ہندوؤں میں جوابی تحریک پیدا کی اور ہندو زیادہ بڑی تعداد میں رام جنم بھومی کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس تحریک نے مسلمانوں کو تو کچھ نہیں دیا۔ البتہ اس نے ہندو قوم کے لئے اتحاد کی بنیاد فراہم کر دی۔

یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ نفرت دو طرفہ بنیاد پر پیدا ہوتی ہے۔ یہ تالی ہمیشہ دو ہاتھ سے بجتی ہے۔ فریقین میں سے ایک شخص اگر اپنا ہاتھ ہٹا لے تو تالی کا بجنا اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔ موجودہ ہندو اتحاد نفرت کی زمین پر قائم ہے، اور یہ نفرت کی زمین اس کو مسلمانوں کی طرف سے مل رہی ہے۔

موجودہ حالات میں مسلمانوں کے لئے بہترین حکمت عملی یہ ہے کہ وہ اپنے "ہاتھ" کو یک طرفہ طور پر سامنے سے ہٹا دیں۔ اس کے بعد تالی کا بجنا اپنے آپ بند ہو جائے گا۔ اس کے بعد نفرت کے غبارہ کی ہوا خود بخود نکل جائے گی، اور پھر جو فضا بنے گی وہ عین اسلام اور مسلمانوں کے حق میں ہوگی۔

نادان دوست

نئی دہلی کے انگریزی ہفت روزہ آرگنائزر کے شمارہ ۲۱ اکتوبر ۱۹۹۰ میں مسٹر جے دوباشی کا مضمون شائع ہوا ہے۔ اس کا عنوان ہندو لہر (The Hindu Wave) ہے۔ دو صفحہ کے اس مضمون میں انھوں نے پر فخر طور پر لکھا ہے کہ ہندو مستقبل کی لہر ہیں، اور اڈوانی کی رتھ یاترا اس لہر کی ایک علامت ہے:

The Hindus are the wave of the future. And Advani's Rath Yatra is a symbol of that wave.

یہ بات مختلف انداز سے ان ہندو صاحبان کی طرف سے کہی جارہی ہے جو بابری مسجد کو ڈھاکر اس کی جگہ رام مندر بنانے کی پرتشدد مہم چلا رہے ہیں۔ اس عنوان پر جذباتی تقریریں کرکے انھوں نے شمالی ہند کے کچھ ہندوؤں کو اپنے ساتھ جمع کر لیا ہے۔ اس کو وہ "ہندو لہر" سے تعبیر کرتے ہیں۔

شری اڈوانی کا رتھ جس کو دس ہزار کیلومیٹر کا سفر طے کرکے سومناتھ سے اجودھیا پہنچنا تھا، وہ رام رتھ نہیں بلکہ نفرت اور تشدد کا رتھ تھا۔ اس کا مقصد منفی بنیاد پر ہندوؤں کو متحد کرنا تھا۔ اس تحریک کے پیچھے جو ذہن کام کر رہا ہے، اس کا اندازہ وشو ہندو پریشد کے جنرل سکریٹری مسٹر اشوک سنگھل کے بیانات سے ہوتا ہے۔ مثلاً انھوں نے، نومبر ۱۹۹۰ کو دہلی میں تقریر کرتے ہوئے مسلمانوں کو وارننگ دی کہ وہ اجودھیا کی بابری مسجد کو ڈھاکر وہاں رام مندر بنانے کے منصوبہ کی مخالفت نہ کریں۔ ورنہ ہم ملک کی تین ہزار مسجدوں کو ڈھاکر وہاں مندر بنانے کی تحریک شروع کر دیں گے (ٹائمس آف انڈیا ۸ نومبر ۱۹۹۰)

اس قسم کی باتیں جو بھارتیہ جنتا پارٹی، وشو ہندو پریشد اور بجرنگ دل کے لوگوں کی طرف سے کہی جارہی ہیں۔ اور اس کے نام پر عوام کی بھیڑ اکٹھا کی جارہی ہے، کیا اسی کا نام ہندو لہر ہے۔ کوئی بھی شخص جو ہندو دھرم کو جانتا ہو، وہ اگر سنجیدگی کے ساتھ غور کرے تو وہ ماننے پر مجبور ہوگا کہ یہ ہندو لہر نہیں ہے، زیادہ صحیح لفظ میں وہ اینٹی ہندو لہر ہے۔ اور برعکس طور پر اس کو ہندو لہر کہا جارہا ہے۔

ہندو دھرم کی تعلیمات میں دو چیزیں بے حد بنیادی ہیں۔ ایک رواداری، اور دوسرے عدم تشدد۔ آپ ہندو دھرم کی کسی بھی کتاب کو اٹھائیں، اس میں آپ کو یہ دونوں باتیں لکھی ہوئی ملیں گی۔ یہ ہندو دھرم کی وہ خصوصیات ہیں جن کا ذکر اس کے تمام مفکرین اور مصلحین نے پر فخر طور پر کیا ہے۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) جلد ۸ میں ہندوازم (Hinduism) کے عنوان سے نہایت مفصل اور تحقیقی مقالہ ہے۔ اس میں درج ہے کہ ہندوازم، بطور اصول، عقیدہ اور عبادت کے تمام طریقوں کا احترام کرتا ہے۔ ایک ہندو ہر مذہب کو سچائی کا اظہار سمجھتا ہے۔ ہندوازم بطور اصول کے ہر مذہب کے حق میں روادار (tolerant) ہے، خواہ وہ کوئی بھی مذہب ہو (صفحہ ۸۸۸)

دوسری بات کے سلسلہ میں برٹانیکا میں بتایا گیا ہے کہ ہندوازم کا ایک نہایت اہم اصول اہمسا ہے۔ یعنی تشدد نہ کرنا۔ اسی لئے ہندوازم سختی کے ساتھ حیوان کے ذبیحہ کو منع کرتا ہے اور سبزی خوری پر زور دیتا ہے۔ ہندو مفکرین کے مطابق، اہمسا ہندو مذہب کی ایک بے حد بنیادی قدر ہے۔ اہمسا ہندو اخلاقیات کا ایک مرکزی اصول (keystone) ہے (صفحہ ۸۸۹)

اس اعتبار سے دیکھئے تو رام جنم بھومی تحریک، اپنی موجودہ شکل میں، واضح طور پر ہندو دھرم کے خلاف ہے۔ اس میں مذہبی رواداری کو کچلا جا رہا ہے۔ اس میں نفرت کا پرچار کیا جا رہا ہے۔ اس میں تشدد کا طریقہ اختیار کیا جا رہا ہے۔ اس بنا پر یہ کہنا بالکل درست ہے کہ اس تحریک نے جو لہر پیدا کی ہے، وہ اینٹی ہندو لہر ہے نہ کہ حقیقی معنوں میں ہندو لہر۔

یہی وجہ ہے کہ ملک کے ہزاروں ہندوؤں نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا ہے۔ اور اس کو غیر ہندو تحریک بتایا ہے۔ مثال کے طور پر آنجہانی کملاپتی ترپاٹھی، ہندو دھرم کے ایک مسلّمہ عالم تھے۔ انھوں نے اپنی آخر عمر میں جون ۱۹۹۰ میں "سامپرادائک سمیا" کے نام سے ہندی میں ایک مقالہ لکھا تھا جو چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔ ہندستان ٹائمس (۲۰ اکتوبر ۱۹۹۰) میں اس کا انگریزی تعارف شائع ہوا ہے۔ اس میں بابری مسجد اور رام جنم بھومی کے مسئلہ کا بھی ذکر ہے۔ مترجم کہتے ہیں:

Lambasting the Vishwa Hindu Parishad and the Rashtriya Swayam Sevak Sangh, the elderly statesman said the very idea of demolishing a mosque was a negation of Hindu ethos. "It is a fascist idea and will break the country," he added.

وشو ہندو پریشد اور راشٹریہ سوم سیوک سنگھ کو سخت برا بتاتے ہوئے، بزرگ سیاست داں نے لکھا ہے کہ مسجد کو ڈھانے کا تصور بجائے خود ہندو خصوصیات کی نفی ہے۔ یہ فاشسٹ نظریہ ہے، یہ نظریہ ملک کو توڑ ڈالے گا۔

موجودہ لہر اگر حقیقی معنوں میں "ہندو لہر" ہوتی تو اس سے وہ نتائج نکلتے جو ہندو دھرم کے امتیازی اوصاف سمجھے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ملک سے اہنکار ختم ہوتا، کیوں کہ ہندو تعلیمات میں اہنکار کو بہت برا مانا گیا ہے۔ اس سے دوسروں کے اعتراف کا دریا امڈتا، کیوں کہ ہندو فکر کی یہ امتیازی صفت ہے کہ وہ سچائی کے تعدد کا قائل ہے، ہر اختلاف کو وہ سچائی کا نیا روپ سمجھتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں چاروں طرف رواداری کی ہوائیں چلتیں، کیوں کہ ہندو فکر یہ کہتا ہے کہ اپنے کو برحق سمجھتے ہوئے دوسرے کے برسرحق ہونے کا بھی اعتراف کرو، خواہ بظاہر وہ تمہارے نظریہ کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ اس لہر کے بعد پورے ملک میں امن وشانتی اور جان کے احترام کا ماحول دکھائی دیتا، کیوں کہ ہندو دھرم جان مارنے کو آخری حد تک برا سمجھتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک ہندو مفکر نے کہا کہ احساس کو مارنے ہی کا نام گناہ ہے اور احساس کو نہ مارنے کا نام ثواب:

Killing of a sensation is sin, and vice versa.

مگر عملاً ہم اس کے بالکل مختلف صورت حال دیکھ رہے ہیں۔ ایسی حالت میں اس لہر کو ہندو لہر کیسے کہا جا سکتا ہے۔

"اگرواد" میں یقین کرنے والے کچھ لوگ اگر تشدد اور تخریب کی تحریک چلائیں اور اپنی تقریروں سے عوام کی ایک بھیڑ اکٹھا کر لیں، اس کے بعد اس کا نام گاندھی لہر رکھ دیں تو کیا یہ صحیح ہوگا۔ ظاہر ہے کہ وہ صحیح نہ ہوگا۔ کیوں کہ ایسی لہر حقیقۃً اینٹی گاندھی لہر ہے نہ کہ گاندھی لہر۔

یہی معاملہ ان انتہاپسند ہندو بھائیوں کا ہے جن کو ٹائم میگزین (۱۵ نومبر ۱۹۹۰) نے جنگ جو (Militant Hindus) کہا ہے اور جو بابری مسجد کے خلاف تحریک چلا رہے ہیں۔ وہ اپنی اس تحریک کو اس چیز کا حصہ سمجھتے ہیں جس کو وہ ہندتو کہتے ہیں۔ یہ تحریک باعتبار حقیقت مسلمانوں کے خلاف ہے۔ چنانچہ مسٹر ایل کے اڈوانی نے اس کی تشریح (minorityism versus nationalism) (اقلیت نوازی بمقابلہ قومیت) کے الفاظ میں کی ہے (انڈیا ٹوڈے، ۳۱ اکتوبر ۱۹۹۰، صفحہ ۵۹)

اس موضوع پر ہمارے ہندو بھائی جو پرتشدد تحریک چلا رہے ہیں، وہ واضح طور پر رواداری، اہمسا اور ہر ایک کے احترام کے خلاف ہے جس کو ہندوازم کا بنیادی اصول بتایا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں اس تحریک کو بھی اینٹی ہندو لہر کا نام دیا جائے گا نہ کہ ہندو لہر کا۔

عقیدہ یا تاریخ

یہ حضرات کہتے ہیں کہ اجودھیا کی بابری مسجد عین رام جنم بھومی کے مقام پر بنی ہے، اس لئے ہم مسجد کو ڈھاکر دوبارہ وہاں رام مندر بنائیں گے۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ آپ کا دعویٰ تاریخ سے ثابت نہیں ہوتا۔ مگر وہ اس پر دھیان دینے کے لئے تیار نہیں۔

مثال کے طور پر تاریخ بتاتی ہے کہ بابری مسجد ۱۵۲۸ میں بنائی گئی۔ اس کے تقریباً چالیس سال بعد تلسی داس (وفات، بنارس ۱۶۲۳) اجودھیا جاتے ہیں۔ وہ وہاں کے مندروں کو دیکھتے ہیں اور رام کی زندگی پر اودھی زبان میں اپنی کتاب رام چرت مانس (۷۶-۱۵۷۴) لکھتے ہیں۔ اس تفصیلی کتاب میں رام کے بارے میں ہر چیز موجود ہے۔ مگر اس میں رام جنم بھومی پر بنے ہوئے مندر کو توڑ کر مسجد بنانے کوئی ذکر نہیں۔

حالانکہ یہ شہنشاہ اکبر (۱۶۰۵-۱۵۴۲) کا زمانہ تھا۔ جیسا کہ معلوم ہے، اکبر ایک ہندو نواز بادشاہ تھا۔ اس کی ملکہ بھی ایک ہندو خاتون تھی۔ اگر مندر توڑنے کا واقعہ صحیح ہوتا تو اکبر جیسے بادشاہ کے زمانہ میں تلسی داس اس کی بے خوف و خطر نشاندہی کرتے کہ بابر کے حاکم میر باقی نے رام مندر کو توڑ کر وہاں مسجد بنادی تھی۔ تلسی داس اگر اس کا اعلان کرتے تو اس کے بعد یا تو فوراً شاہی فرمان نافذ ہوتا کہ اس عمارت کو ہندوؤں کے حوالہ کر دیا جائے۔ یا کم از کم تلسی داس کی کتاب میں اس کا ریکارڈ ہمارے پڑھنے کے لئے موجود رہتا۔

اس طرح کے حقائق جب پیش کئے جاتے ہیں تو مذکورہ حضرات کہتے ہیں کہ یہ ہمارے عقیدہ کا مسئلہ ہے۔ اس معاملے میں ہم تاریخ کی کوئی بات نہیں سنیں گے اور نہ عدالت کا فیصلہ مانیں گے۔ کیونکہ مذہبی عقیدہ کا تعلق تاریخ اور عدالت سے نہیں ہوتا۔

یہ جواب سراسر غیر معقول ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مذہبی عقیدہ کا تعلق تاریخ یا عدالت سے نہیں ہوتا۔ مگر "مندر کو توڑ کر مسجد بنانے" کا مسئلہ مکمل طور پر ایک تاریخی مسئلہ ہے نہ کہ عقیدہ کا مسئلہ۔

اگر یہ کہا جائے کہ " رام وشنو کے اوتار تھے " تو یہ بلاشبہ عقیدہ کا ایک مسئلہ ہوگا۔ اس کو تاریخ اور قانون کے دائرہ میں زیر بحث نہیں لایا جاسکتا۔ مگر " فلاں مسجد مندر کو توڑ کر بنائی گئی " یہ بلاشبہ تاریخ کا مسئلہ ہے اور بصورت نزاع یقیناً اس کو تاریخ اور قانون کے دائرہ میں لاکر فیصلہ کیا جانا چاہئے۔

جو لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں وہ ہندو سماج کی کوئی خدمت انجام نہیں دے رہے ہیں۔ وہ ہندو سماج کو اس کی اعلیٰ روایات سے ہٹا رہے ہیں۔ سوامی وویکا نند کی امریکہ کے پارلیمنٹ آف ریلیجنز میں تقریر (۱۸۹۳) کے بعد سے اب تک ہزاروں ہندو پیشواؤں کو مغربی ملکوں میں زبردست استقبال ملتا رہا ہے۔ اس کی وجہ ہندو دھرم کی رواداری اور عدم تشدد کی روایات ہیں۔ اب کیا ہندوؤں کے انتہا پسند رہنما تاریخ کے اس پورے باب کو بند کر دینا چاہتے ہیں۔ وہ ہندو دھرم کو اس کی اس کشش سے محروم کر دینا چاہتے ہیں جس نے مشرق و مغرب کے بہت سے لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کیا تھا۔

نیا فیصلہ

پچھلے پچاس برس سے تمام سطحی لیڈر یہ کہہ رہے تھے کہ جب اشتعال انگیزی کی جائے گی تو مسلمان ضرور مشتعل ہوں گے۔ یہ اصول سراسر غیر معقول اور غیر اسلامی تھا۔ لیکن مسلمانوں نے لیڈروں کے پر فریب الفاظ میں آکر اسے اختیار کر رکھا تھا۔ مگر حالات بتاتے ہیں کہ اب وہ اس فریب سے باہر آچکے ہیں۔ اب انھوں نے جان لیا ہے کہ اشتعال انگیزی ہو تب بھی انھیں مشتعل نہیں ہونا ہے۔ ان کے جذبات کو چھیڑا جائے تب بھی انھیں اعراض کرکے اس سے گزر جانا ہے۔

اکتوبر ۱۹۹۰ میں بھارتیہ جنتا پارٹی کے صدر کی ۱۰ ہزار کیلو میٹر کی رتھ یاترا جو سومناتھ سے شروع ہو کر اجودھیا میں ختم ہونے والی تھی، اس نے اپنے طویل سفر کے دوران بار بار اشتعال انگیزی کی صورت حال پیدا کی۔ مگر مسلمان برابر اعراض کے اصول پر قائم رہے۔ ۳۰ اکتوبر کو بابری مسجد کے گنبدوں پر بھگوا جھنڈا لہرا دیا گیا۔ اس کو ٹیلی ویژن پر دکھایا گیا اور تمام اخبارات میں اس کی تصویریں چھپیں۔ اس دوران ملک کے مختلف حصوں میں درجنوں مقامات پر فسادات ہوئے۔

اس قسم کے مختلف اشتعال انگیز واقعات بار بار ہوتے رہے۔ مگر مسلمانوں نے ایک بار بھی کسی مقام پر ردعمل کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ہر موقع پر وہ کامل صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے رہے۔ وہ اپنے صابرانہ طریقہ سے فساد کی آگ کو بجھاتے رہے۔

یہ ایک عظیم الشان تبدیلی ہے جو ہندستانی مسلمانوں کی سیاست میں ۱۹۹۰ کے آخر میں ظہور میں آئی ہے۔ مسلمانوں نے پہلی بار اپنے نااہل لیڈروں کو رد کر دیا ہے اور یہ فیصلہ کیا ہے کہ اسلامی اصول کے مطابق، وہ اشتعال انگیزی کے مقابلہ میں صبر کی روش اختیار کریں گے، وہ برے سلوک کا جواب اچھے سلوک سے دیں گے۔

مسلمانوں نے اپنے اس نئے فیصلہ میں صرف ایک چیز کھوئی ہے، وہ ان کے نااہل لیڈر ہیں۔ اس کے سوا انھوں نے تمام چیزوں کو پالیا ہے۔ مسلمانوں کی یہ نئی دریافت انھیں مبارک ہو۔

نااہل لیڈروں کی غلط رہنمائی خود ان لیڈروں کو تو بہت کچھ دیتی رہی۔ مگر اس کے نتیجہ میں مسلمان پچھلی نصف صدی تک نہایت قیمتی چیزیں کھوتے رہے۔ اب انشاء اللہ اپنے نئے فیصلہ کے تحت وہ مزید

اضافہ کے ساتھ یہ تمام چیزیں پالیں گے۔

۱. اس کا ایک المناک نتیجہ یہ تھا کہ مسلمان ہندستان میں غیر ضروری طور پر مایوسی کا شکار رہے۔ وہ یہ سمجھتے رہے کہ ہندستان میں ان کے لئے زندگی اور عمل کے مواقع نہیں ہیں۔ اور اس کی وجہ، نا اہل لیڈروں کے بیان کے مطابق، یہ تھی کہ ملک میں انھیں بعض اوقات ناخوشگوار حالات سے سابقہ پیش آتا ہے۔

حالات بتاتے ہیں کہ اب مسلمانوں نے یہ دریافت کر لیا ہے کہ ناخوشگواری کسی خاص ملک کی صفت نہیں بلکہ وہ دنیا کی صفت ہے۔ موجودہ دنیا میں ہر جگہ، خواہ وہ مسلم ملک ہو یا غیر مسلم ملک، اس قسم کے حالات لازماً پیش آتے ہیں۔ ضرورت یہ ہے کہ حکمت اور تدبیر کے ساتھ ان سے نپٹا جائے۔ یہ حالات دراصل چیلنج ہیں اور چیلنج، خود تخلیق خداوندی کے مطابق، زندگی کا حصہ ہے۔ چیلنج کے ذریعہ ہی انسانیت ترقی کرتی ہے۔ اگر چیلنج نہ ہو تو انسانیت کا قافلہ معطل ہو کر رہ جائے۔

مجھے یقین ہے کہ اس دریافت کے بعد ہندستان کے مسلمان اس ملک میں نئے حوصلہ کے ساتھ زندگی کی تعمیر کریں گے۔

۲. لیڈروں کی غلط رہنمائی کا دوسرا نقصان جو پچھلے برسوں میں مسلمانوں کو اٹھانا پڑا وہ یہ تھا کہ وہ اسلام کی بتائی ہوئی ایک عظیم طاقت سے محروم ہو گئے۔ قرآن میں مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ کوئی شخص تمہارے ساتھ برا سلوک کرے تو تم اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو تمہارا دشمن بھی تمہارا دوست بن جائے گا۔ (۴۱ : ۳۴)

اسلام کی یہ تعلیم ایک ایسا اخلاقی ہتھیار ہے جس کے اندر تسخیر کی لامحدود صلاحیت ہے۔ دور اول کے مسلمانوں نے اس اخلاقی طاقت کو استعمال کر کے اپنے بدترین دشمنوں کو زیر کر لیا تھا۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان بھی اس اسلامی تعلیم کا یہ فائدہ حاصل کر سکتے تھے مگر نا اہل لیڈروں کی غلط رہنمائی نے انھیں اس نعمت سے محروم رکھا۔ اب مسلمانوں نے جو نیا سفر شروع کیا ہے اس میں ان شاء اللہ وہ اس اسلامی تعلیم کا بھرپور فائدہ حاصل کر سکیں گے۔

۳. نا اہل لیڈروں کی غلط رہنمائی کا ایک نقصان یہ بھی ہوا کہ مسلمان ملک کی ایک اہم حقیقت سے بے خبر رہ گئے جو سراسر ان کی موافقت میں تھی۔ کوئی شخص اگر اپنے ماحول کے بارہ میں منفی انداز سے سوچنے

لگے تو اس کا لازمی نقصان یہ ہوتا ہے کہ اس کو صرف "عسر" کا پہلو دکھائی دیتا ہے۔ "یسر" کا پہلو اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ اس معاملہ کے مختلف پہلو ہیں۔ یہاں میں صرف ایک پہلو کا ذکر کروں گا۔

ٹائمس آف انڈیا (۹ نومبر ۱۹۹۰) کے آخری صفحہ پر ایک چھوٹی سی خبر چھپی ہے مگر وہ انتہائی اہم ہے۔ بمبئی کی ڈیٹ لائن کے ساتھ چھپنے والی اس خبر میں بتایا گیا ہے کہ ٹائمس آف انڈیا اپنے سات ایڈیشنوں کے ساتھ اس وقت ملک کا سب سے زیادہ فروخت ہونے والا اخبار ہے جس کی ہر روز چھ لاکھ انتیس ہزار (629,000) کاپی فروخت ہوتی ہے۔ خبر کے مطابق اس سے پہلے انڈین ایکسپریس اپنے بارہ ایڈیشنوں کے ساتھ ملک میں سب سے زیادہ بکنے والا اخبار تھا۔ مگر آڈٹ بیورو آف سرکولیشن (ABC) کے تازہ اعلان کے مطابق، ٹائمس آف انڈیا نے پہلی بار سب سے زیادہ چھپنے والے اخبار کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ ٹائمس آف انڈیا اپنی موجودہ اشاعت کے ساتھ ملیالا منورما (Malayala Manorama) سے بھی آگے بڑھ گیا ہے جس کی موجودہ اشاعت چھ لاکھ سات ہزار ہے۔

یہ خبر علامتی طور پر ملک کے ایک واقعہ کو بتاتی ہے۔ رام جنم بھومی تحریک کے سلسلہ میں ٹائمس آف انڈیا نے واضح طور پر اس کے مخالف رویہ اختیار کیا۔ ایڈیٹوریل، مضامین، خطوط اور خبروں کی صورت میں وہ مسلسل یہ تاثر دیتا رہا ہے کہ یہ پوری تحریک دقیانوسیت پر مبنی ہے اور وہ ملک کی ترقی کے لئے تباہ کن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رام جنم بھومی تحریک کے لوگ ٹائمس آف انڈیا کو اپنا دشمن اخبار بتاتے ہیں۔

اس وقت ملک کے جو حالات ہیں، ان میں ٹائمس آف انڈیا کی اشاعت کا بڑھنا علامتی طور پر اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندوؤں کے تعلیم یافتہ طبقہ کی سوچ وہی ہے جو ٹائمس آف انڈیا کی سوچ ہے۔ یہ طبقہ اس پوری تحریک کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے۔

مذکورہ خبر اس واقعہ کی صرف ایک علامت ہے۔ ورنہ مختلف صورتوں میں یہ بات بار بار سامنے آچکی ہے۔ ہندستان کے تمام بڑے بڑے ہندو مورخین نے اس معاملہ میں رام جنم بھومی کے دعویٰ کو غیر تاریخی قرار دے کر اس کی مذمت کی ہے۔ ان کی یہ مذمت عالمی سطح پر مشتہر ہو چکی ہے۔ حتیٰ کہ امریکہ کے ٹائم میگزین نے بھی نمایاں طور پر اس کا اظہار کیا ہے۔

جو لوگ ہندی اور انگریزی اخبارات کا مطالعہ کرتے ہیں، انھیں یہ بات معلوم ہے کہ اس معاملہ میں ہندو تعلیم یافتہ لوگوں نے کثرت سے ایسے مضامین اور خطوط شائع کرائے ہیں جو عمدہ درجہ حقیقت پسندانہ نقطہ نظر پر مبنی ہیں۔ جن لوگوں کو ہندی اور انگریزی اخبارات کے مطالعہ کا موقع نہ ملا ہو وہ مسلمانوں کے اردو اخبارات میں بھی ان کے اقتباسات دیکھ سکتے ہیں۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ ہندو قوم واضح طور پر دو طبقوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ایک عوام کا طبقہ، اور دوسرے ان کے خواص کا طبقہ۔ یہ صحیح ہے کہ شمالی ہند کے ہندو عوام کی ایک تعداد رام جنم بھومی کے ساتھ ہے۔ مگر دوسرا خوش آئند پہلو یہ ہے کہ ملک کے تعلیم یافتہ ہندو اور اسی کے ساتھ جنوبی ہند کے تقریباً تمام ہندو اس معاملہ میں حقیقت پسندانہ رائے رکھتے ہیں جو واضح طور پر مسلمانوں کی موافقت میں ہے۔

ماضی میں مسلمان اس حقیقت کا شعوری ادراک نہ کر سکے تھے۔ اب اپنے نئے ذہن کے تحت انشاء اللہ وہ اس حقیقت کا بھرپور ادراک کریں گے اور اس کے مطابق اپنے ملی منصوبوں کی تشکیل کریں گے۔

۴۔ وشو ہندو پریشد کے جنرل سکریٹری مسٹر اشوک سنگھل نے ۷ نومبر ۱۹۹۰ کو نئی دہلی میں ایک تقریر کی۔ انھوں نے اپنی اس تقریر میں جو باتیں کہیں، ان میں سے ایک بات، ٹائمس آف انڈیا (۸ نومبر ۱۹۹۰) کی انگریزی رپورٹنگ میں ان الفاظ میں تھی:

He said Muslims should realise politicians cannot save them. If anybody can save them, it is the Hindu. They should learn to coexist with us and we will protect them, for every Hindu is secular.

مسٹر سنگھل نے ایک مناسب بات غیر مناسب الفاظ میں کہی ہے۔ اس بات کو کہنے کے لئے زیادہ صحیح الفاظ یہ ہیں کہ مسلمانوں کا مسئلہ کوئی بھی حکمراں حل نہیں کرے گا۔ مسلمان اپنا مسئلہ صرف اپنی کوشش سے حل کر سکتے ہیں۔

آزادی کے بعد مسلمان غلط رہنمائی کے نتیجہ میں، ہمیشہ حکومت اور انتظامیہ کی طرف دیکھتے رہے۔ وہ الکشن کے مواقع پر پارٹیوں کو ہرا کر یا جتا کر ان سے بڑی بڑی امیدیں باندھتے

رہے۔ یہ سب بلاشبہہ بے فائدہ تھا۔ مسلمانوں کے لئے اس معاملہ میں مفید بات صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ وہ برادران وطن سے اپنے تعلقات کو بہتر بنائیں۔ یہی ان کے لئے پہلے بھی درست طریقہ تھا اور آج بھی یہی ان کے لئے درست طریقہ ہے۔

مسلمان اور ہندو سب ایک ہی انسانی نسل کے افراد ہیں۔ دونوں کا ایک ہی مشترک وطن ہے۔ دونوں کا مفاد ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہے۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ ان کے ساتھ بھائیوں کی طرح رہیں۔ اگر کسی معاملہ میں کوئی اختلافی بات پیدا ہو تو اس پر اسی طرح تحمل اور بردباری کا انداز اختیار کریں، جس طرح وہ اپنے گھر اور خاندان میں اس طرح کے معاملات میں ہمیشہ کرتے ہیں۔

مسلمانوں نے اگر ایسا کیا تو اسلام کے مطابق، وہ اپنے قومی اور وطنی پڑوسی کے حقوق ادا کریں گے اور اسی کے ساتھ یقینی طور پر وہ اس امن کو بھی حاصل کرلیں گے جو انھیں اس ملک میں اپنے مستقبل کی تعمیر کے لئے درکار ہے۔

پتھر کھسک گیا

بنی اسرائیل کی تاریخ کا ایک واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب سے بیان کیا۔ سننے والوں میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ وہ اس واقعہ کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

تم سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں ان میں سے تین آدمی ایک سفر پر نکلے۔ چلتے چلتے رات ہوگئی تو رات گزارنے کے لئے وہ ایک غار میں داخل ہو گئے۔ پہاڑوں پر اکثر پتھر گرنے (land slide) کے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ رات کے وقت اوپر سے ایک بڑا پتھر لڑھک کر گرا اور اس کی وجہ سے غار کا منھ بند ہوگیا۔ انھوں نے کہا کہ اس چٹان سے نجات کی ہمارے پاس اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں ہے کہ ہم اپنے نیک عمل کا واسطہ دے کر اللہ سے دعا کریں۔

اب ایک شخص دعا کرنے بیٹھا۔ اس نے کہا: خدایا، میرے باپ بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔ میرا معمول تھا کہ روزانہ شام کو جب میں اپنے جانور چرا کر لوٹتا تو جب تک میں ان دونوں کو دودھ نہ پلا لیتا نہ خود دودھ پیتا اور نہ کسی اور کو پلاتا۔ ایک دن میں چارہ کی تلاش میں دور نکل گیا۔ شام کو واپسی میں اتنی دیر ہوئی کہ میرے ماں باپ سو گئے۔ میں نے ان دونوں کے لئے دودھ نکال کر تیار کیا۔ جب ان کے پاس دودھ لے کر پہنچا تو دونوں کو سوتا ہوا پایا۔ مجھے یہ گوارا نہ ہوا کہ میں ان کو جگاؤں اور مجھ کو یہ بھی گوارا نہ تھا کہ میں ان سے پہلے دودھ پیوں اور اپنے بچوں کو پلاؤں۔ میں ان کے پاس کھڑا ہو گیا۔ میرے ہاتھ میں پیالہ تھا اور میں اس انتظار میں تھا کہ جب وہ جاگیں تو میں ان کو دودھ پیش کردوں۔ اسی حال میں صبح ہو گئی۔ بچے میرے پاؤں کے پاس بلبلاتے رہے۔ صبح کو وہ دونوں اٹھے اور انھوں نے دودھ پیا۔ اس کے بعد ہم سب لوگوں نے دودھ پیا۔ میرے اللہ یہ عمل اگر میں نے تیری رضا کے لئے کیا ہے تو اس چٹان کی مصیبت سے تو ہم کو نجات دے دے۔ چنانچہ چٹان تھوڑی سی کھسک گئی مگر اتنی زیادہ نہیں کہ وہ تینوں نکل سکیں۔

اب دوسرے آدمی نے دعا شروع کی۔ اس نے کہا: خدایا، میرے چچا کی ایک لڑکی تھی۔ وہ مجھ کو بہت محبوب تھی، اس سے مجھ کو اسی قسم کی شدید محبت تھی جو مردوں کو عورتوں سے ہوتی ہے۔ میں نے اس سے اپنے نفس کی خواہش پوری کرنی چاہی مگر وہ منع کرتی رہی۔ کچھ عرصہ بعد وہ قحط سالی کی مصیبت میں پریشان ہوئی۔ وہ مدد کے لئے میرے پاس آئی۔ میں نے اس کو ۱۲۰ دینار اس شرط پر دئے کہ وہ مجھ کو اپنے اوپر قابو دے دے۔ وہ اس کے لئے تیار ہوگئی۔ یہاں تک کہ جب میں اس کے اوپر پوری طرح قادر ہوگیا اور اس کے دونوں پیروں کے درمیان بیٹھ گیا تو اس نے کہا: خدا سے ڈر اور مہر کو اس کے حق کے بغیر نہ توڑ۔ میں اس سے باز آگیا حالاں کہ وہ مجھ کو

تمام لوگوں میں سب سے زیادہ محبوب تھی۔ اور جو دینار میں نے اس کو دئے تھے وہ بھی اس سے واپس نہیں لئے۔ خدایا، اگر میں نے یہ کام تیری رضا کے لئے کیا ہے تو اس مصیبت سے تو ہم کو نجات دے دے جس میں ہم اس وقت پھنسے ہوئے ہیں۔ چنانچہ چٹان تھوڑی سی ہٹ گئی مگر اتنی نہیں کہ وہ نکل سکیں۔

اب تیسرے آدمی نے دعا کی۔ اس نے کہا۔ خدایا، میں نے کچھ مزدور اجرت پر رکھے۔ کام کے بعد میں نے سب کو اجرت دے دی۔ مگر ایک مزدور اپنی اجرت چھوڑ کر چلا گیا۔ میں نے اس کی چھوڑی ہوئی رقم کو کاروبار میں لگا دیا۔ اس سے مجھ کو بہت زیادہ مالی فائدہ ہوا۔ کچھ عرصہ بعد وہ آدمی واپس آیا اور کہا: اے اللہ کے بندے، میری اجرت مجھ کو دے دے۔ میں نے اس سے کہا: یہ اونٹ، یہ گائیں، یہ بکریاں اور یہ غلام جو تم دیکھ رہے ہو یہ سب تمھاری مزدوری ہے۔ اس نے کہا: اے خدا کے بندے، مجھ سے مذاق نہ کر۔ میں نے کہا کہ میں تم سے مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ یہ سب تمھارا ہی ہے۔ اس کے بعد اس نے سب چیزیں لیں اور ان کو اس طرح ہنکائے گیا کہ ان میں سے کچھ بھی نہ چھوڑا۔ خدایا، اگر یہ میں نے تیری رضا کے لئے کیا ہے تو اس مصیبت سے تو ہم کو نجات دے دے۔ اس کے بعد چٹان ہٹ گئی اور وہ تینوں باہر نکل کر روانہ ہو گئے (بخاری ومسلم)

یہ روایت صحیحین میں آئی ہے اور اس کے واقعہ ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دعا ایسی چیز ہے جو پتھر کی چٹان کو بھی اپنی جگہ سے کھسکا دیتی ہے۔ مگر یہ وہ دعا نہیں ہے جو زبان سے بس الفاظ کی صورت میں نکلتی ہے اور آدمی کی حقیقی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

مذکورہ مثال بتاتی ہے کہ دعا سے چٹان کھسکنے کا واقعہ ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو اپنے آپ کو پوری طرح خدا کے تابع کر دیں، جو اپنے اوپر خدا کو نگراں بنا لیں۔ حتی کہ بھوک کی شدت اور بیوی بچوں کی محبت بھی ان کو خدا کی پسندیدہ راہ سے نہ ہٹا سکے۔ انتہائی نازک جذباتی مواقع پر بھی خدا کی یاد دلانا ان کو چونکا دینے کے لئے کافی ہو، ہیجان خیز لمحات میں بھی جب خدا کا نام لے لیا جائے تو ان کے چلتے ہوئے قدم رک جائیں، اور ان کے اٹھے ہوئے ہاتھ اپنی حرکت بند کر دیں۔ آخرت کے حساب کا اندیشہ ان پر اتنا زیادہ طاری ہو کہ ایک حق دار کا حق ادا کرنے کی خاطر اگر ان کو اپنا سارا اثاثہ دے دینا پڑے تو اس سے بھی وہ دریغ نہ کریں۔ ایک آدمی اگر اپنا مطالبہ لے کر ان کے سامنے کھڑا ہو جائے تو وہ فوراً اس کو مان لیں خواہ مطالبہ کرنے والا کتنا ہی بے زور ہو اور اس کے مقابلہ میں ان کو کتنی ہی زیادہ قوت حاصل ہو۔

خدا کے بندے وہ ہیں جو اپنے نفس کو کچلنے اور اپنے فائدوں کو ذبح کرنے کی قیمت پر خدا کو اختیار کرتے ہیں۔ اور جو لوگ اس طرح خدا کو اپنا لیں وہ اگر کہیں کہ خدایا تو اس پتھر کی چٹان کو کھسکا دے تو خدا پتھر کی چٹان کو بھی ان کے لئے کھسکا دیتا ہے۔

پیغمبر کا طریقہ

قَالَ مُسْلِمٌ فِي صَحِيحِهِ حَدَّثَنَا ابْنُ أَبِي عُمَرَ حَدَّثَنَا مَرْوَانُ الْفَزَارِيُّ عَنْ يَزِيدَ بْنِ كَيْسَانَ عَنْ ابْنِ أَبِي حَازِمٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ۔ قِيلَ يَا رَسُولَ اللهِ ادْعُ عَلَى الْمُشْرِكِينَ قَالَ : إِنِّي لَمْ أُبْعَثْ لَعَّانًا وَإِنَّمَا بُعِثْتُ رَحْمَةً ۔

امام مسلم اپنی صحیح میں کہتے ہیں کہ مجھ سے ابن ابی عمر نے کہا، ان سے مروان فزاری نے بیان کیا، ان سے یزید بن کیسان نے، ان سے ابن ابی حازم نے اور ان سے ابوہریرہؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا گیا کہ آپ مشرکوں کے خلاف بددعا کریں۔ آپ نے فرمایا کہ مجھ کو لعنت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا ہے بلکہ مجھ کو رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اور آپ کے اصحاب پر ان کے دشمنوں نے جو مصیبتیں ڈالیں اور جو ظلم کیا وہ آج کے ظلم اور مصیبت سے بہت زیادہ تھا۔ حتیٰ کہ مقدس صحابہ ان مظالم کو دیکھ کر کہہ اٹھے کہ ان کے خلاف بددعا کی جائے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ذہن کی تصحیح کی۔ آپ نے فرمایا کہ ہمارا کام دنیا کو خدا کی رحمتوں کے سایہ میں داخل کرنا ہے نہ کہ ان کی ہلاکت اور بربادی کا سامان کرنا۔

یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ آپ کے خلاف لوگوں نے ظلم کیا، اس کے باوجود آپ نے ان کے ساتھ خیر خواہی کی۔ لوگوں نے آپ پر مصیبتیں ڈالیں، اس کے باوجود آپ ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی اعلیٰ سلوک کا یہ نتیجہ تھا کہ آپ کو دنیا میں اعلیٰ ترین کامیابی حاصل ہوئی۔ قومیں آپ کے آگے جھک گئیں۔ ظلم اور سرکشی کرنے والے آپ کے ہاتھ پر بیعت کرکے آپ کے ساتھی اور معاون بن گئے۔

مسلمانوں کو بھی اپنے پیغمبر کے اسی نمونہ پر عمل کرنا ہے۔ ہم کو اقوام عالم کا خیر خواہ بننا ہے، خواہ بظاہر وہ ہمارے ساتھ بدخواہی کریں۔ ہمیں لوگوں کے حق میں ہدایت کی دعا کرنا ہے، خواہ وہ ہمارے ساتھ ظلم و زیادتی کا معاملہ کریں۔ ہمیں دوسروں سے محبت کرنا ہے، خواہ ہمیں دوسروں کی طرف سے نفرت و عداوت کا تجربہ ہو رہا ہو۔

یہی پیغمبر کا طریقہ ہے، اور پیغمبر کا طریقہ اختیار کرنے کے بعد ہی مسلمان خدا کی ان نصرتوں کے مستحق قرار پا سکتے ہیں جن کا وعدہ خدا نے اپنے پیغمبر کے ذریعہ ان کے لیے کیا ہے۔

مجھ کو لعنت والا نہیں بنایا گیا ہے بلکہ مجھ کو رحمت والا بنایا گیا ہے   یہ کوئی سادہ بات نہیں ہے، وہ بہت اہم بات ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا رویہ بلند اخلاق کے اصولوں پر قائم تھا۔ لوگ بظاہر لعنت کے مستحق بن رہے ہوں، تب بھی آپ کے اوپر لازم تھا کہ آپ ان کے ساتھ رحم دلی کا معاملہ فرمائیں۔ لوگوں کے برے سلوک کے باوجود آپ ان کے ساتھ اعلیٰ سلوک کریں۔

دشمن سے مقابلہ کے لیے آپ کی تدبیر نرمی کے اصولوں پر مبنی تھی نہ کہ سختی کے اصولوں پر۔ اپنے مخالفین کو زیر کرنے کے لیے آپ کا ہتھیار ان کے ساتھ مہربانی کرنا تھا نہ کہ ان کو اپنی طاقت کا مزہ چکھانا۔

آپ کا طریقہ لوگوں کے جسموں پر بل ڈوزر چلانا نہیں تھا بلکہ لوگوں کے دلوں کو جیتنا تھا، آپ دشمن کو دشمن کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے، بلکہ اس نظر سے دیکھتے تھے کہ آج کا دشمن کل کا دوست بن سکتا ہے۔

نیا ہندستان

امید کی طرف

موجودہ دنیا کا نظام کچھ فطری اصولوں پر قائم ہے۔ فطرت کے یہ اصول انتہائی حد تک اٹل ہیں۔ ان میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ انھیں میں سے ایک ابدی اصول، قرآن کے الفاظ میں یہ ہے کہ اس دنیا میں ہمیشہ عُسر کے ساتھ یُسر موجود رہتا ہے (اِنَّ مَعَ العُسرِ یُسرا) یہاں ہر ناموافق واقعہ میں ایک موافق پہلو پایا جاتا ہے۔ فطرت کا یہ اصول اتنا عام ہے کہ بدترین تخریب، حتیٰ کہ قتل جیسے حادثات بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ حضرت آدم کے بیٹوں میں سے دو بیٹوں میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ ان کا نام ہابیل اور قابیل تھا۔ دونوں بھائیوں کا اختلاف بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ اپنی آخری شدت تک پہونچ گیا۔ اب قابیل نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر دے۔ چنانچہ اندھے انتقام سے مغلوب ہو کر قابیل نے ہابیل کو مار ڈالا ــــ اب چلتا پھرتا اور ہنستا بولتا ہابیل ایک بے جان لاش کی صورت میں اس کے سامنے پڑا ہوا تھا۔ ہابیل جب زندہ تھا تو وہ قابیل کو حریف کے روپ میں دکھائی دیتا تھا۔ مگر جب اس نے اپنے بھائی کو خون آلود لاش کے روپ میں دیکھا تو اس کا ضمیر جاگ اٹھا۔ اب اس کی انسانیت بیدار ہو کر اس کو ملامت کرنے لگی۔ یہی وہ حقیقت ہے جو قرآن میں ان الفاظ میں بتائی گئی ہے: فَاَصْبَحَ مِنَ النّادِمِینَ (المائدہ ۳۱) پھر وہ پچھتانے والوں میں سے ہو گیا۔

اس سے ایک اہم نفسیاتی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ انتقام اپنی آخری حد پر پہونچ کر ندامت بن جاتا ہے۔ غصہ جب اپنی آخری کارروائی کر چکا ہوتا ہے تو اس کے بعد وہ اعتراف میں ڈھل جاتا ہے۔ حیوانیت اپنا آخری روپ دکھانے کے بعد انسانیت کی طرف لوٹ آتی ہے۔

فطرت کا یہ قانون ایک قسم کا چیک (روک) ہے جو زندگی کے نظام کو درست رکھتا ہے۔ وہ انتہا پسندی کو بار بار اعتدال پسندی کی طرف لے آتا ہے۔ وہ عدم توازن کو توازن کی طرف لوٹاتا رہتا ہے۔ انسانیت کی گاڑی جب سیدھے راستہ سے ہٹ کر بھٹکاؤ والے راستہ کی طرف مڑنے لگتی ہے تو وہ اس کو دوبارہ سیدھے راستہ پر لا کر اس کی اصل منزل کی طرف اسے رواں دواں کر دیتا ہے۔

یہ دنیا امید پر قائم ہے، مایوسی پر نہیں۔ اس دنیا کی اصل روشنی ہے، اس دنیا کی اصل تاریکی نہیں۔ یہاں تاریخ زندگی کی طرف جا رہی ہے، یہاں تاریخ کبھی موت کی طرف سفر کرنے والی نہیں۔

ایک تبصرہ

مہاتما گاندھی کے سوانح نگار لوئی فشر (Louis Fischer) نے اپنی کتاب کے آخری باب میں یہ دکھایا ہے کہ ناتھورام گاڈسے نے گاندھی جی کو کیوں قتل کیا۔ اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں کہ گاڈسے اور ان کے ساتھی یہ سمجھتے تھے کہ گاندھی کو اپنے راستہ سے ہٹاکر وہ مسلمانوں کو ایسی حالت میں کر دیں گے کہ ان کا کوئی بچاؤ کرنے والا نہ ہوگا۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ گاندھی کا قتل الٹا نتیجہ پیدا کرے گا، کیوں کہ یہ واقعہ ملک کو بتائے گا کہ اینٹی مسلم تحریک کتنی زیادہ خطرناک ہے اور وہ کہاں تک جا سکتی ہے :

They wished, by removing him, to make the Moslems defenseless, little realizing that his assassination would have the opposite effect by showing the country how dangerous and undisciplined extreme anti-Moslems could be. (The Life of Mahatma Gandhi, pp. 504-505)

عملاً ایسا ہی پیش آیا۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو ہندستان آزاد ہوا تو اس کے ساتھ ہی ملک میں زبردست مسلم دشمنی کی لہر آگئی۔ مسلمانوں کے خلاف مجنونانہ انداز میں خون آشام کارروائی شروع ہوگئی۔ مگر جب اس کا یہ انتہائی نتیجہ سامنے آیا کہ ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ کو اس نے خود ملک کے باپو مہاتما گاندھی کو پستول کی گولی سے ہلاک کر دیا تو پورا ملک سناٹے میں آگیا۔ مہاتما گاندھی کے خون نے مسلم دشمنی کی آگ کو اچانک بجھا دیا۔ اور پھر چالیس سال کے لیے تاریخ کے رخ کو دوسری طرف موڑ دیا۔

ٹھیک اسی قسم کا واقعہ دوبارہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو اجودھیا میں پیش آیا ہے۔ بعض اسباب نے ہندو انتہاپسندی کو دوبارہ موقع دیا۔ وہ ازسرنو اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس بار اس انتہاپسندانہ تحریک کا مرکز اجودھیا تھا۔ اور عام طور پر اس نے بابری مسجد۔ رام جنم بھومی تحریک کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔

یہ تحریک ابتداءً ۱۹۸۶ میں شروع ہوئی۔ جذباتی ہنگاموں کے درمیان وہ بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ اپنے شدید ترین مرحلہ میں پہنچ گئی۔ اس کا آخری نقطۂ عروج ۶ دسمبر ۱۹۹۲ تھا جب کہ

بھارتیہ جنتا پارٹی اور وشو ہندو پریشد کی قیادت میں ایک لاکھ سے زیادہ انتہا پسند ہندو اجودھیا میں داخل ہو گئے۔ انھوں نے ۴۶۵ سالہ بابری مسجد پر یلغار کر دی اور چند گھنٹہ کے اندر اس کو ڈھا کر زمین کے برابر کر دیا۔

یہ بلاشبہ جدید ہندستانی تاریخ کا سیاہ ترین واقعہ تھا۔ عبادت خانہ کسی سماج میں آخری قابل احترام چیز سمجھا جاتا ہے۔ عبادت خانہ کو گرانا گویا تمام انسانی قدروں کو ڈھا دینا ہے۔

یہ فعل پارلی منٹ کے فیصلہ کے خلاف تھا۔ وہ سپریم کورٹ کے فیصلہ کے خلاف تھا۔ وہ نیشنل انٹگریشن کونسل کی تجاویز کے خلاف تھا۔ وہ انڈیا کی تمام بہترین روایات کے خلاف تھا۔ وہ عالمی رائے عامہ کے خلاف تھا۔ وہ اقوام متحدہ کے حقوق انسانی کے چارٹر کے خلاف تھا۔ حتیٰ کہ وہ خود متعلقہ انتہا پسند لیڈروں کے اپنے بیان کے خلاف تھا۔ غرض کوئی بھی ملکی یا غیر ملکی اصول نہیں جس کی تائید اس اقدام کو حاصل ہو۔

تمام سنجیدہ طبقوں نے بجا طور پر اس واقعہ کو ملک کے لیے انتہائی افسوس ناک اور سیاہ واقعہ قرار دیا ہے۔ بلاشبہ یہ اتنا زیادہ الم ناک واقعہ ہے کہ اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ مگر دوسرے تمام حادثات کی طرح، اس حادثہ میں بھی یقیناً ایک مثبت پہلو موجود ہے۔ اس تاریکی میں بھی روشنی کا ایک امکان جھلک رہا ہے۔

یہ دنیا اس طرح بنی ہے کہ یہاں امکانات کی مقدار، ہمیشہ مسائل سے زیادہ ہوتی ہے۔ ظلم کا کوئی بھی واقعہ اس پر قادر نہیں کہ وہ تمام امکانات کو مٹا دے۔ کسی بھی تاریکی کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ امید کے تمام چراغوں کو بے نور کر دے۔

فطرت کے قوانین میں سے ایک قانون یہ ہے کہ یہاں — ظلم اپنی آخری انتہا پر پہنچ کر ندامت بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی سماج میں انتہا پسندی کی تحریک صرف ایک بار اٹھتی ہے۔ اور ایک بار جب وہ اپنے آخری انجام تک پہنچ جائے تو اس کے بعد اس کو دہرانا ممکن نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد فاشزم اٹلی میں دہرائی نہ جا سکی اور اسی طرح نازی ازم کو دوبارہ جرمنی میں فروغ حاصل نہیں ہوا۔

بابری مسجد کا اس طرح ظالمانہ طور پر ڈھایا جانا ہندو انتہا پسندی کے آخری انجام کا ظاہر

ہوتا ہے۔ بابری مسجد کا انہدام دراصل ہندو انتہا پسندی کا انہدام ہے۔ اب ان شاء اللہ اس ملک میں نیا احساس جاگے گا اور کم از کم دو نسل تک اس طرح کے کسی منفی واقعہ کو پھر دہرانا ممکن نہ ہوگا۔

بابری مسجد کے انہدام نے تخریب پسند طاقتوں کو پیچھے دھکیل دیا ہے۔ اب یقینی ہے کہ اس ملک میں سنجیدہ ذہن کے لوگوں کا غلبہ ہوگا۔ زندگی کی تعمیر کے مواقع کھل جائیں گے جو انتہا پسندوں کی منفی کارروائیوں کی وجہ سے بند ہوگئے تھے۔ ۱۹۹۲ کا خاتمہ اس ملک میں مذہبی تشدد پسندی کا خاتمہ ہے، اور اسی کے ساتھ امن اور رواداری اور باہمی احترام کے نئے دور کا آغاز بھی۔

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے واقعہ کے بعد ہندو صاحبان کی طرف سے جو ردعمل سامنے آیا ہے وہ بہت امید افزا ہے۔ ہندوؤں کی اکثریت نے کھل کر مسجد کو ڈھانے کی مذمت کی ہے۔ اس کے بارہ میں اخبارات کی رپورٹیں، ان کے اداریے نوٹ اور ان میں چھپنے والے خطوط بتاتے ہیں کہ ہندو ذہن کو اس واقعہ سے بہت سخت جھٹکا لگا ہے۔ اخباروں میں عام طور پر اس قسم کے الفاظ ۶ دسمبر کے بارہ میں دیکھنے میں آئے :

A dark day, a black day, a day of shame.

بظاہر حالات تقریباً یقینی معلوم ہوتا ہے کہ ہندو انتہا پسندی کی سخت حوصلہ شکنی ہوگی اور ایک عرصہ تک کے لیے وہ خود ہندوؤں کے درمیان بے زمین ہو کر رہ جائے گی۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، ان کے لیے اب بہترین روش یہ ہے کہ وہ ماضی کی طرف نہ دیکھیں، وہ صرف مستقبل کی طرف دیکھیں۔ ۶ دسمبر کے بعد پیش آنے والی صورت حال کو وہ اپنے لیے تعمیر و استحکام کے وقفہ کے طور پر استعمال کریں۔

داخلی تعمیر کے پہلو سے اس ملک میں مسلمانوں کے لیے کرنے کے بہت کام ہیں ــــــ مسلمانوں کو اپنے اندر دینی اور اخلاقی بیداری لانا ہے۔ انھیں اسلام کا پیغام دوسروں تک پہنچانے کے لیے محنت کرنا ہے۔ مسلم نسلوں کو زیادہ سے زیادہ تعلیم یافتہ بنانا ہے۔ انھیں تجارت اور صنعت میں آگے بڑھنا ہے۔ انھیں اپنے موجودہ ملی اور اسلامی اداروں کو ترقی کی طرف لے جانا ہے۔ انھیں اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کرنا ہے۔ وغیرہ۔

نیا ہندستان

اکتوبر ۱۹۹۲ میں دو ہفتے کے لیے میں انگلینڈ میں تھا۔ وہاں لندن، برمنگھم، مانچسٹر وغیرہ کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ان مقامات پر بہت سے ہندستانیوں سے ملاقات ہوئی جو آزادی کے بعد ہندستان چھوڑ کر انگلینڈ چلے گئے اور وہاں آباد ہو گئے۔ میں نے ان لوگوں سے پوچھا کہ آپ نے کس لیے ہندستان چھوڑ دیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ وطن ہم کو بھی عزیز ہے۔ مگر اپنا ملک ہمیں اس لیے چھوڑنا پڑا کہ وہاں کا سسٹم اچھا نہیں۔ وہاں ترقی کے مواقع نہیں۔

یہ بہت زیادہ سوچنے کی بات ہے۔ کیوں کہ آزادی کے لیے قربانیاں تو اس لیے دی گئی تھیں کہ آزادی کے بعد ملک میں زیادہ اچھا نظام بنایا جا سکے گا۔ مگر عملی نتیجہ بالکل برعکس صورت میں ظاہر ہوا۔ آزادی کے بعد یہاں کا نظام پہلے سے زیادہ خراب ہو گیا۔

روزنامہ امرت بازار پتریکا کے سابق ایڈیٹر مسٹر موتی لال گھوش کا انتقال ۱۹۲۰ میں ہوا۔ اس وقت وہ کلکتہ کے اسپتال میں تھے، مہاتما گاندھی اسپتال میں ان سے ملے۔ جواہر لال نہرو کی روایت کے مطابق، موتی لال گھوش نے گاندھی جی سے بات کرتے ہوئے کہا کہ باپو، میں مر رہا ہوں۔ مگر مجھے اطمینان ہے کہ اب میں ایک ایسی دنیا میں جا رہا ہوں جہاں برطانی راج نہ ہوگا :

... where the British Empire did not exist. (p. 66)

یہ ایک علامتی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملک کی آزادی سے ہم نے کیا امیدیں قائم کی تھیں اور آزادی کے بعد کس طرح ہماری امیدیں پوری نہ ہو سکیں۔ ہماری پچھلی نسل ملک کے تمام مسائل کا ذمہ دار انگریز کو سمجھتی تھی۔ مگر جب آزادی آئی تو اس نے ہمارے کسی بھی مسئلہ کو ختم نہیں کیا۔ بلکہ مسائل کو اور زیادہ بڑھا دیا۔

اس کی آخری حد یہ ہے کہ ہماری پچھلی نسل انگریزوں کے ہندستان میں زندہ رہنے کے مقابلہ میں موت کو ترجیح دیتی تھی۔ مگر جب انگریز ہندستان کو چھوڑ کر اپنے ملک میں چلے گئے تو ہماری اگلی نسل کے لوگوں کا حال یہ ہوا کہ وہ ہندستان کو چھوڑ کر دوبارہ انگریزوں کے ملک

میں جا جاکر آباد ہو گئے۔ حتیٰ کہ یہ کہنے میں فخر محسوس کرنے لگے کہ وہ اور ان کے بچے اب یو کے (برطانیہ) میں سٹل ہو گئے ہیں۔

آزادی سے پہلے ہمارے لیڈر تمام ملکی مسائل کا ذمہ دار انگریز کو ٹھہراتے تھے۔ مگر جب آزادی آئی اور ملکی راج قائم ہوا تو مسائل ختم نہیں ہوئے۔ بلکہ برعکس طور پر مسائل میں پہلے سے بھی زیادہ اضافہ ہو گیا۔

یہاں میں اپنا ایک ذاتی تجربہ بیان کروں گا۔ میری پیدائش ۱۹۲۵ میں ایک ایسے خاندان میں ہوئی جہاں آزادی کا چرچا تھا۔ ماحول میں بھی ہر طرف آزادی کی باتیں گونج رہی تھیں۔ اس کے اثر سے میرے اندر یہ ذہن بنا کہ غلامی سب سے زیادہ بری چیز ہے، اور آزادی سب سے زیادہ اچھی چیز ہے۔ بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح میرے ذہن میں بھی آزادی کی تحریک کا یہ معصومانہ تصور قائم ہوا کہ آزادی کی تحریک گویا ملک کو جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کرنے کی تحریک ہے۔

ان احساسات کے ساتھ میں آزادی کے دن کا منتظر تھا۔ یہاں تک کہ انتظار پورا ہوا اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کی تاریخ آگئی۔ اس وقت میری عمر ۲۲ سال تھی، اور میں یوپی کے شہر اعظم گڑھ میں تھا۔ مجھے یاد ہے کہ رات کو میں گھر سے باہر نکلا۔ ہر طرف گھروں اور دکانوں کے اوپر خوشیوں کے چراغ جل رہے تھے۔ میں اس احساس کے ساتھ سڑک پر چل رہا تھا کہ آج میں آزاد ہوں۔ میرا حال یہ تھا کہ خوشی سے زمین پر پاؤں نہیں پڑ رہے تھے۔ "خوشی سے زمین پر پاؤں نہ پڑنا" میں نے ادب کی کتابوں میں پڑھا تھا، مگر اس کا عملی تجربہ پہلی بار ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو ہوا۔ یہی آخری بھی تھا۔ کیوں کہ اس کے بعد پھر کبھی مجھے اس قسم کی خوشی کا تجربہ نہ ہو سکا۔

یہ ۱۵ اگست کی شب کی بات تھی۔ مگر جب صبح ہوئی تو تمام چراغ بجھ چکے تھے، اور پھر وہ کبھی نہیں جلائے گئے۔ آزادی کا انتظار ہم سب کے لیے بہت خوش کن تھا، مگر آزادی کا پانا ہمارے لیے خوشی کا باعث نہ بن سکا۔ آزادی کا خواب، تعبیر ظاہر ہونے کے بعد بھی، ایک بے تعبیر خواب بنا ہوا ہے۔

اصل سبب

اس المیہ کا سبب انگریز نہیں ہیں بلکہ خود ہندستانی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ۱۹۴۷ سے پہلے اس ملک میں جو مسئلہ تھا وہ انگریزوں اور ہندستانیوں کے درمیان تھا۔ اس وقت اس مسئلہ کے حل کی صورت یہ تھی کہ ہندستانیوں کے دل میں انگریزوں کے خلاف نفرت پیدا کی جائے۔ فارمولا یہ تھا کہ ہندستانی جتنا زیادہ انگریز سے متنفر ہوں گے اتنا ہی زیادہ انگریزوں کی جڑ اس ملک سے اکھڑے گی اور وہ اس ملک میں حکومت کرنے کے مواقع کھو دیں گے۔

نفرت کی اس فضا کو پیدا کرنے کے لیے ہر قسم کے ذریعے اختیار کیے گئے۔ حتی کہ انگریزوں کے اچھے کام کو بھی بری صورت میں پیش کیا گیا۔ مثلاً انگریزوں نے بٹوارہ سے پہلے ہندستان میں ۲۵ ہزار میل لمبی ریلوے لائن بچھائی۔ اس ریلوے نظام نے پہلی بار ملک میں اِس سرے سے اُس سرے تک کے سفر کو آسان بنا دیا۔ مگر جواہر لال نہرو نے اس مثبت کام میں بھی منفی پہلو تلاش کر لیا۔ انھوں نے کہا: ریلوے کی لوہے کی پٹریاں دراصل لوہے کی زنجیریں ہیں جو انگریزوں نے اس لیے بچھائی ہیں تاکہ ہندستانیوں کو پوری طرح غلامی میں جکڑ دیں۔

اس طرح نفرتوں کے ماحول میں آزادی کا سفر طے ہوا۔ اس زمانہ میں انگریزوں کے خلاف نفرت سے بھری ہوئی تقریر کرنے پر آدمی کو لیڈری ملتی تھی۔ انگریز کے اوپر گولی چلانے سے آدمی ہیرو بن جاتا تھا۔ اس وقت انگریز دشمنی ملک دوستی کے ہم معنی بنی ہوئی تھی۔

۱۹۴۷ سے پہلے کا دور گویا تخریب کا دور تھا۔ اس زمانہ میں نفرت اور مخالفت کی سیاست بہت کارآمد ثابت ہوئی۔ ۱۹۴۷ کے بعد تعمیر کا دور آگیا۔ اب محبت کی سیاست کی اہمیت پیدا ہو گئی۔ مگر مخصوص اسباب کی بنا پر نئے دور میں بھی نفرت کی سیاست جاری رہی۔ وہ محبت کی سیاست میں تبدیل نہ ہو سکی۔ یہی سب سے بڑا سبب ہے جس کی بنا پر آزادی کے بعد وہ ہندستان نہ بن سکا جس کا خواب آزادی سے پہلے دیکھا گیا تھا۔ اور جس کے سہانے تصور میں ہر آدمی سرشار رہتا تھا۔

اکثریت و اقلیت

یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ وہ کمیونٹی جو نکسٹ ٹومیجاریٹی ہو وہ ہمیشہ مجاریٹی کی زد میں رہتی ہے۔ چھوٹی اقلیتیں آؤٹ آف فوکس ہوجاتی ہیں۔ اور پہلے اور دوسرے نمبر کی کمیونٹی ایک دوسرے کے مقابلہ پر آجاتی ہے۔ آزاد ہندستان میں یہی ہوا۔ چنانچہ آزادی کے بعد ہندو اور مسلمان دونوں ایک دوسرے کے بالمقابل ہو گئے۔ پہلے اگر ملک میں ہندستانی اور انگریز کا مسئلہ تھا تو اب ملک میں ہندو اور مسلمان کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔

مگر دونوں میں ایک فرق تھا۔ ہندستانی اور انگریز کے مسئلہ میں نفرت مطلوب تھی، جبکہ ہندو اور مسلم مسئلہ میں محبت مطلوب ہو گئی۔ پہلے اگر باہمی نفرت سے مسئلہ حل ہوتا تھا تو اب باہمی محبت مسئلہ کا حل بن گیا۔ اس نازک موڑ پر ہمارے رہنما وہ کردار ادا نہ کر سکے جو ضروری تھا۔ چنانچہ ۱۹۴۷ کے بعد بھی ملک میں نفرت کا تسلسل جاری رہا، اور مسئلہ دن بدن نازک سے نازک تر ہوتا چلا گیا۔

اس معاملہ میں جاپان کی جدید تاریخ نہایت اعلیٰ مثال پیش کرتی ہے۔ دوسری عالمی جنگ سے پہلے جاپانی قوم امریکی نفرت کی بنیاد پر اٹھی۔ اسی نفرت کے تحت جاپانیوں نے امریکہ کے بحری اڈہ پرل ہاربر پر دسمبر ۱۹۴۱ میں زبردست حملہ کیا اور اس کو تباہ کر دیا۔ اس کے بعد دونوں کے درمیان شدید جنگ جاری رہی۔ جو بالآخر ۱۹۴۵ میں جاپان کی شکست اور مغلوبیت پر ختم ہوئی۔

اب ایک صورت یہ تھی کہ امریکی نفرت کا تسلسل جاپان میں جاری رہے۔ مگر جاپان کے مدبرین نے کہا کہ اب وقت آگیا ہے کہ ہم اپنی قومی پالیسی کو نفرت کے بجائے محبت پر قائم کریں۔ انھوں نے اپنی قوم کو سمجھایا کہ امریکہ نے اگر ایٹم بم گرا کر ہمارے ہیروشیما کو برباد کیا تو ہم بھی اس سے پہلے امریکہ کے پرل ہاربر کو برباد کر چکے تھے۔ اس لیے معاملہ برابر ہو گیا۔ آؤ، اب امریکہ سے دوستی کا تعلق قائم کر کے ہم اپنے ملک میں نئے تعمیری دور کا آغاز کریں۔

نفرت کے بجائے محبت کی اس پالیسی کو انھوں نے عملِ معکوس (reverse course) کا نام دیا۔ دوسری عالمی جنگ سے پہلے جاپان جن قوموں سے ٹکراؤ کا طریقہ اختیار کیے ہوئے تھا،

اب جاپان انھیں قوموں سے موافقت کر کے آگے بڑھنے لگا۔ یہی وہ تبدیلی تھی جس کا نتیجہ آج دنیا کے سامنے اس شکل میں سامنے آیا ہے کہ جو جاپان دوسری عالمی جنگ سے شکست کھاکر نکلا تھا، اس کو آج یہ موقع مل رہا ہے کہ وہ فاتح کے روپ میں دنیا کے سامنے نمایاں ہوسکے۔

آزادی کے بعد ہندستان میں بھی اسی قسم کے عمل معکوس کی ضرورت تھی۔ اب ضرورت تھی کہ اس ملک میں نفرت کے بجائے محبت کی ہوائیں چلائی جائیں۔ مگر ہمارے لیڈر بروقت یہ کام نہ کر سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں نفرت کا تسلسل جاری رہا۔ ملک تعمیر کے رخ پر سفر نہ کرسکا۔ آزاد ہندستان جلد ہی برباد ہندستان کے ہم معنی بن گیا۔

جاپان نے اپنے بیرونی دشمن امریکہ سے نفرت کو چھوڑ کر محبت کا طریقہ اختیار کیا تھا، ہندستان میں یہی کام ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ہونا تھا۔ یہاں بٹوارہ کی تحریک کے دوران دونوں ایک دوسرے کے رقیب اور حریف بن گئے تھے۔ اب ضرورت تھی کہ دونوں کے اندر یہ ذہن پیدا کیا جائے کہ وہ ایک دوسرے کے وطنی بھائی ہیں۔ وہ ہر معاملہ میں ایک دوسرے کے شریک اور دوست ہیں۔

۱۹۴۷ سے پہلے کچھ نادان مسلم لیڈروں نے غلط طور پر یہ ذہن بنایا تھا کہ ہندو اور مسلم دو الگ الگ قومیں ہیں۔ اس نظریہ نے دونوں میں دوری پیدا کر دی۔ مگر اس نظریہ کا تعلق نہ عقل سے تھا اور نہ اسلام سے۔ کیونکہ قوم وطن سے بنتی ہے نہ کہ مذہب سے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا مذہب بلاشبہ الگ ہے۔ مگر دونوں ایک قوم ہیں، کیوں کہ دونوں ایک مشترک وطن میں رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام پیغمبروں نے اپنے غیر مذہب مخاطبین کو یاقوم (اے میری قوم) کہہ کر خطاب کیا۔ مگر ۱۹۴۷ کے بعد طاقت ور انداز میں اس فکر کی اشاعت نہ کی جا سکی۔

جہاں تک میرے مطالعہ کا تعلق ہے، میرا خیال ہے کہ اس معاملہ میں ہندو اور مسلمان دونوں برابر کے ذمہ دار ہیں۔ دونوں میں سے کسی نے بھی نئے ہندستان میں اپنی ذمہ داری کو پورا نہیں کیا۔ قوموں کا ذہین طبقہ قوموں کو رہنمائی دیتا ہے۔ مگر آزاد ہندستان میں

دونوں ہی فرقے کے ذہین طبقے اس اعتبار سے ناکام ہو گئے۔

ہندوؤں میں ان کے مصنوعی دانشور (pseudo-intellectuals) اٹھے۔ انھوں نے فرسٹ ڈیفیٹ اور سکنڈ ڈیفیٹ کا نظریہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہندو اکھنڈ بھارت بنانا چاہتے تھے، اور مسلمان تقسیم کا مطالبہ کر رہے تھے۔ مگر اس معاملہ میں ہندوؤں کو شکست تسلیم کرنی پڑی۔ یہ ان کے لیے پہلی ہار (فرسٹ ڈیفیٹ) تھی۔ اب ہندو اکثریت میں ہیں اور غالب حیثیت رکھتے ہیں، اس لیے ہمیں کسی قیمت پر دوسری ہار (سکنڈ ڈیفیٹ) کو تسلیم نہیں کرنا چاہیے۔

یہ بات مختلف الفاظ میں اتنے زور کے ساتھ کہی گئی کہ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر بیشتر ہندوؤں کے ذہن پر چھا گئی۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی نزاع پیش آئے تو ہندو فوراً اس کو سکنڈ ڈیفیٹ کا مسئلہ سمجھ لیتے ہیں۔ مثلاً ہندو جلوس اگر مسلم محلہ سے گزرے اور مسلمان کسی وجہ سے روٹ بدلنے کے لیے کہیں تو ہندو اس مطالبہ کو نہیں مانیں گے۔ کیوں کہ مذکورہ نفسیات کی بنا پر اس میں انھیں سکنڈ ڈیفیٹ نظر آنے لگتی ہے۔ اس نفسیات کی بنا پر ہندوؤں کی طاقت کا بڑا حصہ صرف منفی کارروائیوں میں لگا ہوا ہے، وہ ملک کی مثبت تعمیر میں استعمال نہ ہو سکا۔ سکنڈ ڈیفیٹ سے بچنے کی کوشش میں وہ مکمل ڈیفیٹ سے دوچار ہو رہے ہیں۔

مولانا حفظ الرحمن صاحب (۱۹۶۲-۱۹۰۱) نے ایک بار کہا تھا کہ انڈیا کو میں سیکولر ملک اس وقت مانوں گا جب کہ سڑک پر ایک مسلمان ایک ہندو کو تھپڑ مارے اور شہر میں فرقہ وارانہ فساد نہ ہو۔ ہر بار جب کوئی فرقہ وارانہ فساد ہوتا ہے تو اسی طرح کے کسی معمولی واقعہ کی بنا پر ہوتا ہے۔ ایسا ہر واقعہ اصلاً صرف دو فرد کا واقعہ ہے، اور دو فرد کے مسئلہ کی حیثیت سے اس کو حل کرنا چاہیے۔ مگر جب بھی ایسا کوئی واقعہ ہوتا ہے تو فوراً وہ دو فرقوں کے وقار کا مسئلہ بن جاتا ہے جو بڑھ کر خونیں فساد تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ تمام تر اسی مذکورہ نفسیات کا نتیجہ ہے۔

ہندو اگر بٹوارہ کو فرسٹ ڈیفیٹ کے طور پر نہ لیتے بلکہ گزرے ہوئے دور کا ایک

واقعہ سمجھ کر اس کو ماضی کی تاریخ کے خانہ میں ڈال دیتے تو ۱۹۴۷ سے اسی طرح ملک کی نئی تاریخ بننا شروع ہو جاتی جس طرح عین اسی زمانہ میں جاپان میں نئی تاریخ بننا شروع ہوئی تھی مگر فرسٹ ڈیفیٹ اور سکنڈ ڈیفیٹ کے فلسفہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ امکان واقعہ کی صورت اختیار نہ کر سکا۔

اقلیت کے مسئلہ کے حل کے لیے ہندو رہناؤں نے جو تدبیر سوچی وہ بظاہر اگرچہ مختلف الفاظ میں تھی، مگر سب کی تدبیر عملاً وہی تھی جس کو ان کا ایک حلقہ ہندوتو یا انڈینائزیشن سے تعبیر کرتا ہے۔ اس تدبیر کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندستان سے کلچر کے اختلاف کو ختم کر کے پورے ملک کا ایک کلچر بنا دیا جائے۔ اس کو وہ فرقہ وارانہ یک جہتی یا ملکی اتحاد کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس طرح اقلیت کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔

یہ تجویز بظاہر کتنی ہی خوب صورت ہو، وہ یقینی طور پر ناقابل عمل ہے۔ سب سے پہلے شہنشاہ اکبر نے اس کو ملک میں رائج کرنا چاہا مگر غیر معمولی سیاسی طاقت کے باوجود وہ ناکام رہا۔ ڈاکٹر بھگوان داس نے ۳۰ سال محنت کر کے اپنی کتاب (Essential Unity of All Religions) تیار کی۔ مگر اپنے مقصد میں وہ کسی بھی درجہ میں کارگر ثابت نہ ہو سکی۔ مہاتما گاندھی بھی "رام رحیم ایک ہے" کے عنوان سے اسی کے مبلغ تھے مگر انھیں بھی اس سلسلہ میں کوئی قابل ذکر کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

امریکہ (U.S.A) میں بھی مختلف کلچر کے لوگ آباد ہیں۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد امریکہ میں وہ تحریک چلی جس کو عام طور پر امریکنائزیشن کہا جاتا ہے۔ اس کا مقصد امریکہ میں یونی کلچر کو فروغ دینا تھا۔ مگر یہ تحریک امریکہ میں مکمل طور پر ناکام ہو گئی۔ اور اب وہاں یونی کلچرلزم کے بجائے ملٹی کلچرلزم کے اصول کو اختیار کر لیا گیا ہے۔ یعنی ایک کلچر نہیں بلکہ کئی کلچر۔

نتیجہ کے اعتبار سے دیکھئے تو اس معاملہ میں ہمارے لیے انتخاب (choice) یونی کلچر اور ملٹی کلچر میں نہیں ہے، بلکہ ملٹی کلچر اور تباہی میں ہے۔ اگر ہم یونی کلچر کے طریقہ پر اصرار کریں تو جو چیز عملاً حاصل ہوگی وہ یونی کلچر نہ ہوگا بلکہ برباد کلچر ہوگا۔ اس لیے بہترین عقلمندی یہ ہے کہ ہم رواداری (ٹالرنس) کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے ملٹی کلچر کے طریقہ پر راضی ہو جائیں۔ نہ کہ یونی کلچر کے طریقہ پر اصرار کر کے ملک کو تباہ کر دیں۔

اب مسلمانوں کے معاملہ کو لیجئے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے مسلمانوں نے ملک کے بٹوارہ کی تحریک چلائی۔ ہندوؤوں نے اس کی مخالفت کی۔ اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے اندر ہندوؤوں کے بارہ میں شکوک پیدا ہو گئے۔ جو تقسیم کے بعد بھی ختم نہ ہو سکے۔ مزید یہ کہ تقسیم کے ساتھ ہی مسلمانوں میں بھی مصنوعی دانش ور (pseudo-intellectuals) اٹھے۔ انھوں نے مختلف انداز میں مسلمانوں کے اندر اس قسم کے خیالات پھیلائے کہ ہندو منقسم ہندستان میں " دوسرا اسپین" بنانا چاہتا ہے۔ یہ فکر ایک یا دوسرے لفظ میں اتنا زیادہ عام ہوا کہ وہ مسلمانوں کی نفسیات کا جزء بن گیا۔

اب یہ صورت حال ہے کہ جب بھی ہندو کی طرف سے کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش آتا ہے۔ مثلاً وہ مسلم علاقہ میں جلوس نکالتا ہے۔ یا کچھ نادان ہندو اٹھ کر مسلم مخالف نعرہ لگا دیتے ہیں تو فوراً مسلمانوں کے اندر یہ احساس جاگ اٹھتا ہے کہ ہندو یہاں سکنڈ اسپین بنانا چاہتے ہیں۔ اس دفاعی نفسیات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ فوراً ہندو کے ساتھ مقابلہ آرائی کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اب دو طرفہ ردعمل شروع ہوتا ہے جو فضا کو اس حد تک بگاڑ دیتا ہے کہ فساد کی نوبت آجاتی ہے۔

ایک "سکنڈ" کا اندیشہ ہندوؤوں کو منفی نفسیات میں مبتلا کیے ہوئے ہے اور دوسرے "سکنڈ" کے اندیشہ نے مسلمانوں کو منفی نفسیات میں مبتلا کر رکھا ہے۔ یہی اس ملک میں ہندو مسلم مسئلہ کا خلاصہ ہے۔ اس طرح دونوں ہی فرقے اس سے محروم ہو گئے ہیں کہ وہ ملک کی تعمیر میں مطلوبہ مثبت کردار ادا کر سکیں۔

اس طرح کے پیچیدہ مسائل کا حل کبھی دو طرفہ بنیاد پر نہیں نکلتا۔ اور یہی یہاں بھی ہوگا۔ اس کا حل جب بھی نکلے گا یک طرفہ بنیاد پر نکلے گا۔ اس مسئلہ کا حل بائی لیٹرلزم میں نہیں ہے بلکہ یونی لیٹرلزم میں ہے۔ ملک کے وسیع تر مفاد کے لیے کسی ایک فرقہ کو اقدام کرنا ہوگا۔ اگر ہم یہ انتظار کریں کہ پچاس فی صد اور پچاس فی صد کی بنیاد پر دونوں فرقے ذمہ داری قبول کرلیں اور اس طرح دو طرفہ بنیاد پر مسئلہ کو حل کریں تو ایسا انتظار کبھی واقعہ بننے والا نہیں۔ تاریخی واقعات اور انسانی نفسیات دونوں ایسے کسی امکان کا یکسر انکار کرتے ہیں۔

ان حالات میں میں مسلمانوں کو مشورہ دوں گا کہ وہ اس معاملہ میں پہل کریں اور یک طرفہ فیصلہ کے ذریعہ تمام باہمی جھگڑوں کو ختم کر دیں۔ وہ نہ ہندو جلوس کی روٹ بدلنے کا مطالبہ کریں۔ نہ مسلم مخالف نعروں پر مشتعل ہوں۔ نہ سروسوں میں کم لیے جانے کی شکایت کریں۔ نہ اُردو اور پرسنل لا اور مسلم یونی ورسٹی جیسے مسائل پر مطالباتی تحریکیں اٹھائیں۔ غرض ہر معاملہ میں شکایت اور احتجاج اور ردعمل کا طریقہ چھوڑ دیں۔ وہ خارجی احتجاج کی بنیاد پر تحریکیں چلانے کے بجائے داخلی تعمیر کی بنیاد پر اپنی تمام تحریکیں چلائیں۔

مسلمان اگر اس یک طرفہ اصول پر عمل کریں تو یہ ان کے لیے نہ صرف عملِ معکوس (reverse course) کے مجرب طریقہ کو اختیار کرنے کے ہم معنی ہوگا، بلکہ یہ ان کے لیے عین ثواب کی بات بھی ہوگی۔ کیوں کہ یک طرفہ صبر پیغمبر اسلام کی سنتوں میں سب سے بڑی سنت ہے۔

مکہ سے ہجرت یک طرفہ صبر کی کارروائی تھی۔ حدیبیہ سے عمرہ کیے بغیر واپسی بھی اسی یک طرفہ صبر کے اصول پر عمل کرنا تھا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ یک طرفہ اقدام کے ذریعہ نزاعی مسائل کو حل کیا۔ آج اگر مسلمان اس اصول پر عمل کریں تو یہ سنتِ رسول کی پیروی ہوگی اور اس بنا پر عظیم ثواب حاصل کرنے کا ذریعہ بھی۔

یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ بے حد اہم بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آزادی کے بعد مسلمان اس ملک میں نہایت اہم تخلیقی کردار (creative role) ادا کرنے کی حیثیت میں تھے۔ ان کے حق میں تمام ضروری حالات جمع ہو چکے تھے۔ مگر مسلمان صبر کا ثبوت نہ دے سکے، اس لیے یہ تخلیقی کردار ادا کرنا بھی ان کے لیے مقدر نہ ہو سکا۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ ان کو ہم نے امام بنایا کہ وہ لوگوں کو امرِ حق کی ہدایت کرتے تھے، یہ اس وقت ہوا جب کہ انھوں نے صبر کیا (وجعلنا منهم أئمة يهدون بأمرنا لما صبروا) اس دنیا میں قیادت و امامت کی واحد قیمت صبر ہے، مسلمانوں نے صبر کی قیمت ادا نہیں کی، اس لیے وہ نئے ہندستان میں امام اور قائد کا منصب بھی حاصل نہ کر سکے۔

ہندستان اور مسلمان

اولاً ہندستان میں وہ مسلمان آئے جو عرب نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے اعلیٰ اوصاف کی بنا پر ہندستان میں ان کا استقبال کیا گیا۔ جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب ڈسکوری آف انڈیا میں لکھا ہے کہ یہ عرب جب ہندستان آئے تو اپنے ساتھ شاندار کلچر (brilliant culture) لے کر یہاں آئے (ڈسکوری آف انڈیا، اڈیشن ۱۹۹۱، صفحہ ۲۲۷)

بعد کے دور میں ہندستان میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی۔ یہ حکمراں اگرچہ قدیم عربوں جیسی اعلیٰ صفات کے حامل نہ تھے۔ تاہم ان سے بھی ہندستان کو امن اور انصاف کا تحفہ ملا۔ اسلامی انقلاب کا سیلاب اتنا طاقت ور تھا کہ سیکڑوں سال بعد بھی اس کے اثرات مسلم نسلوں کے ذہن پر باقی تھے۔

مثلاً مغل بادشاہ جہانگیر کے زمانہ حکومت میں اس کی ملکہ نور جہاں نے ایک راہ گیر کو طپنچہ مار کر ہلاک کر دیا۔ مقدمہ جہانگیر کے دربار میں پیش ہوا تو شبلی نعمانی کے الفاظ میں :

مفتی شرع نے بے خوف وخطر صاف کہا شرع کہتی ہے کہ قاتل کی اڑادو گردن

جہانگیر اور اس کی ملکہ کو یہ ہمت نہ ہوسکی کہ وہ مفتی کے اس فتوے کا انکار کر دیں۔ دوسری طرف عین اسی زمانہ میں انگلینڈ میں جیمز فرسٹ کی حکومت تھی جو جہانگیر کا ہم عصر تھا جسٹس کوک نے ایک مالی مقدمہ میں ایک تاجر کے حق میں فیصلہ دیا۔ یہ فیصلہ جیمز فرسٹ کو اپنے خلاف معلوم ہوا۔ اس پر وہ جسٹس کوک سے خفا ہوگیا اور جسٹس کی حیثیت سے ان کا عہدہ ختم کر دیا۔

اس کے بعد وہ دور آیا جب کہ ہندستان میں انگریزوں کو غلبہ حاصل ہوا۔ انھوں نے یہاں اپنی حکومت قائم کر لی۔ اب ملک میں آزادی کی تحریک اٹھی۔ اس تحریک میں مسلمانوں نے اہم کردار ادا کیا۔ اس تحریک کے لیے جان و مال کی قربانی کی ضرورت تھی۔ اس میں اپنے آپ کو فنا کرنا تھا۔ اس میں مسلمانوں نے عملی حصہ لیا۔ مزید یہ کہ مسلمانوں کے یہاں جہاد کا تصور تھا۔ جب کہ ہندو بھائیوں کے یہاں اس قسم کا کوئی سرفروشی کا تصور موجود نہ تھا۔ مسلمانوں نے آزادی کی تحریک میں جہاد کا تصور شامل کر کے اس کو نہایت جاندار بنا دیا۔

وطنی آزادی کی تحریک کے لیے جہاد آزادی، مجاہد آزادی، شہید آزادی جیسے ولولہ انگیز

الفاظ مسلمانوں ہی نے دیے۔ اور بلاشبہ یہ تحریک آزادی میں مسلمانوں کا ایک تخلیقی عطیہ ہے جس کے بغیر تحریکِ آزادی مکمل نہ ہوتی۔

۱۹۴۷ کے بعد وہ دور آیا جب کہ ملک آزاد ہوگیا۔ مگر اس نئے دور میں ہندستانی مسلمانوں کو بروقت صحیح رہ نمائی نہ مل سکی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ حالات کا شکار ہو کر رہ گئے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے وہ اس ملک میں دینے والے گروہ (giver group) کی حیثیت رکھتے تھے۔ مگر ۱۹۴۷ کے بعد اس ملک میں وہ لینے والے گروہ (taker group) کی حیثیت اختیار کر گئے۔ یہی جدید ہندستان میں مسلمانوں کا سب سے بڑا المیہ ہے۔

۱۹۴۷ سے پہلے ہر دور میں مسلمانوں کو عزت و احترام کا درجہ حاصل تھا۔ مگر ۱۹۴۷ کے بعد آنے والے دور میں انھیں عزت و احترام کا درجہ حاصل نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ کوئی سازش یا تعصب نہیں ہے۔ اس کی وجہ خود مسلمانوں کی یہ داخلی کمزوری ہے کہ انھوں نے جدید دور میں پہنچ کر تخلیقیت (creativity) کھودی۔ وہ اہلِ ملک کے لیے دوبارہ نفع بخش ثابت نہ ہو سکے۔ جب کہ قرآن کے مطابق، اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ اس دنیا میں اسی کو ثبات اور استحکام حاصل ہوتا ہے جو دوسروں کے لیے نفع بخشی کا ثبوت دے (الرعد ۱۷)

نئے ہندستان میں مسلمانوں کے لیے اس نفع بخشی کا موقع مزید اضافہ کے ساتھ موجود ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ ان مواقع کو سمجھا جائے، اور ضروری تقاضوں کی رعایت کرتے ہوئے انھیں استعمال کیا جائے۔ یہاں اس معاملہ کی وضاحت کے لیے میں دو مثالیں دوں گا۔

آزادی سے پہلے اس ملک کے مفکرین یہ سوچتے رہتے تھے کہ جب آزادی آئے گی تو اس کا نقشہ کیا ہوگا۔ اور آزاد ہندستان کی تعمیر کس طرح کی جائے گی۔ اس سلسلہ میں غالباً پہلا قابلِ ذکر نام سوامی ویویکانند کا ہے۔ انھوں نے ۱۸۹۸ میں ایک خط کے جواب میں لکھا تھا کہ ہماری مادرِ وطن کے لیے دو عظیم نظاموں، ہندوازم اور اسلام کا ملاپ واحد امید ہے۔ میں اپنے دماغ کی آنکھ سے دیکھتا ہوں کہ مستقبل کا معیاری ہندستان انتشار اور خرابیوں سے باعظمت اور ناقابلِ تسخیر بن کر اٹھ رہا ہے، اور یہ ویدانت برین اور اسلام باڈی کے ذریعہ ہو رہا ہے :

For our own motherland a junction of the two great systems, Hinduism and Islam, is the only hope. I see in my mind's eye the future perfect India rising out of this choas and strife, glorious and invincible, with Vedanta brain and Islam body. (p. 380)

دوسری مثال مہاتما گاندھی کی ہے۔ ۱۹۳۶ میں پہلی بار ایسا ہوا کہ مختلف صوبوں میں کانگرس کی وزارتیں بنیں۔ اس کے بعد مہاتما گاندھی نے اپنے اخبار ہریجن (۲۷ جولائی ۱۹۳۷) میں کانگرسی وزیروں کو سادہ زندگی اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ انھوں نے لکھا کہ اس سلسلہ میں عملی نمونہ کے لیے میں رام اور کرشن کا نام نہیں لے سکتا۔ کیوں کہ وہ تاریخی شخصیتیں (historic personalities) نہ تھیں۔ میں مجبور ہوں کہ دور اول کے اسلامی خلفاء کا حوالہ دوں۔ کیوں کہ تاریخ بتاتی ہے کہ وہ بہت بڑی سلطنت کے حاکم تھے مگر انھوں نے فقیروں جیسی زندگی گزاری، انھوں نے کہا کہ ہم کو ابوبکر اور عمر کے نمونہ کی پیروی کرنا چاہیے :

We have to follow the example of Abu Bakr and Umar.

سوامی ویویکانند اور مہاتما گاندھی کے مذکورہ اقتباسات بتاتے ہیں کہ آزاد ہندستان میں مسلمانوں کے لیے ایک عظیم کردار ادا کرنے کا موقع تھا۔ حتی کہ خود ملک اس بات کا منتظر تھا کہ مسلمان آگے بڑھیں اور یہ کردار ادا کرکے ملک میں اپنے لیے باعزت جگہ حاصل کریں۔ مگر مسلمان ملک کی ان امیدوں کو پورا نہ کر سکے۔ اور ساتھ ہی ملک کے مستقبل کی تعمیر بھی واقعہ نہ بن سکی۔

آزادی کے بعد ملک کی نئی تعمیر کے لیے دو چیزوں کی ضرورت تھی۔ ایک اقدار (values) اور دوسرے ان اقدار کے حق میں عملی نمونہ۔ مثلاً ایک قدر یہ ہے کہ حکمراں افراد کو بھی عام لوگوں کی طرح معمولی زندگی گزارنا چاہیے تاکہ انھیں عام انسان کی ضرورتوں کا احساس رہے۔ ایک قدر یہ ہے کہ ایک بڑے آدمی کو بھی اسی طرح قانون کا ماتحت ہونا چاہیے جس طرح ایک چھوٹا آدمی۔ ایک قدر یہ ہے کہ ہر انسان کو سماج میں برابر کا درجہ ملنا چاہیے، خواہ وہ ایک نسل سے تعلق رکھتا ہو یا دوسری نسل سے۔ ایک قدر یہ ہے کہ عہدہ اور منصب لیاقت کی بنیاد پر ملنا چاہیے نہ کہ ذاتی شرف کی بنیاد پر۔ وغیرہ، وغیرہ۔

سوامی ویویکانند اور مہاتما گاندھی اور دوسرے ہندستانی مفکرین کا خیال تھا کہ ان

اقدار کا تصور تو ہمارے پاس موجود ہے۔ مگر ان اقدار کے حق میں عملی اور تاریخی نمونہ ہمارے یہاں موجود نہیں۔ یہ عملی نمونہ تمام مذاہب میں صرف اسلام میں پایا جاتا ہے۔ اس لیے ملک کی نئی تشکیل کے لیے اسلام سے مدد لینا ضروری ہے۔

یہ نہایت صحیح اور مثبت سوچ تھی۔ مگر اس سوچ کو واقعہ بنانے کے لیے مسلمانوں کو بھی اس ملک میں ایک کردار ادا کرنا تھا۔ مسلمان بدقسمتی سے یہ کردار ادا نہ کر سکے۔ اس لیے یہ سوچ بھی واقعہ بننے سے رہ گئی۔ آزادی کے بعد ہمارا ملک بھٹک کر دوسرے راستہ پر چل پڑا۔

نام نہاد مسلم دانشور اس کے جواب میں کہیں گے کہ اس میں قصور مسلمانوں کا نہیں ہے بلکہ خود ہندوؤں کا ہے۔ تقسیم کے بعد اس ملک میں مسلمانوں کو مسلسل تعصب اور زیادتی کا سامنا پیش آیا۔ اس بنا پر مسلمان تحفظ اور دفاع کی نفسیات میں مبتلا ہو گئے۔ اور جو لوگ تحفظ اور دفاع کی نفسیات میں مبتلا ہو جائیں وہ کوئی تخلیقی کردار ادا کرنے کے قابل نہیں رہتے۔

مگر یہ جواب درست نہیں۔ مسلمانوں کو جس بات کی شکایت ہے، وہ تو دراصل وہ قیمت تھی جو مسلمانوں کو اس ملک میں ادا کرنا تھا۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو امام ہدایت بناتا ہے جو صبر کا ثبوت دیں (وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا)

اس سے معلوم ہوا کہ صبر ہی قیادت و امامت کی لازمی قیمت ہے۔ کسی ملک یا قوم میں قیادت و امامت کی ذمہ داری ادا کرنے کی ناگزیر شرط یہ ہے کہ دوسروں کی طرف سے پیش آنے والی زیادتیوں کو یک طرفہ طور پر برداشت کیا جائے۔ اس صبر و برداشت کے بغیر کسی کو امامت عالم کا مقام نہیں ملتا۔ یہ اللہ کا ایک محکم قانون ہے، اس میں کسی کا بھی کوئی استثنا نہیں۔

۱۹۴۷ کے بعد ہندستان میں مسلمانوں کو جو کام کرنا تھا وہ یہ تھا کہ برادران وطن کی طرف سے اگر کوئی اشتعال انگیز بات کی جائے تو اس کو نظر انداز کریں۔ سروسوں میں اگر تعصب برتا جائے تو برداشت کر لیں۔ حتیٰ کہ عملی زیادتی کے واقعات پیش آئیں تب بھی اس پر صبر کر لیں۔ ہر حال میں وہ یک طرفہ اعراض کی پالیسی اختیار کریں۔

یہ مسلمانوں کے لیے وقفۂ عمل حاصل کرنے کی تدبیر تھی، اس طرح وہ اپنے ذہن کو منفی رخ پر جانے سے روکتے۔ وہ ایسی فرصت پا لیتے جب کہ وہ مثبت طور پر لوگوں کے سامنے

اسلام کی ان تعلیمات کو اور اس تاریخ کو لاسکیں جس میں ملک کی رہنمائی ہے۔ اور جس کو اختیار کرکے ملک میں صالح معاشرہ کی تعمیر کی جاسکتی ہے۔ حتیٰ کہ خود ملک ایک صدی سے جس کا انتظار کر رہا ہے۔ مسلمان صبر نہ کر سکے اس لیے وہ اس قسم کا قیادتی رول ادا کرنے میں ناکام رہے۔

کرنے کا کام

اسلام فطرتِ انسانی کا مذہب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کو مختلف قوموں میں پھیلنے کے لیے کسی پھیلانے والے کی ضرورت نہیں۔ وہ خود اپنے زور پر پھیلتا ہے، جس طرح پانی خود اپنے زور پر پیاسے تک پہنچتا ہے، ٹھیک اسی طرح اسلام خود اپنے زور پر لوگوں کے دلوں میں داخل ہوتا ہے۔

مزید یہ کہ اسلام کوئی نیا مذہب نہیں۔ لمبی تاریخ نے اس کو ایک ثابت شدہ صداقت بنادیا ہے۔ اسلام آج ایک معلوم اور مسلّم مذہب ہے نہ کہ کوئی غیر معروف یا نزاعی مذہب۔ یہ ایسی خصوصیت ہے جس نے اسلام کو یہ طاقت دے دی ہے کہ کوئی اس کو پھیلانے والا نہ ہو تب بھی وہ پھیلتا ہے، کوئی اس کا اعلان کرنے والا نہ ہو تب بھی وہ لوگوں کے کانوں میں گونجتا ہے۔

اسلام کی اس خصوصیت کا تقاضا تھا کہ اسلام اس ملک کے لوگوں کے قلب و دماغ میں اتر چکا ہوتا۔ ماضی میں بتدریج ایسا ہو بھی رہا تھا۔ مگر حالیہ تاریخ میں دو واقعات نے اس فطری عمل پر روک لگادیا۔ ایک ہے، دو قومی نظریہ، اور دوسرا ہے مسلمانوں کی احتجاجی سیاست۔

تقسیم سے پہلے کچھ مسلم لیڈروں نے دو قومی نظریہ ایجاد کیا۔ اس نظریہ کے غیر اسلامی ہونے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ اس کو علماء نے پیش نہیں کیا۔ تاہم بعض اسباب کے نتیجہ میں وہ عوام میں پھیل گیا۔ حتیٰ کہ اس نے ایک پرشور تحریک کی صورت اختیار کرلی۔ یہ دو قومی نظریہ اسلام کی عمومی اشاعت کے لیے قاتل تھا۔ کیوں کہ جب یہ ماحول بنا دیا جائے کہ اہلِ اسلام مستقل طور پر الگ قوم ہیں اور غیر اہلِ اسلام مستقل طور پر الگ قوم، تو غیر مسلم قوموں میں اسلام کو اپنانے کا احساس ہی سرے سے ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اسلام لوگوں کے نزدیک عقیدۂ غیر بن جاتا ہے نہ کہ عقیدۂ خویش۔

۱۹۴۷ میں دو قومی سیاست کو ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ مگر مسلمانوں کے کچھ نادان لیڈروں کی سطحی سیاست کے نتیجہ میں وہ باقی رہی۔ مزید یہ کہ ۱۹۴۷ کے بعد کے حالات نے مسلمانوں کے اندر شدت سے منفی ذہن پیدا کیا۔ وہ اہل وطن کے مقابلہ میں احتجاجی سیاست کا جھنڈا لے کر کھڑے ہو گئے۔ اس کے نتیجہ میں دوبارہ ماحول میں تلخی کے اسباب پیدا ہو گئے۔ اسلام سنجیدہ غور و فکر کا موضوع نہ بن سکا۔

اب مسلمانوں پر فرض کے درجہ میں ضروری ہے کہ وہ دو قومی نظریہ سے اپنے ذہن کو آزاد کر لیں اور ہر اس سرگرمی سے مکمل طور پر اجتناب کریں جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تناؤ پیدا کرنے والی ہو، وہ یک طرفہ اہتمام کے ذریعہ دونوں فرقوں کے درمیان معتدل فضا پیدا کریں۔

۱۔ اس جائزہ کی روشنی میں مسلمانوں کے لیے پہلا ضروری کام یہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ہندو مسلم ملاپ کی صورتیں پیدا کریں۔ وہ ہر اس سرگرمی سے آخری حد تک پرہیز کریں جو ہندو مسلم تعلقات کو بگاڑنے والی ہو۔ وہ فریق ثانی کی طرف سے پیش آنے والی ہر زیادتی کو یک طرفہ طور پر برداشت کریں۔

یہ اس لیے ضروری ہے تاکہ دونوں فرقوں کے درمیان وہ معتدل فضا پیدا ہو جس میں لوگ اسلام کا مطالعہ کریں۔ جس میں اسلام کے پیغام کو لوگوں کے سامنے لایا جائے۔ اور وہ اس پر سنجیدہ ذہن کے ساتھ غور کر سکیں۔

اگر مسلمان ایسا کریں کہ وہ فرقہ وارانہ اختلاف کے معاملہ میں یک طرفہ اعراض کی پالیسی اختیار کر لیں اور ہر اس قول یا فعل سے مکمل پرہیز کریں جو فرقہ وارانہ منافرت پیدا کرنے والا ہو تو اس کے بعد اپنے آپ یہ ہوگا کہ جس طرح ملک کی صنعتی تعمیر کے لیے مغربی سائنس یہاں مطالعہ کا موضوع بنی ہوئی ہے اسی طرح اسلام بھی یہاں سماجی تعمیر کے لیے مطالعہ اور غور و فکر کا موضوع بن جائے گا، اور پھر اپنے آپ ملک میں ایک نئی تاریخ بننا شروع ہو جائے گی۔

۲۔ مذکورہ عمل اس ملک میں اسلام کی اشاعت کے لیے شرط اول کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی کے ساتھ کچھ اور مددگار اعمال کی بھی ضرورت ہے۔ مثلاً مسلمان ملک کی زبان کو سیکھیں اور

ہر زبان میں اظہار خیال کی قدرت پیدا کریں۔ مسلمانوں نے چالیس سال تک اس ملک میں "تحفظ اردو" تحریک چلائی ہے۔ اس کے بجائے انھیں مسلمانوں میں یہ تحریک چلانی چاہیے تھی کہ مسلمان ہر زبان کو سیکھیں۔ ہر علاقہ کے لوگ اُس علاقہ کی زبان میں مہارت حاصل کریں۔ اردو تحفظ کی تحریک موجودہ حالات میں سمٹاؤ کی علامت ہے، اور تمام ملکی زبانوں کو سیکھنے کی تحریک پھیلاؤ کی علامت۔

۳۔ اس کے بعد جو ضروری کام کرنا تھا وہ یہ تھا کہ ملک کی ہر زبان میں قرآن کا ترجمہ معمولی قیمت پر فراہم کیا جائے۔ اس کے علاوہ حدیث اور سیرت کی بنیادی کتابوں کے ترجمے ہر زبان میں تیار کرکے شائع کیے جائیں۔ یہ کام اتنے بڑے پیمانہ پر کیا جائے کہ ہر شخص جو اسلام کی تعلیمات اور اس کی تاریخ کو جاننا چاہے اس کو خود اپنی مادری زبان میں کافی لٹریچر بہ آسانی حاصل ہو جائے۔

۴۔ اسلامی تاریخ کے ان پہلوؤں پر کتابیں تیار کرکے پھیلائی جائیں جو موجودہ حالات سے خاص طور پر مناسبت رکھتے ہیں مثلاً مساوات، انصاف، احترام انسانیت وغیرہ۔

خلیفہ اول ابو بکر صدیق نے پوری عمر نہایت سادہ زندگی گزاری۔ حتیٰ کہ مدینہ کے ایک عام آدمی کی زندگی میں اور آپ کی زندگی میں کوئی فرق نہ تھا۔ مصر کے گورنر عمرو بن العاص کے لڑکے نے ایک عام آدمی کو کوڑا مارا۔ خلیفہ عمر فاروق کو اس کی شکایت پہنچی تو انھوں نے گورنر کے صاحبزادے کو بلایا اور مذکورہ مصری کے ہاتھ میں کوڑا دیا کہ ان کو مار کر اپنی زیادتی کا بدلہ لو۔ خلیفہ چہارم علی بن ابی طالب اور ایک یہودی تاجر کے درمیان دمشق میں ایک قضیہ پیش آیا تو خلیفہ کو ایک عام شہری کی حیثیت سے عدالت میں حاضر ہونا پڑا۔ حضرت عمر بن عبد العزیز کی حکومت سندھ سے لے کر فرانس کی سرحد تک پھیلی ہوئی تھی مگر ان کے لیے کسی قسم کی سیکورٹی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ مکہ فتح ہوا تو کعبہ کے اوپر کھڑے ہو کر اذان دینے کا کام بلال کو سپرد ہوا جو ایک حبشی غلام تھے۔ وغیرہ، وغیرہ۔

اسلام کی تاریخ میں تمام اعلیٰ معاشرتی قدروں کی معیاری مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً انصاف، سادگی، تواضع، مساوات، اور امانت دارانہ معاملہ، وغیرہ۔ یہ چیزیں جن پر بہتر سماجی

نظام قائم ہوتا ہے ، ان تمام قدروں کی عملی مثالیں حقیقی واقعات کی صورت میں اسلام کی تاریخ میں محفوظ ہیں۔ ضرورت تھی کہ ان کو خالص تاریخی اسلوب اور حقیقت نگاری کے انداز میں مرتب کرکے اہل ملک کے سامنے لایا جائے اور اس سے لوگوں کو باخبر کیا جائے۔ مگر یہ کام نہ ہو سکا۔ اگر کسی نے کوئی کتاب لکھی بھی ہے تو وہ قومی فخر کے انداز میں ہے نہ کہ بے لاگ واقعہ نگاری کے انداز میں۔

موجودہ مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ نئے دور میں منفی ذہن لے کر داخل ہوئے۔ وہ مثبت ذہن کے تحت نئے دور میں داخل نہ ہو سکے۔ یہی موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے مسئلہ کا آغاز بھی ہے اور یہی اس کا اختتام بھی۔ اسی سے نئے دور میں ان کی تاریخ بگڑی ہے اور یہیں سے از سر نو ان کی تاریخ بننا شروع ہوگی۔

ہندستان کے مسلم قائدین، ۱۹۴۷ سے پہلے ۱۴ پوائنٹ پر مشتمل مطالبے پیش کرتے رہے۔ اور، ۱۹۴۷ کے بعد وہ ۲۰ پوائنٹ پر مشتمل اپنے مطالبے پیش کر رہے ہیں۔ بالفاظ دیگر، وہ اس ملک میں مسلسل مانگنے والے بنے ہوئے ہیں۔ اور تاریخ کا یہ فیصلہ ہے کہ کوئی شخص یا قوم بیک وقت دینے والا اور مانگنے والا نہیں بن سکتا۔ مسلمان چونکہ مانگنے والے بنے ہوئے ہیں، اس لیے وہ اس ملک میں دینے والے بھی نہ بن سکے۔

نوٹ : ۱۰ نومبر ۱۹۹۲ کو ناگپور میں ایک کنونشن ہوا۔ اس کا موضوع " قومی اتحاد، یک جہتی اور سیکولرزم " تھا۔ یہ مقالہ اس تقریر پر مبنی ہے جو اس موقع پر وسنت راؤ دیش پانڈے ہال میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترک مجمع میں کی گئی۔

مذہبی ہم آہنگی اور اسلام

پُرامن دنیا کی تعمیر بلاشبہ آج کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اور اس مسئلہ کا بہت گہرا تعلق اس چیز سے ہے جس کو مذہبی ہم آہنگی (religious harmony) کہا جاتا ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ آج کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ مختلف مذاہب کے درمیان ہم آہنگی کا کوئی قابلِ عمل فارمولا دریافت کیا جائے۔ مذہبی امن ہی پر، بڑی حد تک، عالمی امن کا انحصار ہے۔

اسلام سماجی امن کو بے حد اہمیت دیتا ہے۔ حتیٰ کہ اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اگر یک طرفہ صبر کے ذریعہ امن قائم ہو سکتا ہو تو یک طرفہ صبر و برداشت کی قیمت دے کر امن کا ماحول قائم کیا جائے۔ اس کی ایک واضح مثال اسلامی تاریخ کے دورِ اول کا وہ واقعہ ہے جس کو صلح حدیبیہ کہا جاتا ہے۔ صلح حدیبیہ حقیقۃً دس سال کا امن معاہدہ تھا۔ اور پیغمبرِ اسلام نے امن کا یہ معاہدہ جنگ جو دشمن کی تمام مانگوں کو یک طرفہ طور پر منظور کر کے حاصل کیا تھا۔

مذہبی ہم آہنگی کا ماحول قائم کرنا اسلام کا عین مطلوب ہے۔ تاہم اصل مقصد سے پورا اتفاق رکھتے ہوئے اس معاملہ میں اسلام کی تدبیر مجوزہ تدبیروں سے کسی قدر مختلف ہے۔ اس معاملہ میں اسلام کی تدبیر کا خلاصہ، ایک لفظ میں یہ ہے کہ ـــــ مذاہب کے درمیان ہم آہنگی نہیں، بلکہ اہلِ مذاہب کے درمیان ہم آہنگی۔ اگلی سطروں میں اس کی کسی قدر وضاحت کی جائے گی۔

مذہبی ہم آہنگی کے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جتنے نظریے پیش کیے گئے ہیں یا پیش کیے جا سکتے ہیں، وہ بنیادی طور پر غالباً تین قسم کے ہیں۔ ان میں سے دو وہ ہیں جو مذہب کی نئی تشریح پر مبنی ہیں۔ بعض اسکالر قسم کے ذہنوں نے بطور خود مذہب کی کچھ تشریحات کی ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر ان کی یہ تشریحات عمومی طور پر قبول کر لی جائیں تو اس کے بعد اپنے آپ سماج میں مذہبی ہم آہنگی کی حالت پیدا ہو جائے گی۔ تیسری تدبیر وہ ہے جو مذہب کی کسی مخصوص تشریح پر مبنی نہیں۔ اس کی حیثیت صرف ایک عملی تدبیر کی ہے۔

بڑی تقسیم کے مطابق، مذہبی ہم آہنگی کے یہی تین نظریات ہیں۔ ان کو الگ الگ سمجھنے کے لیے انھیں حسب ذیل تین نام دیے جا سکتے ہیں ـــــ سیکولر حل،

وحدتِ ادیان ، مذہبی رواداری۔

اسلام کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ دینِ فطرت ہے۔ چنانچہ اسلام ہر مسئلہ کے فطری حل کو پسند کرتا ہے۔ مذکورہ تینوں تدبیروں میں ابتدائی دو تدبیریں حقیقۃً مصنوعی تدبیریں ہیں۔ جب کہ تیسری تدبیر فطری تدبیر ہے۔ یہی تیسری تدبیر اسلام کے مزاج کے مطابق ہے اور اسلام اسی کی حمایت کرتا ہے۔

۱۔ مذہبی ہم آہنگی لانے کی مذکورہ تجویزوں میں پہلی تجویز مذہب کی سیکولر تعبیر پر قائم ہے۔ اس کے مطابق ، مذہب لوگوں کا نجی یا شخصی عقیدہ ہے۔ اجتماعی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس نظریہ کے حامیوں کا خیال ہے کہ اس اصول کو ماننے کے بعد مذہبی جھگڑے باقی نہیں رہ سکتے۔ اس کے بعد مذہب اگر باقی رہے گا تو محدود طور پر صرف افراد کی پرائیویٹ زندگی میں باقی رہے گا۔ اس کے باہر اس کا کوئی وجود نہ ہوگا۔ اور جب باہر کی زندگی میں مذہب کا وجود نہ ہوگا تو وہ اجتماعی زندگی کے لیے کوئی مسئلہ بھی نہ بن سکے گا۔

یہ حل یقینی طور پر ناقابلِ عمل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مذہب کی ایک نئی تشریح کے اوپر قائم ہے۔ اس تشریح کو نہ اب تک اہلِ مذاہب نے مانا ہے اور نہ آئندہ اس کا کوئی امکان ہے کہ وہ اس کو مان لیں۔ پھر جس تشریح کو اہلِ مذاہب ماننے کے لیے تیار نہ ہوں ، اس کو عملی طور پر کس طرح قائم کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے ، وہ اس کو ماننے کے لیے کبھی تیار نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ اسلام کے نزدیک دین کا تعلق انسان کے سارے معاملات سے ہے نہ کہ محض ذاتی عقائد سے۔

مزید یہ کہ یہ طرزِ فکر سراسر غیر فطری ہے۔ یہ انسان کی فطرت کے خلاف ہے کہ وہ ایک نقطۂ نظر کو سچا سمجھے ، اس کے باوجود وہ نقطۂ نظر صرف اس کے پرائیویٹ دائرہ میں محدود رہے۔ جس طرح رنگ پانی کے گلاس میں ڈالنے کے بعد ضرور پھیلتا ہے ، اسی طرح کچھ لوگ جب ایک تصور کو بطور صداقت مان لیں تو یہ اعتراف کسی مخفی دائرہ میں محدود ہو کر نہیں رہ سکتا۔ وہ ضرور پھیلے گا۔ وہ نجی زندگی سے نکل کر اجتماعی زندگی تک پہنچنا چاہے گا۔

مذکورہ اسباب کی بنا پر یہ ممکن نہیں کہ مذہب کی سیکولر تشریح کے تحت وہ سماجی

ماحول قائم کیا جا سکے جس کو مذہبی ھم آہنگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۲- مذہبی ہم آہنگی کے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے دوسرا نظریہ جو پیش کیا جاتا ہے وہ وحدتِ ادیان کا نظریہ ہے۔ اس نقطۂ نظر کے حاملین یہ کہتے ہیں کہ تمام مذاہب، ظاہری فرق کے باوجود، حقیقتہً ایک ہیں۔ تمام مذاہب ایک ہی مشترک منزل کی طرف جانے کے متعدد راستے ہیں۔ اس لیے باہمی ہم آہنگی کے مقصد کو حاصل کرنے کی تدبیر یہ ہے کہ لوگوں کو اس مذہبی یکسانیت کا یقین دلا دیا جائے۔ جب یہ حقیقت لوگوں کے ذہن نشین ہو جائے گی تو اس کے بعد تمام اختلافات اپنے آپ مٹ جائیں گے۔

مگر یہ نقطۂ نظر محض ایک دعویٰ ہے جس کے پیچھے کوئی دلیل نہیں۔ علمی اور تاریخی مطالعہ بتاتا ہے کہ مذاہب کا باہمی فرق محض ظاہری نہیں ہے بلکہ حقیقی ہے۔ مثال کے طور پر خدا کا عقیدہ، جو ایک بنیادی مذہبی عقیدہ ہے، اس کے سلسلہ میں بعض مذاہب توحید الٰہ (monotheism) کے قائل ہیں اور بعض دوسرے مذاہب وحدت وجود (monism) کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ اور دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام اس نقطۂ نظر سے موافقت نہیں کرتا۔ مزید یہ کہ، تجربہ کے مطابق، یہ حل عملی طور پر قابلِ نفاذ بھی نہیں۔

تجربہ بتاتا ہے کہ "تمام مذاہب ایک ہیں" کی بنیاد پر ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش بار بار کی گئی ہے اور بار بار ناکام ثابت ہوئی ہے۔ شہنشاہ اکبر (۱۶۰۵-۱۵۴۲) نے "دینِ الٰہی" کے نام پر اس کو طاقت کے ذریعہ نافذ کرنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر بھگوان داس نے اسی کام کو علمی طور پر کیا۔ اور اپنی عمر کا بہترین حصہ صرف کر کے ایک ہزار صفحہ پر مشتمل ایک کتاب (Essential Unity of All Religions) تیار کی۔ مہاتما گاندھی (۱۹۴۸-۱۸۶۹) نے "رام رحیم ایک ہے" کے نعرہ پر اس کو ملک گیر تحریک کے ذریعہ پھیلانا چاہا۔ مگر ہر ایک اپنے مقصد میں مکمل طور پر ناکام رہا۔

پھر جس تجویز کے ساتھ نہ فطری صداقت ہو اور نہ وہ قابلِ عمل ہو تو ایسی تجویز کو مذکورہ مسئلہ کا حل کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کی تجویز ایک اچھا تخیل ہو سکتا ہے مگر وہ زیر بحث مسئلہ کا ایک اچھا حل نہیں۔

۳- اب مذہبی ہم آہنگی کے مقصد کو حاصل کرنے کی تیسری تجویز باقی رہتی ہے۔ اور وہ رواداری ہے۔ یہی قابل عمل ہے اور اسلام اسی کی حمایت کرتا ہے۔

یہ تیسرا حل دراصل حقیقت پسندی کے اصول پر مبنی ہے۔ اس کو دوسرے لفظوں میں پریکٹیکل اپروچ بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس کا مدعا یہ ہے کہ مذاہب میں فکری فرق کو مانتے ہوئے عملی برتاؤ میں باہمی احترام کیا جائے۔ اعتقادی اختلاف کے باوجود ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی پالیسی اختیار کی جائے۔ یہ تقریباً وہی اصول ہے جس کو انگریزی مقولہ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ آؤ ہم اس پر اتفاق کرلیں کہ ہمارے درمیان اختلاف ہے :

Let's agree to disagree

اس اصول کو مختصر طور پر اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ —— مذاہب کے درمیان ہم آہنگی نہیں، بلکہ اہل مذاہب کے درمیان ہم آہنگی۔ مختلف مذہبوں میں نظریاتی وحدت نہیں، بلکہ مختلف مذہبی گروہوں میں عملی وحدت :

This principle is best described not as religious harmony,
but as harmony among religious people.

یہ کوئی تخیلاتی بات نہیں۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس کی افادیت تاریخ کے تجربہ سے ثابت ہے۔ اور وہ پوری طرح قابل عمل ہے۔ ماضی میں یا حال میں جب کبھی بھی لوگوں کے درمیان وہ چیز بالفعل قائم ہوئی ہے جس کو "مذہبی ہم آہنگی" کہا جاتا ہے، وہ ہمیشہ اختلاف کے باوجود اتحاد کی بنا پر قائم ہوئی ہے نہ کہ اختلاف کے بغیر اتحاد کی بنا پر۔

اس کی ایک مثال ہمیں کناڈا میں ملتی ہے۔ کناڈا میں تقریباً ہر مذہب کے لوگ آباد ہیں۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد وہاں وحدتِ کلچر (یونی کلچرلزم) کی تحریک چلائی گئی۔ مگر وہ پوری طرح ناکام ہوگئی۔ اس تجربہ کے بعد کناڈا کے ذمہ داروں نے وحدتِ کلچر کے نظریہ کو چھوڑ دیا۔ چنانچہ اب وہاں تعددِ کلچر (ملٹی کلچرلزم) کو رواج دیا جارہا ہے اور وہ پوری طرح کامیاب ہے۔ حتی کہ کناڈا پوری مغربی دنیا میں مذہب اور کلچر کی ہم آہنگی کا ایک قابل حوالہ نمونہ بن گیا ہے۔

یہی معاملہ امریکہ کا بھی ہے۔ امریکہ میں مختلف مذہب اور کلچر کے لوگ آباد ہیں۔ دوسری

عالمی جنگ کے بعد امریکہ میں یہ نظریہ اختیار کیا گیا کہ تمام لوگوں کو ایک ہی "امریکن کلچر" پر ڈھال دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے حکومت کے تحت ایک زبردست مہم چلائی گئی جس کو امریکی بنانا (Americanisation) کہا گیا۔ مگر یہ کوشش مکمل طور پر ناکام ہو گئی۔

اب امریکہ نے امریکنائزیشن کا تصور چھوڑ دیا ہے۔ اس کے بجائے وہ ہر کلچر کو آزادی دینے کا حامی ہے۔ پہلے اگر وہاں یونی کلچرلزم کا نظریہ تھا تو اب وہاں ملٹی کلچرلزم کا نظریہ اختیار کر لیا گیا ہے۔

امریکہ کے ۴۲ ویں صدر بل کلنٹن (Bill Clinton) جو نومبر ۱۹۹۲ میں امریکہ کے نئے صدر منتخب ہوئے ہیں، انھوں نے کامیابی کے بعد اپنی پہلی ہی تقریر میں جو باتیں کہیں ان میں سے ایک وہ تھی جس کو ٹائمس آف انڈیا (۵ نومبر ۱۹۹۲) کے کرسپانڈنٹ مقیم واشنگٹن نے ان الفاظ میں تحریر کیا ہے کہ منتخب امریکی صدر نے نئی حب الوطنی کی اپیل کی جو امریکی عوام کو باہم جوڑ دے تاکہ ہمارا فرق واختلاف ہمارے لیے طاقت کا ذریعہ بن جائے:

The president-elect invoked a new patriotism to bring the American people together so that our diversity can be a source of strength.

یہاں پہنچ کر ہمیں اس سوال کا جواب مل جاتا ہے کہ "اختلاف کے باوجود اتحاد" کے اصول کو مستقل طور پر کس طرح برقرار رکھا جائے۔ اس کی سادہ فطری تدبیر یہ ہے کہ مشترک مفاد کی خاطر ہر گروہ اس اصول کو مان لے کہ: پرامن دائرہ میں ہر ایک کو آزادی، مگر جارحیت کے دائرہ میں کسی کو آزادی نہیں۔ ہر ایک اپنے عقیدہ کے مطابق، قول وعمل کے لیے آزاد ہو۔ مگر ہر ایک کی آزادی وہاں ختم ہو جائے جہاں اس کی آزادی دوسرے کو عملی نقصان پہنچانے کا باعث بن رہی ہو۔

اس معاملہ میں اسلام کا نقطۂ نظر یہی ہے۔ ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن کی مثال اور ایمان کی مثال اس گھوڑے کی طرح ہے جو کھونٹے کے ساتھ رسی میں بندھا ہوا ہو۔ وہ گھومتا ہے اور پھر اپنے کھونٹے کی طرف واپس آجاتا ہے (مثلُ المؤمنِ ومثلُ الایمانِ کمثلِ الفرسِ فی آخِیَّتِہِ یجول ثم یرجع الی آخیّتہ)

مشکاۃ المصابیح ۲/۱۲۲۶

وسیع تر انطباق کے اعتبار سے اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر شخص کو دائرہ امن

کی رسی سے بندھا رہنا ہے۔ جب بھی کسی کی سرگرمی جارحیتِ غیر تک پہنچ جائے تو گویا اس کی رسی کی حد آگئی۔ اس کے بعد آدمی پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ دوبارہ امن کے دائرہ کی طرف واپس آجائے۔

یہ فطرت کا قانون ہے جس پر پوری کائنات کا نظام چل رہا ہے۔ وسیع خلا میں بے شمار متحرک ستارے ہیں مگر وہ دوسرے ستاروں سے ٹکراؤ کیے بغیر اپنے اپنے مدار پر گردش کرتے رہتے ہیں۔ جنگل کے جانور ہر وقت سرگرم رہتے ہیں مگر حقیقی فطری ضرورت کے سوا کبھی کوئی جانور دوسرے جانور سے نہیں ٹکراتا۔ یہی طریقہ انسان کو بھی اختیار کرنا ہے۔ اس دنیا میں ہر انسان کو اپنے قول وفعل کی آزادی ہے۔ مگر اس آزادی کا استعمال صرف امن کے دائرہ میں کرنا ہے، جارحیت کے دائرہ میں داخل ہونے سے مکمل طور پر ہر ایک کو باز رہنا ہے۔ جارحیت سے پرہیز کے اس اصول کو ایک لفظ میں اصول اعراض (principle of avoidance) کہا جا سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں قرآن میں ایک اصولی حکم یہ ملتا ہے کہ مذہب کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں (لا اکراہ فی الدین) دوسری جگہ اعلان کیا گیا ہے کہ تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین (لکم دینکم ولی دین) اسی حکم کی بنا پر ایسا ہوا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ گئے تو وہاں آپ نے ایک صحیفہ (ڈیکلریشن) جاری کیا۔ اس میں دوسری باتوں کے ساتھ یہ بھی تحریر تھا کہ مسلمانوں کے لیے مسلمانوں کا دین ہوگا اور یہود کے لیے یہود کا دین (للمسلمین دینھم وللیھود دینھم) باہمی ہم آہنگی کی اس فضا کو باقی رکھنے کے لیے قرآن میں اہل اسلام کو یہ حکم دیا گیا کہ :

ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوا بغیر علم کذلک زینا لکل امۃ عملھم ثم الی ربھم مرجعھم فینبئھم بما کانوا یعملون (الانعام ۱۰۹)	اللہ کے سوا جن کو لوگ پکارتے ہیں ان کو گالی نہ دو ورنہ وہ لوگ حد سے گزر کر جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں گے۔

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہر اس کارروائی سے بچو جو ایک مذہبی گروہ اور دوسرے مذہبی گروہ کے درمیان تلخی پیدا کرنے والی ہو۔ اختلاف کے باوجود اتحاد کی فضا کو برقرار رکھنے

کا پورا اہتمام کرو۔ خواہ کتنا ہی زیادہ فکری اختلاف ہو، مگر باہمی تعلقات کو ہر حال میں احترام کی بنیاد پر قائم کرو۔ فکری اور اعتقادی اختلاف کو عملی ٹکراؤ تک ہرگز نہ جانے دو۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اس اصول کی ایک انتہائی انقلابی مثال ملتی ہے۔ اور وہ قدیم مدینہ کا وہ تاریخی واقعہ ہے جو گویا تین مذاہب کا اجتماع تھا۔ تین مذاہب کا یہ اجتماع خود مسجد نبوی میں ہوا۔

محمد بن اسحاق کے واسطے سے ابن ہشام نے نقل کیا ہے کہ غزوۂ بدر سے کچھ پہلے نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد تحقیق حال کے لیے مدینہ آیا۔ اس میں ساٹھ افراد شامل تھے۔ یہ لوگ مدینہ کی مسجد میں ٹھہرے۔ ان کی آمد کے بعد مدینہ کے علماء یہود بھی وہاں آ گئے۔ اس طرح تین مذہبوں (اسلام، عیسائیت، یہودیت) کے ماننے والے مسجد کے اندر جمع ہو گئے۔ ان کے درمیان کئی دن تک مذہبی امور پر بحث جاری رہی۔ اس کی تفصیل سیرۃ ابن ہشام میں دیکھی جا سکتی ہے۔

روایت میں مزید بتایا گیا ہے کہ اس دوران عیسائیوں کی عبادت کا وقت آگیا۔ وہ مسجد نبوی میں کھڑے ہو گئے اور اپنے طریقہ کے مطابق اپنی عبادت کرنے لگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دیکھ کر فرمایا کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں انھیں کرنے دو۔ چنانچہ انھوں نے مشرق کی سمت میں اپنی عبادت ادا کی (وقد حانت صلاتهم فقاموا فی مسجد رسول الله صلی الله علیه وسلم يُصلّون۔ فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم : دَعُوهم۔ فصلّوا الی المشرق (سیرۃ ابن ہشام ۲/۲۰۶)

محمد حسین ہیکل نے اپنی کتاب حیاۃ محمدؐ میں بجا طور پر اس کو مؤتمر الادیان الثلاثۃ کا نام دیا ہے۔ یہاں ہم ان کی کتاب کے انگریزی ترجمہ (The Life of Muhammad) سے دو پیراگراف نقل کرتے ہیں :

The three scriptural religions thus confronted one another in Madinah. The delegation entered with the Prophet into public debate and these were soon joined by the Jews, thus resulting in a tripartite dialogue between Judaism, Christianity and Islam. This was a truly great congress which the city of Yathrib had witnessed. In it, the three religions which today dominate the world and determine its destiny had met, and they did so for the greatest idea and the noblest purpose. (pp. 195-96)

اسلام اگرچہ اس کا قائل ہے کہ سچائی صرف ایک ہے، سچائی کئی نہیں۔ مگر اسی کے ساتھ وہ عملی رواداری کا بھی اسی شدت کے ساتھ حکم دیتا ہے۔ اس کی آخری حد، مذکورہ سنت کے مطابق، یہ ہے کہ اسلام میں اس کی بھی اجازت ہے کہ غیر مسلم حضرات اسلامی عبادت خانہ (مسجد) میں آئیں۔ وہاں مختلف مذاہب کے درمیان مذاکرہ منعقد کیا جائے۔ حتیٰ کہ اس دوران میں اگر ان کی عبادت کا وقت آجائے تو وہ مسجد کے اندر اپنے طریقہ کے مطابق عبادت کرنے کے لیے بھی آزاد ہیں۔

یہ اصول خود پیغمبر کی سنت سے ثابت ہے۔ تاہم اب اس میں مکہ اور مدینہ کی مسجدیں شامل نہیں ہوں گی۔ کیوں کہ پیغمبر نے بعد کو خدا کے حکم سے مکہ اور مدینہ کو حرم قرار دے دیا۔ غیر مسلم حضرات دوسری تمام مسجدوں میں داخل ہو سکتے ہیں۔ البتہ حرمین (مکہ، مدینہ) میں ان کو داخل ہونے کی رخصت نہ ہوگی۔ یہ گویا کلیہ میں استثناء کا معاملہ ہے۔ اور کلیہ میں استثناء ہونا ایک معلوم و معروف اصول ہے۔

عملی رواداری کا یہ اصول اسلام کی پوری تاریخ میں مسلسل طور پر رائج اور قائم رہا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے الفاظ میں اسلام نے اپنے دور اول میں حیرت ناک کامیابی (astonishing success) حاصل کی اور اسپین سے لے کر انڈیا تک دنیا کا بڑا حصہ اسلام کے تحت آگیا:

Within a century after the Prophet's death in AD 632, (the early generations of Muslims) had brought a large part of the globe - from Spain across Central Asia to India - under a new Arab Muslim empire. (9/912)

تاہم ان عظیم فتوحات کے باوجود، برٹانیکا کے مطابق، مسلم دنیا میں دوسرے مذہب کے لوگوں کو پوری طرح مذہبی آزادی (religious autonomy) حاصل تھی۔ اسلام نے توحید حقیقت کا اعلان کرتے ہوئے دوسرے تمام مذاہب کا پورا احترام ملحوظ رکھا اور ان کے ساتھ کامل رواداری کا معاملہ کیا (۹/۹۱۲)

عملی نقطۂ نظر سے ایک بے حد اہم بات یہ ہے کہ آج ہم جن مذاہب کے درمیان ہم آہنگی لانا چاہتے ہیں، وہ مذاہب نئے نہیں ہیں بلکہ ہر مذہب قدیم مذہب ہے اور ہر مذہب قائم شدہ

مذہب (established religion) کی حیثیت حاصل کر چکا ہے۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ کوئی مذہب جب قدامت کے اس مرحلہ میں پہنچ جائے تو وہ اپنے ماننے والوں کے درمیان ہمیشہ مقدس حیثیت حاصل کر لیتا ہے، اس کے بعد اس میں کسی قسم کی تبدیلی لانا یکسر ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد کسی مذہب میں تبدیلی کی کوشش ایک نیا مذہب پیدا کر کے اصل مسئلہ میں اضافہ تو کر سکتی ہے، مگر اس طرح کی کوئی کوشش خود اس مذہب کو بدلنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس کی متعدد مثالیں ماضی بعید اور ماضی قریب میں موجود ہیں۔

اس تاریخی حقیقت کو سامنے رکھئے تو معلوم ہوگا کہ مختلف مذاہب کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی مذکورہ تیسری تجویز ہی واحد تجویز ہے جو قابل عمل ہے۔ اس کے سوا کوئی اور تجویز، خواہ بظاہر وہ کتنی ہی اچھی معلوم ہو، اس کو بالفعل وقوع میں لانا ممکن نہیں۔

ایک مذہبی اسکالر سے اس موضوع پر میری گفتگو ہوئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ پچھلے سو سال سے ہم مذاہب کے درمیان ہم آہنگی لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ۱۸۹۳ میں اسی مقصد کے لیے شکاگو میں مذاہب کی عالمی پارلیمنٹ (World Parliament of Religions) منعقد کی گئی۔ اس کے بعد سے اب تک اس نوعیت کی بے شمار کوششیں کی گئی ہیں۔ مگر اس معاملہ میں ہماری تمام کوششیں سراسر بے نتیجہ ہو گئیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس راہ میں کچھ ناقابل عبور رکاوٹیں (insurmountable obstacles) حائل ہیں۔

میں نے کہا کہ یہ بلاشبہ قابل حصول ہے۔ مگر اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم ایک ممکن مقصد کو ناممکن تدبیر کے ذریعہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مذہبی ہم آہنگی یقیناً ایک مطلوب چیز ہے۔ مگر اس کو اس طرح حاصل نہیں کیا جا سکتا کہ لوگوں کے مروجہ عقیدہ کو بدل کر انھیں ایک اور عقیدہ پر لانے کی کوشش کی جائے جس کو ایک یا زیادہ اسکالر نے ریسرچ کر کے وضع کیا ہو۔ اس کی واحد قابل عمل تدبیر یہ ہے کہ لوگوں کے مروجہ عقیدہ کو چھیڑے بغیر انھیں اس پر راضی کیا جائے کہ وہ مشترک انسانی ضرورت کے تحت دوسرے مذہب کے لوگوں کا احترام کریں۔ وہ دوسرے مذہب والوں کے ساتھ رواداری (tolerance) کا سلوک کریں۔ وہ فکری اختلاف کے باوجود عملی ہم آہنگی کے طریقہ پر قائم رہیں۔

زندگی کے اصولوں میں سے ایک اصول وہ ہے جس کو عملیت (pragmatism) کہا جاتا ہے۔ یعنی جہاں نظریاتی تدبیر کام نہ کر رہی ہو وہاں پریکٹیکل تدبیر کا طریقہ اختیار کرنا۔ جہاں لوگ ایک دوسرے سے اعتقادی اتفاق نہ کر سکتے ہوں، وہاں زندگی کے نظام کو برقرار رکھنے کے لیے لوگوں کا اس پر راضی ہو جانا کہ ہر ایک اپنے عقیدہ پر باقی رہتے ہوئے یہ کوشش کرے کہ ایک دوسرے کے درمیان عملی ٹکراؤ کی نوبت نہ آئے۔

پریکٹیکل تدبیر —— ایک عام اور معروف اصول ہے۔ ہر شخص کو اپنی ذاتی زندگی میں اسے لازماً اختیار کرنا پڑتا ہے۔ ہر شخص کی زندگی میں کہیں نہ کہیں ایسا موقع آجاتا ہے جبکہ وہ نظریاتی معقولیت (theoretical reason) کو نظر انداز کر کے عملی معقولیت (practical reason) کی بنیاد پر لوگوں سے تعلق قائم کرتا ہے۔ ایسی حالت میں یہ تدبیر کوئی نئی تدبیر نہیں۔ اس کو ماننا لوگوں کے لیے خود اپنے اختیار کردہ طریقہ کی ایک توسیع ہے، نہ کہ الگ سے کوئی نیا طریقہ اختیار کرنا۔

نوٹ: یہ مقالہ انٹر ریلیجس فیڈریشن فار ورلڈ پیس، نیویارک کے زیر انتظام نئی دہلی میں ہونے والی انٹرنیشنل کانفرنس بتاریخ ۱-۳ فروری ۱۹۹۳ میں (انگریزی میں) پیش کرنے کے لیے لکھا گیا۔ کانفرنس کا موضوع یہ تھا:

Seeking Global Harmony Through Inter-Religious Action

انسانیت انتظار میں

مشہور ہندو عالم سوامی ویویکانند نے لکھا ہے کہ زندگی کے وحدانی تصور (ادویتا واد) پر دوسری نسلوں سے پہلے پہونچنے کا کریڈٹ ہندوؤں کو مل سکتا ہے، مگر عملی وحدانیت جو کہ تمام انسانیت کو ایک سمجھے اور سب سے ایک طرح کا سلوک کرے، کبھی ہندوؤں میں پیدا نہ ہوسکی۔

دوسری طرف میرا تجربہ ہے کہ اگر کوئی مذہب کبھی اس مساوات تک قابل لحاظ طور پر پہونچا ہے تو وہ اسلام اور صرف اسلام ہے۔ اس بنا پر میں یقین کے ساتھ سمجھتا ہوں کہ عملی اسلام کی مدد کے بغیر، ویدانت کے نظریات، خواہ وہ کتنے ہی عمدہ اور حیرت انگیز ہوں، وسیع انسانیت کے لیے مکمل طور پر بے فائدہ ہیں۔

ہماری مادر وطن کے لیے جو کہ دو بڑے مذہبی نظاموں ہندوازم اور اسلام کا سنگم ہے، ویدانت دماغ اور اسلام جسم واحد امید ہے۔ میں اپنے ذہن کی آنکھ سے دیکھ رہا ہوں کہ مستقبل کا معیاری ہندستان بحران اور انتشار سے نکل کر شاندار اور ناقابل تسخیر بن رہا ہے اور یہ واقعہ ویدانت دماغ اور اسلام جسم کے ذریعہ ہو رہا ہے۔ (۱۸۹۸)

مسٹر شیلندر ناتھ گھوش نے لکھا ہے کہ ایک ایسے شخص کی حیثیت سے جو اپنی جوانی کے ابتدائی دور میں اسلام کے سماجی مساوات اور عالمی اشتراک کے پیغام سے متاثر ہوا، اور تقسیم سے پہلے بنگال میں مسلم عوام کے درمیان کسانی تنظیم کے تحت رہا اور ان کے عقائد و نظریات سے قریبی واقفیت حاصل کی، اور ایک ایسے شخص کی حیثیت سے جس نے ۴۸-۱۹۴۷ میں تقسیم کے بارہ میں ان کے سابقہ دیوانہ پن پر انھیں شرمندہ ہوتے ہوئے دیکھا، میں اپنے مسلمان بھائیوں اور بہنوں کے نام یہ اپیل جاری کر رہا ہوں۔

مسلمانوں کے سچے مفادات اس طرح زیادہ بہتر طور پر حاصل کیے جاسکتے ہیں کہ ان کی منزل متحدہ تعمیری اصطلاحات میں مقرر کی جائے نہ کہ منفی انداز اور تفریق کی روح کے ساتھ اس کا تعین کیا جائے۔ اچھا مسلمان اور زیادہ خوش حال بننا بلاشبہ ان کا اعلیٰ مقصد قرار دیا جاسکتا ہے۔ میرے مسلمان بھائیوں کو یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ میں جو کہ ایک ہندو ہوں۔ مختلف

Swami Vivekananda on Islam

The Hindus may get the credit of arriving at it earlier than other races, yet practical Advaitism, which looks upon and behaves to all mankind as one's own soul, was never developed among the Hindus.

On the other hand, my experience is that if ever any religion approached to this equality in an appreciable manner, it is Islam and Islam alone. I am firmly persuaded, therefore, that without the help of practical Islam, theories of Vedantism, however fine and wonderful they may be, are entirely valuless to the vast mass of mankind.

For our own motherland as junction of the two great systems, Hinduism and Islam, — Vedanta brain and Islam body — is the only hope. I see in my mind's eye the future perfect India rising out of this chaos and strife, glorious and invincible, with Vedanta brain and Islam body (pp. 379-380).

Letters of Swami Vivekananda,
Advaita Ashrama
5, Dehi Entally Road,
Calcutta, 1970, p. 463

Indian Muslims at the Crossroads

By Shailendranath Gosh

As one who, early in his youth, was attracted to the Islamic message of social equality and universal sharing of resources and lived, as a peasant organiser, among the Muslim masses for many years in pre-partition Bengal's countryside sharing their ethos; and as one who, in 1947-48, witnessed the depths of their remorse over their earlier separatist craze, I direct this appeal to our Muslim brothers and sisters.

The true interests of the Muslims can be served much better by defining the goal in harmoniously constructive terms rather than in a spirit of separatist negativism. To be better Muslims and more prosperous would be a laudable goal.

My Muslim brethren need to know that I, a Hindu, am interested in the affairs of the Muslims for many reasons. I had hoped that the Indian Muslims, after their chastening experience of 1947, could turn to another road — to find a **separate identity** for themselves by being ahead of others in **creativity** and thus be the harbinger of a new Indian Renaissance. It has happened many times in history that a creative minority has sparked the rebirth of a whole nation.

The Hindustan Times, April 4, 1986

اسباب سے مسلمانوں کے معاملات میں دل چسپی رکھتا ہوں۔ میں نے امید کی تھی کہ ہندستان کے مسلمان ۱۹۴۷ کے سبق آموز تجربہ کے بعد، ایک اور راستہ کی طرف مڑ سکیں گے، وہ اپنا علحدہ تشخص اس میں پائیں گے کہ وہ اپنے آپ کو دوسروں سے زیادہ تخلیقی ثابت کریں اور اس طرح وہ ہندستان کی نشأۃ ثانیہ کے نقیب بنیں۔ تاریخ میں ایسا بہت بار ہوا ہے کہ ایک تخلیقی اقلیت ایک پوری قوم کو نئی زندگی کی طرف لے جانے کا ذریعہ بن گئی ہے۔

تبصرہ

ہندستان کے ہندوؤں میں، میرے اندازہ کے مطابق، پچاس فیصد سے زیادہ ایسے لوگ ہیں جو مسلمانوں کے بارہ میں وہ مثبت اور خیر خواہانہ تصور رکھتے ہیں جس کا دو نمونہ اوپر کے اقتباس میں نقل کیا گیا ہے۔ یہ لوگ اسلام کی اعلیٰ تعلیمات، خاص طور پر توحید اور مساوات، سے متاثر ہیں اور چاہتے ہیں کہ اسلام کی ان قدروں کو ملک میں فروغ دیا جائے۔ کیوں کہ ان کے بغیر ملک کی حقیقی ترقی نہیں ہو سکتی۔ وہ اس بات کے منتظر ہیں کہ مسلمان اٹھیں اور اپنے اس تخلیقی کردار کو ادا کریں۔ مسلمان امکانی طور پر پوری طرح اس کی استعداد رکھتے ہیں۔ بلکہ وہی واحد گروہ ہیں جو اس قسم کا مثبت کردار ادا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ کیوں کہ وہی وہ لوگ ہیں جن کے پاس خدا کی آفاقی تعلیمات کا غیر محرف اڈیشن موجود ہے۔

مسلمان بلاشبہ اس تاریخی کردار کو ادا کر کے موجودہ ماحول میں اپنے لیے باعزت جگہ حاصل کر سکتے ہیں۔ مگر اس کردار کو ادا کرنے کی ایک لازمی شرط ہے۔ وہ شرط یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو وقتی حالات سے اوپر اٹھائیں۔ وہ یک طرفہ طور پر ہر قسم کی شکایتوں اور ناانصافیوں کو نظر انداز کر دیں۔ وہ کھونے پر غم کرنا چھوڑ دیں اور محرومی کی تلخیوں کو بھلا دیں۔ جس دن وہ ایسا کریں گے اسی دن وہ اس قابل ہو جائیں گے کہ وہ اس ملک میں وہ ایجابی رول ادا کر سکیں جس کا تاریخ کو صدیوں سے انتظار ہے۔

یہی وہ قربانی ہے جس کو قرآن میں صبر کہا گیا ہے، اور صبر کرنے والوں ہی کے لیے مقدر ہے کہ وہ قانونِ قدرت کے مطابق قوموں اور ملکوں کے قائد بنیں (وجعلنا منهم ائمة يهدون بامرنا لما صبروا)۔

قومی اتحاد

بھارت وکاس پریشد (نئی دہلی) ۱۹۶۹ میں قائم ہوئی۔ یہ ایک تعلیمی اور ثقافتی ادارہ ہے۔ اس کے موجودہ سرپرست ڈاکٹر ایل ایم سنگھوی اور صدر جسٹس ایچ آر کھنہ ہیں۔ ۱۱-۱۲ فروری ۱۹۸۹ میں اس کی طرف سے ایک آل انڈیا سمینار ہوا۔ سمینار کی کارروائیاں کانسٹی ٹیوشن کلب (نئی دہلی) میں انجام پائیں۔ ۱۲ فروری کی شام کو "کلوزنگ سیشن" میں میرا پیپر رکھا گیا تھا۔ اس کے تحت مذکورہ سمینار میں شرکت ہوئی۔ اس سمینار کا موضوع تھا ـــــــ قومی اتحاد اور ہندستان کی مذہبی اقلیتیں :

National unity and religious minorities in India

۸۹ - ۱۹۸۸ کے درمیان مجھے اس قسم کے کئی سمیناروں میں شرکت کا اتفاق ہوا ہے۔ ان کا مختصر ذکر الرسالہ میں "خبر نامہ اسلامی مرکز" کے تحت دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ تمام سمینار راجدھانی دہلی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندوؤں کی طرف سے کیے گئے تھے۔ اور ان میں بڑے بڑے ہندو دماغ شریک تھے۔ لوگوں کی تقریریں سننے کے بعد میرا احساس یہ تھا کہ "ہندو دماغ" ملک کی موجودہ صورت حال پر سخت تشویش میں مبتلا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ملک میں فرقہ واریت کا مسئلہ ختم ہو۔ ملک میں قومی اتحاد آئے۔ تمام فرقے اور گروہ یک جہتی کے ساتھ مثبت عمل کی راہ پر لگ جائیں کیوں کہ اس کے بغیر ملک کی حقیقی ترقی ممکن نہیں۔

فکری سادگی

تاہم ان اجتماعات کو سننے اور دیکھنے کے بعد میرا مشترک احساس یہ تھا کہ فرقہ وارانہ مسئلہ کا احساس تو ضرور لوگوں کے اندر شدید طور پر پیدا ہوا ہے، مگر فرقہ وارانہ مسئلہ کا حل کیا ہو، اس کے بارے میں ان کا ذہن ابھی تک واضح نہیں ہے۔ زیادہ تر لوگ سسٹم یا قانون میں تبدیلی کی بات کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر مذکورہ سمینار میں یہ تجویز کیا گیا کہ ہندستان کے دستور میں جہاں اقلیتی حق کا لفظ لکھا ہوا ہے، وہاں اس کو بدل کر انسانی حق (Human right) کا لفظ لکھ دیا جائے۔ اقلیتی کمیشن کو ختم کرکے اس کی جگہ انسانی کمیشن مقرر کیا جائے، وغیرہ۔

اس قسم کی تجویزوں کے پیچھے یہ ذہن ہے کہ ملک میں جو گروہ بندی اور فرقہ وارانہ امتیاز ہے،

وہ اس لیے ہے کہ ہمارا دستور "اقلیتوں کے حقوق" کا لفظ بولتا ہے۔ وہ ملک میں کئی گروہ تسلیم کر کے ان کے الگ الگ حقوق مقرر کرتا ہے۔ اس سے علیحدگی کا تصوّر پیدا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اگر دستور میں "انسانی حقوق" کا لفظ درج کر دیا جائے تو ملک کے تمام لوگ ایک ہی نوع (انسان) نظر آئیں گے۔ اس کے بعد اپنے آپ علیحدگی کا ماحول ختم ہو کر یگانگت کا ماحول قائم ہو جائے گا۔

مگر یہ اصل معاملہ کو بہت سادہ سمجھنا (Oversimplification) ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اصل مسئلہ امر واقعہ کو بدلنے کا ہے نہ کہ کسی لفظ کو بدلنے کا۔ درخت کی دنیا میں اگر پھول کے ساتھ کانٹے بھی ہیں تو آپ کانٹوں کے مسئلہ کو اس طرح ختم نہیں کر سکتے کہ اپنی درخت کی ڈکشنری سے کانٹے کا لفظ نکال دیں، اور ہر جگہ صرف پھول ہی پھول لکھ دیں۔ درخت میں کانٹے کا مسئلہ ایک حقیقی مسئلہ ہے۔ اور ایک حقیقی مسئلہ کو حقیقی سطح پر عمل کر کے حل کیا جاسکتا ہے نہ کہ لفظی سطح پر عمل کر کے۔

مذکورہ فکر کا خلاصہ یہ ہے کہ "اقلیت" اور "اکثریت" کا لفظ امتیاز اور علیحدگی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس سے سماج میں طبقات پیدا ہوتے ہیں، اس کے برعکس اگر دستور میں "انسان" کا لفظ لکھ دیا جائے تو امتیاز کا تصور ختم ہو جائے گا اور سماج میں طبقاتی علیحدگی ختم ہو کر طبقاتی یکسانیت کا دور آجائے گا۔

مگر اس قسم کی سوچ سادہ لوحی کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندستانی سماج اور اسی طرح تمام ملکوں کے سماج میں مختلف نسلی اور مذہبی طبقات پائے جاتے ہیں۔ یہ فرق موجود ہیں اور موجود رہیں گے۔ ان کو اس طرح ختم نہیں کیا جاسکتا کہ قانون میں ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ لکھ دیا جائے۔

اس کی ایک عملی مثال ہریجن کا مسئلہ ہے۔ ہریجنوں کے سلسلہ میں وہ چیز عملاً حاصل کی جاچکی ہے جس کا مطالبہ اقلیتوں کے سلسلہ میں کیا جارہا ہے۔ قدیم تصور کے مطابق، ہندو اونچی ذات کے لوگ ہیں اور ہریجن (شُدر) نیچی ذات کے لوگ۔ آزادی کے بعد جو قانون سازی ہوئی ہے، اس میں دونوں کو لفظی طور پر ایک کر دیا گیا ہے، چنانچہ ہمارا موجودہ دستور دونوں کو یکساں طور پر ہندو قرار دیتا ہے۔

مگر کیا اس لفظی یکسانیت کی وجہ سے ہندو (اونچی ذات) اور ہریجن (نیچی ذات) کا فرق ختم

ہو گیا۔ ہر آدمی جانتا ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ لفظی یکسانیت پیدا کرنے کے باوجود دونوں میں سماجی یکسانیت نہیں آئی، دونوں کے درمیان سابقہ تفریق بدستور پوری طرح باقی ہے۔

سبق آموز مثال

جو لوگ فرقہ وارانہ مسئلہ پر گفتگو کرتے ہیں، وہ ہمیشہ ایک بنیادی غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ شمالی ہندستان کو کل ہندستان سمجھ لیتے ہیں۔ اس بنا پر ان کا تجزیہ بھی نادرست ہوتا ہے اور ان کا پیش کردہ حل بھی نادرست۔

زیر بحث مسئلہ کا ایک اہم ترین عملی پہلو یہ ہے کہ یہ ملک دو مختلف حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ ایک شمالی ہند، اور دوسرے جنوبی ہند۔ پچھلی نصف صدی کی تاریخ بتاتی ہے کہ جتنے بھی فرقہ وارانہ جھگڑے ہوتے ہیں، وہ سب کے سب شمالی ہند میں ہوتے ہیں۔ جنوبی ہند میں اس قسم کا کوئی جھگڑا نہیں ہوتا۔ اگر کبھی اتفاق سے کوئی فرقہ وارانہ جھگڑا جنوب کے علاقہ میں ہوا ہے، تو وہ شمالی ہند کے لوگوں ہی کا پیدا کردہ تھا جو کسی وجہ سے وہاں پہنچ گئے۔ خود جنوبی ہند کے لوگوں نے کبھی اس قسم کا کوئی جھگڑا برپا نہیں کیا۔ جب کہ وہ تمام فرقے جنوبی ہند میں بھی موجود ہیں جو شمالی ہند میں موجود ہیں۔ اور وہ تمام گروہی فرق وہاں بھی پائے جاتے ہیں، جو یہاں پائے جاتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ شمالی ہند میں ہم جس مسئلہ کو حل کرنے کی باتیں کرتے ہیں، وہ جنوبی ہند میں عملاً حل شدہ ہے، جب ایسا ہے تو سب سے پہلے ہمیں ملک کے دونوں علاقوں کے فرق کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ موجودہ صورت حال میں ہمیں اس کے سوا اور کچھ نہیں کرنا ہے کہ جنوبی ہند کو شمالی ہند تک وسیع کر دیں۔ جو کچھ ملک کے ایک حصہ میں جاری ہے، اس کو ملک کے دوسرے حصہ میں جاری کر دیں۔

راقم الحروف نے جنوبی ہند کے کئی سفر کیے ہیں اور اس مسئلہ کو تفصیل کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ میرا حاصل مطالعہ یہ ہے کہ اس فرق کی وجہ بالکل سادہ ہے۔ جنوبی ہند کے لوگوں میں تحمل (Tolerance) ہے، جب کہ شمالی ہند کے لوگوں میں تحمل نہیں۔ جنوبی ہند کے لوگ اختلاف کے باوجود ایک دوسرے سے ٹکراؤ نہیں کرتے۔ جب کہ شمالی ہند کے لوگوں کا حال ہے کہ اختلاف کا کوئی واقعہ سامنے آتے ہی وہ فوراً ٹکراؤ کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جنوبی ہند کا مزاج تحمل ہے، اور شمالی ہند کا مزاج عدم تحمل۔ یہی وہ فرق ہے جس نے دونوں علاقوں کے درمیان

یہ فرق پیدا کر دیا ہے کہ شمالی ہند میں فرقہ وارانہ جھگڑے زندگی کا معمول بن گئے ہیں، جب کہ جنوبی ہند میں فرقہ وارانہ جھگڑوں کا سرے سے کوئی وجود نہیں۔

اوپر کی مثال ایک عملی واقعہ کی صورت میں بتاتی ہے کہ فرقہ وارانہ مسئلہ کا حل کیا ہے۔ وہ حل یہ ہے کہ لوگوں کے اندر یہ مزاج بنایا جائے کہ وہ فرقہ وارانہ اختلاف کے باوجود فرقہ وارانہ اتحاد کے ساتھ زندگی گزاریں۔ جو صورت حال آج بھی ملک کے ایک حصہ میں قائم ہے، وہی صورت حال ملک کے دوسرے حصہ میں قائم کر دی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ فرقہ وارانہ مسئلہ کا حقیقی اور پائدار حل صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ لوگوں کی سوچ کو درست کیا جائے۔ ہمارے ملک کا یا دوسرے لفظوں میں شمالی ہند کا، اصل مسئلہ یہ ہے کہ مختلف اسباب سے یہاں کے لوگوں کی سوچ بگڑ گئی ہے۔ یہی جڑ کی بات ہے۔ اور اس جڑ پر عمل کر کے ہی فرقہ وارانہ مسئلہ اور دوسرے مسائل کو حل کیا جا سکتا ہے۔

کسی سماج میں مختلف فرقوں کا ہونا بالکل فطری بات ہے، وہ ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ باقی رہیں گے۔ ہمارے موجودہ سماج کی اصل برائی خود فرقوں کی موجودگی نہیں، بلکہ مختلف فرقوں کے درمیان تحمل (Tolerance) کی غیر موجودگی ہے۔ فرقہ واریت کا مسئلہ عدم تحمل کا پیدا کردہ ہے، نہ کہ خود فرقوں کی موجودگی کا پیدا کردہ۔

برداشت کی ضرورت

سماج میں مختلف سطحوں پر فرق اور اختلاف کا ہونا بالکل لازمی ہے۔ آپ سماج کے اوپر یکسانیت کا بلڈوزر نہیں چلا سکتے۔ روسی ڈکٹیٹر اسٹالن نے اپنے ملک میں بے طبقاتی سماج (Classless society) قائم کرنے کے لیے ۲۵ ملین انسانوں کو پیس ڈالا۔ پھر بھی وہ بے طبقاتی سماج بنانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ پھر آپ اس ناممکن کام کو کس طرح ممکن بنا سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلہ کا قابل عمل حل صرف یہ ہے کہ لوگوں کے اندر تحمل کا مزاج اور ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ انھیں اختلاف میں اتحاد (Unity in diversity) کا سبق دیا جائے۔ قومی اتحاد ہم کو اختلاف کے باوجود قائم کرنا ہے نہ کہ اختلاف کے بغیر۔ کیونکہ وہ ممکن ہی نہیں۔

قوم کے افراد کے اندر تحمل کا مطلوبہ مزاج پیدا کرنے کے لیے ہمیں وہی عمل کرنا ہے جس کو فیبین

سوسائٹی نے نفوذ کرنے (Permeation) سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی شعور کو بدلنے کی مہم جاری کرکے لوگوں کے ذہنوں میں گھسنا اور ان کو اندر سے اس طرح بدل دینا کہ ان کے سوچنے کا ڈھنگ وہ ہو جائے جو کہ دراصل ہونا چاہیے۔

قومی اتحاد اور قومی یک جہتی کا لفظ تو اس ملک میں پچھلی نصف صدی سے بولا جا رہا ہے، مگر اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کوئی حقیقی کام مطلق نہیں کیا گیا۔ یہ یقینی ہے کہ کانفرنس کرنا، یا پلے کارڈ لے کر سڑکوں پر مارچ کرنا وہ کام نہیں جس سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہو۔ اس کام کے لیے شعور کی تربیت کی ایک طویل اور مسلسل مہم درکار ہے، مگر قومی اتحاد کا نعرہ لگانے والوں میں سے کوئی بھی اب تک اپنے آپ کو اس کام کے لیے فارغ نہ کر سکا۔

مثال کے طور پر صحافت اس ذہنی انقلاب کو لانے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ آج ہمارے ملک میں ہزاروں کی تعداد میں اخبار اور رسالے نکل رہے ہیں۔ مگر ان میں سے کوئی ایک بھی اخبار یا رسالہ نہیں جو اس مقصد کے لیے وقف ہو۔ ہمارے تمام اخبار حقیقتہً سیاسی اخبار ہیں۔ اس کے بعد جو ہفت روزہ، پندرہ روزہ یا ماہنامے ہیں وہ سنسنی خیز مضامین چھاپ کر سستی تجارت کرنے کے سوا کچھ اور نہیں جانتے۔ شعور سازی کے اداروں کا جب یہ حال ہو تو وقتی اپیل جاری کرنے سے کیا فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

راقم الحروف پچھلے ۳۰ سال سے اپنے آپ کو تعمیری صحافت کو وجود میں لانے کے لیے وقف کیے ہوئے ہے۔ ماہنامہ الرسالہ (اردو اور انگریزی میں) ملک کا واحد ماہنامہ ہے جو تعمیر شعور کا کام کر رہا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ کام اس سے زیادہ بڑا ہے کہ ایک یا دو ماہنامہ اس کو انجام دے سکے۔

رہنماؤں کی ذمہ داری

حقیقت یہ ہے کہ عوام کو بدلنے کے لیے سب سے پہلے عوام کے رہنماؤں کو بدلنا ہے۔ ہماری قوم کے جو لکھنے اور بولنے والے ہیں، جن کو سن کر اور پڑھ کر لوگ اپنی رائیں بناتے ہیں، ان کی ایک فی صد تعداد بھی اگر اس قربانی پر آمادہ ہو جائے جو پہلی عالمی جنگ اور دوسری عالمی جنگ کے درمیان انگلینڈ کے فیبین لوگوں نے دی تھی۔ تو یقینی طور پر ہمارے ملک کا نقشہ بدل سکتا ہے۔

یہ لوگ یہ طے کر لیں کہ وہ سستی شہرت اور سستی تجارت کے راستہ کو چھوڑ کر خاموش تعمیری کام میں

اپنے آپ کو وقف کریں گے۔ وہ قوم کے اندر مثبت ذہن اور تعمیری مزاج بنانے میں اپنے زبان و قلم کی ساری طاقت خرچ کر دیں گے۔ اور اس کام کو مسلسل جاری رکھیں گے، یہاں تک کہ اسی پر ان کی موت آجائے۔ اگر ہماری قوم کے ذہین طبقہ کا ایک فی صد حصہ بھی یہ عزم کرلے تو مجھے یقین ہے کہ اس کا عزم ہمارے ملک کی تاریخ کو بدل سکتا ہے۔

پنڈت موتی لال نہرو سے کسی نے ایک بار پوچھا کہ جس آزادی کے لیے آپ کوشش کر رہے ہیں، وہ آزادی کب آئے گی۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں آزادی کا وقت تو نہیں جانتا، مگر میں یہ جانتا ہوں کہ اگر میں نے اس راہ میں اپنی جان دے دی تو میری لاش پر آزادی کا محل تعمیر ہو کر رہے گا۔

میں کہوں گا کہ ہمارے ملک کا دانشور طبقہ اگر تربیتِ شعور (Consciousness raising) کی مہم میں اپنے کو فنا کرنے کا عزم کرلے تو ہو سکتا ہے کہ وہ خود اپنے لیے کچھ نہ پا سکے، مگر یہ یقینی ہے کہ اس کی قربانی قوم کو نئی زندگی دینے کا سبب بن جائے گی۔

چھوٹا کام

تعمیر قوم کا کام تعمیر ذہن سے شروع ہوتا ہے، یہ ایک نہایت واضح بات ہے۔ یہ اتنی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اس کو سمجھنا کسی کے لیے مشکل نہیں ہو سکتا۔ اس کے باوجود کیا وجہ ہے کہ آج کوئی شخص نہیں جو اس اہم ترین کام میں اپنے آپ کو مصروف کیے ہوئے ہو۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرے کام جن میں لوگ مصروف ہیں، وہ کہنے اور سننے میں بڑے کام معلوم ہوتے ہیں۔ وہ فوراً اخبار میں چھپتے ہیں۔ ان کے ذریعہ صبح و شام میں آدمی کو شہرت و مقبولیت حاصل ہو جاتی ہے۔ یہی خاص وجہ ہے جس کی بنا پر تمام حوصلہ مند افراد جوق در جوق ان کاموں کی طرف دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ اور تعمیر شعور کا میدان بالکل خالی پڑا ہوا ہے۔

تعمیر شعور کا کام بظاہر ایک چھوٹا کام معلوم ہوتا ہے۔ وہ اخباروں میں نمایاں نہیں ہوتا۔ اس کے نام پر بھیڑ جمع نہیں ہوتی۔ اس کی اپیل پر بڑے بڑے چندے نہیں ملتے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اس کام کی اہمیت کو جانتے ہوئے بھی اس کی طرف راغب نہیں ہوتے۔

اگر قوم کے اندر چند ایسے افراد پیدا ہو جائیں جو اعلیٰ صلاحیت رکھتے ہوں، اور اسی کے ساتھ وہ اس بات کا ثبوت دیں کہ وہ چھوٹے کام کو بڑا کام سمجھنے کا حوصلہ رکھتے ہیں تو اس کے فوراً بعد

ملک و قوم کے مستقبل کی تعمیر کا کام شروع ہو جائے گا، اور جب ایک صحیح کام شروع ہو جائے تو وہ لازماً اپنی منزل پر پہنچ کر رہتا ہے۔ راستہ کی کوئی بھی چیز اس کو روکنے والی نہیں۔

احتساب غیر، احتساب خویش

آج ہمارے تمام اخبارات اور تمام جلسے، خواہ وہ ہندوؤں کے ہوں یا مسلمانوں کے، سیاسی باتوں سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے لوگوں کو سیاسی موضوعات کے سوا کسی اور موضوع پر کچھ کہنا آتا ہی نہیں۔

یہ صورت حال دراصل خود لکھنے اور بولنے والوں کی اپنی کمزوری پر مبنی ہے۔ سیاست کے موضوع پر کلام کرنا گویا دوسروں کے خلاف کلام کرنا ہے، اور تعمیر کے موضوع پر کلام کرنا خود اپنے خلاف کلام کرنا۔ سیاسی موضوعات میں خارجی پارٹیاں، خارجی شخصیتیں، خارجی واقعات زیر بحث آتے ہیں۔ اس کے برعکس تعمیری موضوعات میں داخلی مسائل اور اندرونی کمزوریاں زیر بحث لائی جاتی ہیں۔ سیاسی موضوع پر بولنا دوسروں کو ذمہ دار ٹھہرانا ہے، تعمیری موضوع پر بولنا اپنے آپ کو ذمہ دار ٹھہرانا۔ ایک لفظ میں، سیاست دوسروں کا احتساب ہے اور تعمیر خود اپنا احتساب۔ اور یہ معلوم بات ہے کہ دوسروں کا احتساب آدمی کے لیے سب سے زیادہ محبوب چیز ہے اور اپنا احتساب آدمی کے لیے سب سے زیادہ مبغوض چیز۔

لیکن اگر ملک کو ترقی کی طرف لے جانا ہے تو ہمارے لکھنے اور بولنے والوں کو لازماً یہی مبغوض کام کرنا پڑے گا۔ اس کے سوا مستقبل کی تعمیر کی کوئی اور صورت ممکن نہیں۔

حل کی طرف

ہندستان کے سابق وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو پر ایک کتاب لندن سے شائع ہوئی ہے۔ اس کو مسٹر ایم جے اکبر نے مرتب کیا ہے اور وہ ۶۰۰ صفحات پر مشتمل ہے:

M.J. Akbar, *Nehru: The Making of India*, 1988

اس کتاب میں نہرو کی زندگی سے متعلق کافی معلومات درج ہیں۔ اس کے باب ۴۷ میں مولف نے لکھا ہے کہ ۱۹۵۷ کے الکشن کے بعد جب کیرالا میں کمیونسٹ پارٹی نے وزارت بنائی تو نئی دہلی کی ایک مجلس میں اس کا ذکر آیا۔ ایک ہال میں حکومت کے بڑے بڑے افسروں کے ساتھ نہرو بحیثیت وزیر اعظم شریک تھے۔ گفتگو کے دوران مسٹر وائی ڈی گنڈیویا نے کہا کہ جناب، کیرالا میں کمیونسٹوں نے اپنی حکومت بنالی ہے۔ اگر وہ کل کے الکشن میں دوبارہ جیت جائیں اور دہلی کی حکومت پر قبضہ کرلیں تو اس کے بعد مرکز کا کیا حال ہوگا۔

نہرو نے جواب دینے سے پہلے تھوڑی دیر سوچا اور پھر بولے "کمیونسٹ، کمیونسٹ، کمیونسٹ، آخر آپ لوگ کمیونسٹوں سے اور کمیونزم سے اس قدر گھبراتے کیوں ہیں۔ آپ کیوں ایسا سوچتے ہیں کہ کمیونسٹ مرکز میں اقتدار حاصل کرلیں گے۔" اس کے بعد نہرو دوبارہ چپ ہوگئے۔ پھر رک رک کر اور اعتماد کے لہجہ میں ان کی زبان سے یہ الفاظ نکلے کہ "ہندستان کے لیے خطرہ، اچھی طرح جان لیجئے، کمیونزم نہیں، یہ دائیں بازو کی ہندو فرقہ پرستی ہے:

**The danger to India, mark you, is not Communism.
It is Hindu right-wing communalism (p. 580).**

مسٹر گنڈیویا جنھوں نے اپنی کتاب **Outside the Archives** میں یہ واقعہ لکھا ہے، ان کا کہنا ہے کہ نہرو نے اس مجلس سے اٹھنے سے پہلے اپنے مذکورہ جملہ کو کئی بار دہرایا۔

جواہر لال نہرو کو مہاتما گاندھی نے اپنا سیاسی جانشین **(Political successor)** بنایا تھا۔ چنانچہ آزادی کے بعد وہ ہندستان کے وزیر اعظم بن گئے۔ تاہم جواہر لال اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک نرم آدمی تھے۔ دوسری طرف کیبنٹ میں ان کے رفیق سردار پٹیل ایک آہنی انسان کہے جاتے

تھے۔ سردار پٹیل مزاجاً سخت متعصب تھے، اسی کے ساتھ مرکزی حکومت میں امور داخلہ کا شعبہ ان کے پاس تھا۔

آزادی (۱۹۴۷) کے فوراً پہلے اور اس کے بعد ملک میں جو فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوئے۔ ان کو دبانے کی اصل ذمہ داری سردار پٹیل کی تھی۔ مگر انھوں نے اس معاملہ میں ڈھیل دینے کی پالیسی اختیار کی۔ جواہر لال نہرو کو اس مسئلہ پر سردار پٹیل سے سخت اختلاف تھا۔ بدرالدین طیب جی نے اپنی خودنوشت سوانح عمری میں لکھا ہے کہ اگر نہرو نے اس معاملہ میں اس وقت مضبوط موقف اختیار کیا ہوتا، وہ سردار پٹیل کی مخالفت کرتے جب کہ ابھی مہاتما گاندھی زندہ تھے تو ہندستان کی سیاست کا رخ بالکل دوسرا ہوتا:

If he had taken a stand then, opposing Sardar Patel while Gandhi was still alive, Indian politics would have taken quite a different turn.
Badruddin Tayabji, *Memoirs of An Egoist*, vol. I, p. 186.

میرے نزدیک یہ بات اتنی سادہ نہیں ہے۔ نہرو ایک طرف آزاد ہندستان کے مسائل رکھتے تھے جن سے نمٹنے کے لیے انھیں ایک سخت ہاتھ کی ضرورت تھی۔ مثال کے طور پر ۵۰۰ دیسی ریاستوں کا مسئلہ، اس کو سردار پٹیل کے سخت ہاتھ نے جس طرح حل کیا، غالباً نہرو کے لیے اس طرح اس کا حل کرنا ممکن نہ ہوتا۔ دوسری بات یہ کہ پٹیل کسی ایک شخص کا نام نہ تھا، وہ دراصل ہندو فرقہ پرستی کے پورے گروپ کی علامت تھا۔ یہ گروپ اتنا طاقتور تھا کہ اس نے اسی سوال پر خود گاندھی کو قتل کر دیا۔ پھر نہرو کے لیے کیوں کر ممکن تھا کہ وہ اس پر قابو پالیتے۔

کسی دوسرے کی کمزوری سے زیادہ یہ خود ہندو فرقہ پرستی کی طاقت تھی جس نے نہرو کو دبالیا۔ اسی نے مہاتما گاندھی کو گولی کا نشانہ بنایا۔ راج گوپال اچاری کو سیاست سے بے دخل کر دیا اور اکشے برہم چاری جیسے کتنے منصف مزاج ہندوؤں کو عاجز کر کے چھوڑ دیا۔ وغیرہ

نہرو نے جس خطرہ کی نشاندہی کی تھی، وہ آج ایک واقعہ بن چکا ہے۔ آج ہندو فرقہ پرستی اپنی پوری طاقت کے ساتھ جاگ اٹھی ہے اور اپنے بھیانک نتائج دکھا رہی ہے۔ آج بھی ہندوؤں میں ایسے ہوشمند اور انصاف پسند لوگ موجود ہیں جو اس کے خلاف آواز اٹھا رہے

ہیں۔ اخبارات ورسائل کا مطالعہ کرنے والوں کے سامنے برابر اس کی مثالیں آتی رہتی ہیں۔ یہاں ہم صرف ایک مثال کا ذکر کرتے ہیں۔

مشہور ہندی ہفت روزہ پانچ جنیہ (۶ نومبر ۱۹۸۸) میں مسٹر اٹل بہاری باجپئی کا انٹرویو شائع ہوا ہے جو ہر محب وطن کے لیے پڑھنے کے قابل ہے۔ اس کا عنوان اس پورے انٹرویو کا خلاصہ ہے:

پرتی کریا میں جناجاگرن پیچھے ڈھکیلتا ہے

یعنی ردّعمل کے ذریعہ جو بیداری آئے، وہ قوم وملک کو آگے نہیں بڑھاتی، بلکہ پیچھے کی طرف لے جاتی ہے۔ جس طرح مسلمانوں میں بہت سے لوگ مسلمانوں کی ردعمل کی تحریکوں کو صحوہ اسلامیہ کا نام دیتے ہیں۔ اسی طرح ہندوؤں میں بہت سے خوش فہم لوگ ہیں جو ہندوؤں کے درمیان مسلم ردّعمل کے تحت اٹھنے والی لہر کو "ہندو بیداری" کا نام دے رہے ہیں۔ مسٹر باجپئی نے ایسے ہندوؤں کو آگاہی دی ہے کہ یہ ایک منفی بیداری ہے، اور منفی بیداری ہمیشہ تباہی کا باعث ہوتی ہے، وہ تعمیر کا سبب نہیں بنتی۔

کوئی شخص خواہ کتنے ہی بڑے سیاسی عہدہ پر ہو، اس کو کبھی بے قید اختیار حاصل نہیں ہوتا۔ جنرل محمد ضیاء الحق ساڑھے گیارہ سال (۸۸ – ۱۹۷۷) تک پاکستان کے مطلق حکمراں رہے۔ مگر پاکستان کی جو طاقتیں ملک کے لیے خطرہ بنی ہوئی ہیں، ان میں سے کسی ایک پر بھی وہ ہاتھ نہ ڈال سکے ــــــ مثلاً بڑے بڑے جاگیردار، اسمگلر، منشیات اور ہتھیاروں کا کاروبار کرنے والے، بیوروکریسی، رشوت لینے اور دینے والے، ٹیکس کی چوری کرنے والے، علاحدگی پسند سیاست داں، وغیرہ

میں اس کو ناممکن سمجھتا ہوں کہ کوئی وزیر یا حکمراں ہندستان کے اس مسئلہ کو حل کر سکتا ہے جس کو نہرو نے "ہندو فرقہ پرستی" کہا ہے۔ ہندو فرقہ پرستی تمام تر مسلم فرقہ پرستی کا ردعمل ہے، اور یہ صرف مسلمان ہیں جو قرآن کے اصول کے مطابق، صبر اور اعراض کی پالیسی اختیار کر کے اس کو ہمیشہ کے لیے ختم کر سکتے ہیں۔

ہندستان کے مسلمان اس "ہندو فرقہ پرستی" کے جواب میں آج بھی ٹھیک وہی طریقہ

اختیار کیے ہوئے ہیں جو انھوں نے ۱۹۴۷ سے پہلے مسلم لیگی لیڈروں کی رہنمائی میں اختیار کیا تھا، یعنی ہندو فرقہ سے براہ راست لڑنا، اس کے خلاف ایجی ٹیشن کرنا، اس کی مذمت میں اپنے تمام الفاظ خرچ کر دینا۔

۱۹۴۷ سے پہلے مسلمانوں نے جو سیاست اختیار کی، اس کے تجربہ نے بتایا کہ مذکورہ بالا قسم کی جوابی تحریک صرف فرقہ پرستی کے مسئلہ کو بڑھاتی ہے، وہ کسی بھی درجہ میں اسے کم نہیں کرتی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندستان کے مسلمان ۱۹۴۷ سے پہلے جس درجہ کی ہندو فرقہ پرستی سے دوچار تھے، آج اس میں سوگنا زیادہ اضافہ ہوگیا ہے، ایسی حالت میں سابقہ پالیسی پر قائم رہنے کا آخر کیا جواز ہے۔ کیا مسلمان ایک بل میں دو بار ہاتھ ڈال کر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حدیث کے مطابق، ان کو مومنانہ بصیرت حاصل نہیں، وہ سرے سے ایمان کی روشنی ہی سے محروم ہیں۔

مدعو نہ کہ حریف

مسلمانوں کو اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ ہندستان کی فرقہ پرستی کا واحد حل وہی ہے جو قرآن میں بتایا گیا ہے۔ یعنی صبر اور اعراض۔ مسلمانوں کو یہ فیصلہ کر لینا چاہیے کہ وہ یک طرفہ طور پر صبر اور اعراض کا طریقہ اختیار کریں گے، وہ ہر حال میں ردّ عمل کی روش سے بچیں گے۔ یہی پہلے بھی ان کے مسئلہ کا حل تھا اور آج بھی یہی ان کے مسئلہ کا حل ہے۔ اس کے سوا وہ تدبیریں جو ان کے بے ریش اور باریش رہنما ان کو بتا رہے ہیں، وہ صرف ہلاکت کی طرف لے جانے والی ہیں۔ وہ ہرگز منزل کی طرف لے جانے والی نہیں۔

مسلمان اب تک ہندوؤں کو اپنا حریف اور رقیب سمجھتے رہے ہیں۔ ان کا یہ رویہ سراسر باطل ہے۔ وہ خدا کے غضب کو دعوت دینے والا ہے۔ مسلمان کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ اس ملک میں خدا کے دین کے داعی ہیں۔ ہندو ان کے لیے مدعو کا درجہ رکھتے ہیں۔ مدعو اپنے داعی کا محبوب ہوتا ہے۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ ہندوؤں کے تئیں اپنے نفرت کے جذبات کو کھرچ کر نکال دیں۔ اور ان کے ساتھ محبت اور ہمدردی کے جذبہ کے ساتھ معاملہ کریں۔ یہی ان کے سارے مسائل کی کنجی ہے۔ یہی ان کی منزل کا آغاز ہے اور یہی ان کی منزل کا اختتام بھی۔

ایک تعلیم یافتہ ہندو جو انگریزی الرسالہ کے مستقل قاری ہیں۔ انھوں نے اپنے چار صفحہ کے

خط میں اپنا تبصرہ روانہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اگرچہ میں ایک پیدائشی ہندو ہوں مگر میں کسی بھی مذہب میں عقیدہ نہیں رکھتا۔ خواہ وہ ہندو مذہب ہو یا اور کوئی مذہب۔ البتہ میں انسانیت اور انسانی شرافت کا دل سے قائل ہوں۔ وہ مزید لکھتے ہیں :

> A large number of Hindus are orthodox and they are routinely busy making money and performing rituals and ceremonies for serving their selfish ends, at the same time trying to "buy" a berth in *swarg* in the next world. And because they have lots of material possessions, they know they will stand to lose much in consequence of riots. But when they are goaded to the end of their tether by other communities, they sometimes let their resentment erupt but not for a long period of time.
>
> K.L. Dutta, W. 6/110, Premnagar, Dehra Dun

ہندوؤں کی بڑی تعداد کٹر مذہبی ہے مگر وہ صبح و شام پیسہ کمانے میں مشغول رہتے ہیں۔ اور رسوم و روایات کی تعمیل میں لگے رہتے ہیں تاکہ اپنے خود غرضانہ مقاصد کو پورا کر سکیں۔ اور اسی کے ساتھ اس کوشش میں مصروف رہتے ہیں کہ وہ دوسری دنیا میں سورگ میں اپنے لیے ایک جگہ خرید سکیں۔ ان کے پاس وقت نہیں ہے کہ وہ فساد جیسی پرتشدد چیزوں میں حصہ لیں۔ اور چوں کہ ان کے پاس مادی ساز و سامان کافی موجود ہوتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ فسادات کے نتیجہ میں وہ بہت کچھ کھو دیں گے۔ مگر جب وہ دوسرے فرقوں کی طرف سے آخری حد تک چھیڑ دیے جاتے ہیں تو بعض اوقات ان کی ناراضگی ابل پڑتی ہے۔ مگر بہت زیادہ دیر تک کے لیے نہیں۔

مسٹر کے ایل دتہ کے اس نقطۂ نظر سے میں متفق ہوں۔ ہندو بنیادی طور پر ایک تاجر پیشہ قوم ہیں۔ اور فساد اور اس کے نتیجہ میں کرفیو کا سب سے زیادہ نقصان تاجر طبقہ ہی کو پہونچتا ہے۔ اس لیے اصولی طور پر ہندو، بحیثیت قوم، فساد کو پسند نہیں کر سکتے۔

پھر فساد کیوں ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندو سب کے سب تاجر نہیں ہیں۔ ان میں ایک طبقہ غیر تاجروں اور غریبوں کا ہے۔ یہی دوسرا طبقہ اکثر اوقات فساد کا ابتدائی سبب بنتا ہے۔ اس دوسرے طبقہ کا کوئی فرد ایک مسلمان کے ساتھ کوئی اشتعال انگیز کارروائی کرتا ہے، اور ایسا ہونا کسی آزاد سماج میں بالکل فطری ہے۔ اس وقت مسلمان بے برداشت ہو جاتا ہے۔ وہ اشتعال انگیزی کی صورت میں مشتعل ہو کر لڑنے لگتا ہے۔

اس کے بعد خود مسلمانوں کی دو قومی سیاست کے نتیجہ میں ایسا ہوتا ہے کہ دو فرد کا مسئلہ دو قوم کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ دونوں طرف کے لوگ اپنی اپنی قوم کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ قومی شکایات جو سوئی ہوئی تھیں، اچانک جاگ پڑتی ہیں۔ قومی ساکھ اور قومی حمیت کا مسئلہ بن جانے کی وجہ سے دونوں فرقوں میں سے کوئی شخص یہ ہمت نہیں کرتا کہ وہ اپنے فرقہ کے خلاف بولے۔ تمام لکھنے اور بولنے والے یک طرفہ طور پر اپنے فرقہ کی حمایت اور دوسرے فرقہ کی مذمت شروع کر دیتے ہیں۔ قومی حمایت کا یہی انداز ہندو بھی اختیار کرتے ہیں اور یہی انداز مسلمان بھی۔

اب فرقہ وارانہ فساد کو ختم کرنے کی تدبیر صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ مسلمان پورے عزم کے ساتھ یہ فیصلہ کرلیں کہ وہ اشتعال کے باوجود مشتعل نہ ہوں گے۔ وہ ہر حال میں صرف اعراض کی پالیسی اختیار کریں گے نہ کہ لڑنے اور مقابلہ کرنے کی پالیسی۔

اگر مسلمان پوری طرح یہ فیصلہ کرلیں تو یقینی طور پر وہ فساد کی جڑ کاٹ دیں گے۔ اس کے بعد ہر چنگاری اپنے ابتدائی مرحلہ میں بجھ کر رہ جائے گی، وہ فساد اور قتل و خون کے مرحلہ تک نہ پہونچے گی۔ جہاں بھی مسلمانوں نے اعراض کا طریقہ اختیار کیا ہے، وہاں لازمی طور پر ایسا ہی پیش آیا ہے۔

مسلمان اگر پوری طرح اعراض کی پالیسی اختیار کرلیں تو ابتدائی اشتعال کا ہر واقعہ صرف ایک شخصی واقعہ بن کر رہ جائے گا۔ وہ دو قوموں کے وقار کا مسئلہ نہیں بنے گا۔ اس کے بعد پولیس سے بھی مسلمانوں کی شکایت ختم ہو جائے گی۔ پولیس مسلمانوں کے لیے اس وقت ظالم بنتی ہے جب کہ مسئلہ دو قومی صورت اختیار کرلے۔ دو قومی صورت اختیار کرنے کے بعد مسلمان پولس کی گولی کا نشانہ بنتے ہیں۔ لیکن اگر مسئلہ دو قومی نہ بنے تو وہ افراد پولیس کی گولی کا نشانہ بنیں گے جنھوں نے ابتدائی طور پر شرارت کی تھی۔

مسجد اور مسلمان

مسجد اور مسلمان

اس وقت میں اجودھیا کی بابری مسجد کے بارہ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں، ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو بابری مسجد ڈھادی گئی۔ پوری زمین صاف کرکے وہاں ایک عارضی مندر بنادیا گیا جس پر روزانہ پوجا اور درشن کیا جارہا ہے۔

۶ دسمبر کے اس واقعہ کے بعد اب صورت حال بالکل بدل چکی ہے۔ اس لیے اب ہمیں نئے حالات کے مطابق اپنے کام کا نقشہ بنانا ہے۔ ہمارا ایسا کرنا اسلامی شریعت کے عین مطابق ہوگا۔ کیوں کہ شریعت کا مستقل اصول ہے کہ حالات کے بدلنے سے احکام بدل جاتے ہیں۔

مسلمانوں نے بابری مسجد کے سوال پر بڑی بڑی تحریکیں اٹھائیں۔ خاص طور پر آخری چھ سال کے دوران وہ جان و مال کی زبردست قربانی دے کر اس مہم کو چلاتے رہے ہیں مگر اس کے باوجود بابری مسجد کو بچانا ان کے لیے ممکن نہ ہوسکا۔ ایسی حالت میں سابقہ انداز کی احتجاجی تحریک جاری رکھنا سراسر نادانی ہوگی۔ ایسی تحریک کا اسلام سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ کیوں کہ اسلام نتیجہ خیز عمل کی تلقین کرتا ہے۔ جس عمل کا کوئی نتیجہ نکلنے والا نہ ہو وہ عمل اسلام کے مطابق نہیں۔

۶ دسمبر سے پہلے ہمارے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ بابری مسجد کو کس طرح بچائیں۔ ۶ دسمبر کے بعد اب یہ مسئلہ ہے کہ مسلمانوں کو کس طرح بچایا جائے اور اجودھیا کی قسم کے واقعہ کو کسی اور مقام پر دہرانے کو کس طرح روکا جائے۔ شریعت کی روشنی میں پوری طرح سوچ بچار کرنے کے بعد اس کے حل کے لیے میں نے تین نکاتی فارمولا پیش کیا ہے جو کہ اس طرح ہے :

مسلمان بابری مسجد کے بارہ میں اپنے ایجی ٹیشن کو ختم کر دیں۔

ہندو اپنی مندر۔ مسجد تحریک کو اجودھیا ہی میں ہمیشہ کے لیے اسٹاپ کر دیں۔

گورنمنٹ عبادت گاہوں کے تحفظ کے ایکٹ (۱۹۹۱) کو دستور ہند کا جزء بنا دے۔

جیسا کہ واضح ہے، اجودھیا کے مسئلہ میں تین فریق ہیں۔ مسلمان، ہندو اور حکومت۔ مذکورہ فارمولے میں ان تینوں کو لیا گیا ہے۔ تینوں سے ایسی مانگ کی گئی ہے جو پوری طرح ان کے لیے قابل عمل ہے۔ اگر تینوں فریق، اس فارمولے کو مان لیں تو اس کے بعد انشاء اللہ انڈیا کی تاریخ

میں ایک نیا دور شروع ہو جائے گا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات اچھے ہو جائیں گے۔ ملک میں امن قائم ہوگا۔ خوف اور تشدد کی فضا ختم ہو جائے گی جو دیش کی ترقی کے راستہ میں مستقل رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔

دوسری بات جو میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں وہ مسجد اور مسلمان کا فرق ہے۔ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے الگ ہیں اور ان میں نوعی فرق پایا جاتا ہے۔ ایک سوال یہ ہے کہ مسجد کا حکم شریعت میں کیا ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ مسجد سے متعلق مسلمانوں کے رویہ کے بارہ میں شرعی حکم کیا ہے۔ ایک مسئلہ کا تعلق مسجد کی اپنی حیثیت سے ہے۔ دوسرے مسئلہ کا تعلق مسجد کے بارہ میں مسلمانوں کی ذمہ داری سے ہے۔

یہ دونوں باتیں مکمل طور پر ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ شریعت کے اعتبار سے جو مسجد کی پوزیشن ہے وہی اس معاملہ میں مسلمانوں کی ذمہ داری بھی ہے۔ یا مسلمانوں کی جو ذمہ داری ہے وہی خود مسجد کی اپنی پوزیشن بھی ہے۔

فرق کے اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے ایک مثال لیجئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو کعبہ میں ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ مگر اس وقت قرآن میں جو آیت اتری وہ یہ نہیں تھی کہ طھر الکعبۃ من الاصنام (کعبہ کو بتوں سے پاک کرو) بلکہ یہ کہا گیا کہ وثیابک فطھر (اپنے کپڑے کو پاک کر۔ یعنی اخلاق کو درست کرو) مکی دور میں اسی قسم کی آیتیں اترتی رہیں۔

ان آیتوں کا تعلق اس مسئلہ سے نہیں تھا کہ کعبہ کے اندر بت رکھنے کا شرعی حکم کیا ہے۔ بلکہ ان کا تعلق صرف اس مسئلہ سے تھا کہ مکہ جیسے حالات میں مسلمانوں کی اپنی ذمہ داری کیا ہے۔

اس فرق کو سامنے رکھتے ہوئے اب بابری مسجد کے معاملہ میں غور کیجئے۔ جہاں تک نفس مسجد کا تعلق ہے، اس کے بارہ میں متفقہ طور پر شریعت کا حکم یہ ہے کہ جس جگہ جائز طور پر ایک مسجد بنا دی جائے وہ جگہ ہمیشہ کے لیے مسجد کی جگہ ہو جاتی ہے۔ مسلمانوں کو اس میں تبدیلی کا کوئی حق نہیں رہتا۔

دوسرا پہلو یہ کہ کسی مسجد کے ساتھ اگر اس قسم کے واقعات پیش آئیں جیسے واقعات اجودھیا میں پیش آئے ہیں تو ایسی صورت میں مسلمانوں کی اپنی ذمہ داری کیا ہے۔ ایسے معاملہ میں ایک صورت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبد المطلب کی طرح مسلمان یہ کہہ کر اس سے الگ

ہو جائیں کہ مسجد خدا کی چیز ہے، وہی جس طرح چاہے گا اس کی حفاظت کرے گا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مسلمان خاموش نہ رہیں بلکہ وہ مسجد کے تحفظ کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ اگر مسلمان ایسا کریں تو ان کے اس عمل کی بھی ایک حد ہوگی۔ ایک حد تک جانے کے بعد انھیں دوبارہ اس معاملہ میں چپ ہو جانا پڑے گا۔ یہ حد قرآن کی اس آیت میں بتائی گئی ہے کہ: لا یکلف اللہ نفساً الا وسعہا (البقرہ ۲۸۶) اللہ کسی پر ذمہ داری نہیں ڈالتا مگر اس کی طاقت کے مطابق۔ یعنی کسی مومن فرد یا کسی مومن گروہ کے بس میں جتنا کچھ ہو، صرف اتنے ہی کے لیے وہ مکلّف ہے۔ اپنے بس سے باہر کی ذمہ داری کسی مسلم فرد یا کسی مسلم گروہ کے اوپر نہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ مسجد کا حکم بتانے کے لیے تو یہ کہنا صحیح ہے کہ مسجد جس جگہ جائز طور پر بنا دی جائے وہ ہمیشہ کے لیے مسجد ہو جاتی ہے۔ مگر مسجد کے تئیں مسلمانوں کی ذمہ داری کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ جب سوال یہ ہو کہ کسی مسجد کے تحفظ کے لیے مسلمانوں کی ذمہ داری کیا ہے تو وہاں مذکورہ مسئلہ بیان کرنا اصل سوال کا صحیح جواب نہ ہوگا۔ اس دوسری صورت میں مسلمانوں کی اپنی حالت ان کے لیے شرعی حکم کا فیصلہ کرے گی نہ کہ نظری اعتبار سے مسجد کی شرعی حیثیت۔

اس شرعی اصول کو سامنے رکھتے ہوئے بابری مسجد اور مسلمان کے مسئلہ پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اب اس معاملہ میں مسلمانوں کی کوئی شرعی ذمہ داری نہیں ہے۔ اگر ان کے اوپر بابری مسجد کے تحفظ کی ذمہ داری تھی تو اس ذمہ داری کو وہ قربانی کی حد تک جا کر ادا کر چکے ہیں۔ انھوں نے اپنی پوری طاقت کے ساتھ بابری مسجد کو بچانا چاہا مگر وہ اس کو نہ بچا سکے۔

اس اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ۶ دسمبر کو اس معاملہ میں مسلمانوں کی ذمہ داری کی آخری حد آچکی ہے۔ اب وہ شریعت کی رو سے بالکل حق بجانب ہیں کہ اس معاملہ سے اپنے آپ کو الگ کر کے اس کو مستقبل کے حالات کے حوالے کر دیں۔

۶ دسمبر کے حادثہ کے بعد اس معاملہ میں نوعی اور بنیادی تبدیلی ہوئی ہے۔ وہ یہ کہ اب مسئلہ بابری مسجد کے تحفظ کا نہیں ہے۔ اب اصل مسئلہ خود مسلمانانِ ہند کے تحفظ کا ہے۔ اب اگر مسلمان اپنی اس احتجاجی تحریک کو مزید جاری رکھیں جو اس اشو پر وہ ۶ دسمبر سے پہلے چلا رہے

تھے تو یقینی طور پر اس کا نتیجہ یہ نہیں نکلے گا کہ مذکورہ مقام پر دوبارہ بابری مسجد بن کر کھڑی ہوجائے۔ اس کے برعکس عملاً جو نتیجہ نکلے گا وہ یہ کہ مسلمان پورے ملک میں فسادات کی زد میں آجائیں گے۔ وہ بے شمار ایسی مشکلوں میں گھر جائیں گے کہ اس ملک میں عزت کے ساتھ رہنا ہی ان کے لیے دشوار ہو جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ ۶ دسمبر کے بعد دو اور دو چار کی طرح یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اس معاملہ میں اب مسلمانوں کے لیے جو انتخاب ہے وہ بابری مسجد بنانے یا بابری مسجد نہ بنانے کے درمیان نہیں ہے، بلکہ بابری مسجد اور ملت کی تباہی کے درمیان ہے۔ یعنی مسلمان اگر دوبارہ اسی مقام پر بابری مسجد تعمیر کرنے کی مہم چلائیں تو اس کے نتیجہ میں یہ نہیں ہونے والا ہے کہ بابری مسجد اپنے اصل مقام پر بن کر کھڑی ہو جائے۔ اس کے برعکس جو ہوگا وہ یہ کہ انڈیا کے مسلمان ناقابلِ بیان تباہی میں پھنس کر رہ جائیں۔

یہاں میں آپ کو ایک اور شرعی حکم یاد دلاتا ہوں جو بہت زیادہ اس مسئلہ سے متعلق ہے۔ اس حکم کو قرآن کی زبان میں اضطرار کہا جاتا ہے۔ مثلاً خنزیر کا گوشت کھانا اسلام میں مطلق حرام ہے۔ لیکن ایک شخص اگر مضطر ہو جائے۔ یعنی وہ ایسی صورت حال میں مبتلا ہو جائے کہ اس کے پاس کھانے کے لیے صرف خنزیر کا گوشت ہو۔ اس کے لیے دو میں سے ایک کو انتخاب کرنے کا موقع ہو۔ یا تو وہ خنزیر کا گوشت کھا کر اپنی جان بچائے یا پھر بھوک سے مر جائے۔ ایسی حالت میں شریعت کا حکم یہ ہے کہ اس آدمی کو خنزیر کا گوشت کھا لینا چاہیے۔ کیوں کہ جان بوجھ کر اپنے کو ہلاک کرنا اسلام میں جائز نہیں۔

اس شرعی اصول کی روشنی میں دیکھئے تو آج یہی نازک مسئلہ انڈیا کے پورے مسلم گروہ کے لیے پیدا ہو گیا ہے۔ پھر جو شریعت ایک جان کو بچانے کے لیے حرام غذا کو حلال کر دیتی ہے، وہ شریعت کیا بارہ کروڑ انسانوں کے ایک مسلم گروہ کو ہلاکت سے بچانے کے لیے انھیں کوئی رعایت نہ دے گی۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ بابری مسجد کو بچانا مسلمانوں کی قومی ذمہ داری تھی، تب بھی موجودہ حالت میں یہ ذمہ داری ان سے ساقط ہو جاتی ہے۔ اب خود شریعت کے حکم اضطرار کے تحت

ان کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ بابری مسجد کے مسئلہ سے الگ ہو جائیں تاکہ اپنے آپ کو مزید ذلت اور ہلاکت سے بچا سکیں۔

صحیح بخاری میں روایت ہے کہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ : ماخُیّر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین امرین الا اختار ایسرھما (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی دو امر میں سے ایک امر کو انتخاب کرنا ہوتا تو آپ ہمیشہ آسان کا انتخاب فرماتے)

اس حدیث کو سامنے رکھ کر سوچئے تو اس وقت مسلمانوں کے لیے دو میں سے ایک چیز کے انتخاب کا موقع ہے۔ ایک یہ کہ بابری مسجد کے اشو سے خود کو الگ کر کے اس کو ملک کے ضمیر کے حوالے کر دیں۔ دوسرے یہ کہ بابری مسجد کے لیے وہ اپنی لڑائی جاری رکھیں۔ دونوں صورتوں کا تقابل کیجئے تو یقینی طور پر پہلی صورت آسان اور دوسری صورت انتہائی مشکل ہے۔ ایسی حالت میں عین سنتِ رسول کا تقاضا ہے کہ مسلمان آسان صورت کو اپنا لیں اور مشکل صورت کو چھوڑ دیں۔

اس روش کو اختیار کر کے مسلمان کوئی نئی بات نہیں کریں گے۔ وہ وہی کریں گے جس پر وہ تقریباً پچاس سال سے اس ملک میں عمل کرتے رہے ہیں۔ جیسا کہ معلوم ہے، ۱۹۴۷ میں پنجاب، ہریانہ اور راجستھان میں ہزاروں کی تعداد میں مسجدیں ڈھائی گئیں مختلف طریقوں سے ان کی بے حرمتی کی گئی۔ مگر مسلمانوں نے کبھی بھی ان مسجدوں کے نام پر کوئی ایجی ٹیشن نہیں چلایا۔ کیوں کہ اس معاملہ میں انھوں نے اپنے کو مضطر پایا تھا۔ اب اگر وہ بابری مسجد کو بھی اسی فہرست میں شامل کر لیں تو یہ عین وہی ہوگا جس پر اس سے پہلے سے وہ عملاً قائم رہے ہیں۔

میں نے جو تین نکاتی فارمولا پیش کیا ہے وہ باعتبار حقیقت کوئی نئی چیز نہیں۔ یہ اجودھیا کی مسجد کے معاملہ میں اسی اصول کو باعزت طور پر لاگو کرنا ہے جو عملاً ملک کی ہزاروں مسجدوں کے بارہ میں تمام علماء کی مرضی سے اختیار کیا جا چکا ہے۔

اس تین نکاتی فارمولے میں ایک طرف مسلمان مزید جان و مال کی ہلاکت سے بچ جاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ فریق ثانی اس کے ذریعہ اس بات کا پابند ہو جاتا ہے کہ وہ اجودھیا جیسے عمل کو ملک کی کسی اور مسجد کے ساتھ کبھی نہ دہرائے۔ تیسرے یہ کہ اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کو اپنی

عبادت گاہوں کے لیے ایک محکم دستوری ضمانت مل جاتی ہے۔

جیسا کہ میں نے کہا، اس فارمولے کا مقصد مسجد کے بارہ میں شرعی حکم کو بتانا نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ مسلمانوں کی اپنی ذات کے اعتبار سے اس معاملہ میں ان کے لیے شریعت کا حکم کیا ہے۔

اس فارمولے کو مان کر اگر اس کی تعمیل کر دی جائے تو اس کا غیر معمولی فائدہ مسلمانوں کو اور پورے ملک کو ملے گا۔ اس کے بعد ملک میں امن قائم ہو جائے گا۔ نفرت اور تشدد کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ اس طرح مسلمانوں کو اور دوسرے تمام طبقوں کو یہ موقع مل جائے گا کہ وہ اپنی زندگی کی تعمیر میں پُرامن طور پر لگ سکیں۔ وہ کسی رکاوٹ کے بغیر ترقی اور کامیابی کی طرف اپنا سفر شروع کر دیں۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب پر اپنا رحم فرمائے۔ اس ملک کے تمام لوگوں کو سچی سمجھ دے تاکہ وہ اس ملک کو ایک ترقی یافتہ ملک بنا سکیں۔

نوٹ: ایک تقریر جو ۱۵ فروری ۱۹۹۲ کو دہلی میں کی گئی۔

اجودھیا کا مسئلہ

نئی دہلی کے ادارہ مرکز برائے پالیسی ریسرچ (Centre for Policy Research) کے ہال میں ۵ مارچ ۱۹۹۳ کو ایک میٹنگ ہوئی۔ اس میں ملک کے ممتاز دانشور تقریباً چالیس کی تعداد میں شریک ہوئے۔ اس کا موضوع اجودھیا اور اس کے بعد مسائل پر مذاکرہ کرنا تھا۔ اظہار خیال کی زبان انگریزی تھی۔ ذیل کی تقریر اسی موقع پر پیش کی گئی۔

آج کی اس میٹنگ کے لیے بحث کا موضوع اجودھیا اور اس کے بعد ہے۔ اس بحث کے کئی پہلو ہو سکتے ہیں۔ میں خاص طور پر اس پہلو پر کچھ باتیں عرض کروں گا کہ اجودھیا میں ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کا واقعہ پیش آنے کے بعد انڈیا میں سیکولرزم کا مستقبل کیا ہے۔

کچھ لوگ اس بارہ میں منفی رائے رکھتے ہیں۔ مگر میں ذاتی طور پر اس بارہ میں پُرامید ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ۶ دسمبر کے حادثہ نے اس ملک میں سیکولرزم کی اہمیت کو ازسرنو ثابت شدہ بنایا ہے۔ وہ ملک کے سیکولر عناصر کو یہ موقع دے رہا ہے کہ وہ یہاں سیکولرزم کو مزید قوت کے ساتھ قائم کر سکیں۔

۶ دسمبر کو اجودھیا میں جو واقعہ پیش آیا وہ تشدد کا واقعہ تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مندر۔مسجد تحریک کے علم برداروں نے محسوس کیا کہ وہ پُرامن طور پر اپنے مقصد کو حاصل نہیں کر سکتے۔ اس لیے وہ تشدد پر آمادہ ہو گئے۔

مگر تشدد کی فطرت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ الٹا نتیجہ دینے والا (counter productive) ثابت ہوتا ہے۔ تشدد کرنے والا اپنے خیال کے مطابق، اپنے حریف کی نفی کر رہا ہوتا ہے۔ مگر نتیجہ کے لحاظ سے تشدد خود صاحب تشدد کی نفی ہے۔ تشدد صاحب تشدد کی نظریاتی صداقت کی تردید ہے۔ اس اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ۶ دسمبر دراصل اس دن کی علامت ہے جب کہ مندر۔مسجد تحریک اپنے آخری منطقی انجام کو پہنچ گئی۔

اس واقعہ کے بعد سیکولرزم کی اہمیت ازسرنو ثابت ہو گئی ہے۔ سیکولرزم کیا ہے۔ سیکولرزم کا

مطلب سادہ طور پر یہ ہے کہ اسٹیٹ کا نظام مشترک مادی مقاصد کی بنیاد پر چلایا جائے۔ اور غیر مشترک امور میں ریاست عدم تدخل (non-interference) کی پالیسی اختیار کرے۔

انڈیا ایک پلورل سوسائٹی ہے۔ اس لیے انڈیا کے لیے سیکولرزم ہی واحد درست آئیڈیالوجی ہے۔ اس ملک میں سیکولر آئیڈیالوجی ہی نیشنل آئیڈیالوجی بن سکتی ہے۔ دوسری جو بھی آئیڈیالوجی اختیار کی جائے گی وہ ریجنل آئیڈیالوجی یا سیکٹیرین آئیڈیالوجی ہوگی۔ اور ایسی کوئی آئیڈیالوجی کبھی عمومی سطح پر قابل قبول نہیں بن سکتی۔

سیکولر آئیڈیالوجی کے سوا جو آئیڈیالوجی بھی اختیار کی جائے گی وہ اپنی عین نیچر کے اعتبار سے اسی متشددانہ نوبت تک پہنچے گی جس کی ایک مثال ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو سامنے آئی ہے۔ تشدد کا مقصد موقف کی کمزوری کی تلافی ہوتا ہے۔ اصولی تائید کی کمی کو آدمی طاقت کے ذریعہ پورا کرنا چاہتا ہے۔ اس سے تشدد ظہور میں آتا ہے۔

۶ دسمبر نے یہ ثابت کیا ہے کہ سیکولر آئیڈیالوجی کے سوا جو آئیڈیالوجی بھی یہاں اپنائی جائے گی وہ اپنی محدود اپیل کی بنا پر آخر کار تشدد کا سہارا لے گی۔ اس طرح وہ باعتبار نتیجہ دیش کی شانتی کو بھنگ کرنے کا ذریعہ بن جائے گی۔ یہ صرف سیکولر آئیڈیالوجی ہے جو اپنی وسیع اپیل کی بنا پر دیش میں شانتی کا سماج بنا سکتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ جنھوں نے ۶ دسمبر سے پہلے مندر۔ مسجد تحریک کا ساتھ دیا تھا، وہ اس کا نتیجہ دیکھ لینے کے بعد اب اس سے برارت ظاہر کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر بنارس کے بیوپار منڈل اور لکھنؤ کے بیوپار منڈل نے پُر زور طور پر کہا ہے کہ مذہب اور عقیدہ کے معاملہ کو سیاست سے باہر رکھنا چاہیے، حالانکہ اس سے پہلے یہ لوگ اس تحریک کے مددگار بنے ہوئے تھے۔

سابق وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے کہا تھا کہ انڈیا یا تو سیکولر انڈیا کے طور پر باقی رہے گا یا وہ سرے سے باقی ہی نہ رہے گا:

India will survive as a secular India or not at all.

یہی بات موجودہ وزیر اعظم مسٹر پی وی نرسمہا راؤ نے ان لفظوں میں کہی کہ ہمارا

ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا اگر ہم نے سیکولرزم کا راستہ چھوڑ دیا :

The country will go to pieces if we leave the path of secularism.

یہ بات بالکل درست ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ملک میں صرف سیکولر آئیڈیالوجی ہی نیشنل آئیڈیالوجی بن سکتی ہے۔ دوسری ہر آئیڈیالوجی محدود آئیڈیالوجی ہوگی۔ اور کوئی محدود آئیڈیالوجی کبھی نیشنل آئیڈیالوجی کا بدل نہیں بن سکتی۔

انڈیا میں اگرچہ ۵ ۷ فی صد لوگ سیکولر آئیڈیالوجی میں یقین رکھتے ہیں۔ مگر ۶ دسمبر کے واقعہ نے جو ذہنی انتشار پیدا کیا ہے اس کے بعد تمام لوگ یہ محسوس کر رہے ہیں گویا کہ وہ کسی بند گلی میں آکر پھنس گئے ہیں جس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔

میرا تین نکاتی فارمولا قوم کو اسی بند گلی سے نکالنے کی ایک کوشش ہے تین نکاتی فارمولا خود کوئی منزل نہیں ہے البتہ وہ موجودہ بند گلی سے نکلنے کی طرف ایک واضح اور متعین آغاز ہے۔ اس فارمولے کو مان لینے کے بعد پھر سے ہمارے لیے وہ راستہ کھل جاتا ہے جس کی روشنی میں ہم دوبارہ تعمیر و ترقی کی طرف اپنا سفر جاری کر سکیں۔ یہ فارمولا مختصر طور پر یہ ہے :

- مسلمان بابری مسجد کے بارہ میں اپنا ایجی ٹیشن مکمل طور پر ختم کر دیں۔
- ہندو اپنے مندر۔مسجد اندولن کو اجودھیا ہی میں ہمیشہ کے لیے اسٹاپ کر دیں۔
- گورنمنٹ عبادت گاہوں کے تحفظ ایکٹ ۱۹۹۱ کو دستور ہند کا جزء بنا دے۔

یہ تین نکاتی فارمولا اعتراف حقیقت کے اصول پر بنایا گیا ہے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ اب ہندو اور مسلمان دونوں کے لیے انتخاب اِس اسٹرکچر اور اُس اسٹرکچر میں نہیں رہ گیا ہے، بلکہ اسٹرکچر اور تباہی میں رہ گیا ہے۔ اس لیے حقیقت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ دونوں ہی تاریخ میں تبدیلی کا ذہن ترک کر دیں اور اس معاملہ میں ہمیشہ کے لیے حالت موجودہ (status quo) کو قبول کرنے پر راضی ہو جائیں۔

عبادت گاہوں کا تحفظ ایکٹ ۱۹۹۱ عین اسی اصول پر بنایا گیا تھا۔ فارمولا یہ کہتا ہے کہ گورنمنٹ اس ایکٹ کے مدعا کو دستور ہند میں بنیادی شہری حقوق کی حیثیت سے شامل کر دے تاکہ وہ اس معاملہ میں طرفین کے لیے زیادہ پائدار قانونی ضمانت بن جائے۔

مذکورہ تین نکاتی فارمولے پر بمبئی کے انگریزی روزنامہ مڈڈے نے مارگ (MARG) نامی ایجنسی سے ایک سروے کرایا۔ اس سروے کی مفصل رپورٹ مڈڈے (۲ فروری ۱۹۹۲) اور دوسرے اخباروں میں شائع ہوئی ہے۔ روزنامہ انقلاب (۲ فروری ۱۹۹۲) میں شائع شدہ رپورٹ کے کچھ حصے یہاں نقل کیے جاتے ہیں :

"مولانا وحیدالدین خاں نے گزشتہ ہفتہ مسئلہ اجودھیا کو حل کرنے اور ملک میں فرقہ وارانہ تناؤ کو کم کرنے کے سلسلہ میں جو سہ نکاتی منصوبہ پیش کیا ہے اسے بمبئی میں رہنے والے مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کی اکثریت قابل قبول سمجھتی ہے۔ سنڈے انقلاب کے لیے یہ سروے مارگ نامی ایجنسی نے کیا ہے جو عوامی موڈ کا صحیح اندازہ لگانے میں خاصی مشہور ہے۔ اس رائے شماری پروگرام کے تحت ۵۱۷ ہندو مردوں اور عورتوں سے انٹرویو لیا گیا۔ ان میں سے ۶۹ فیصد نے اس منصوبہ کو منظور اور ۲۵ فیصد نے نامنظور کیا۔

۱۷۰ مسلم خواتین اور مردوں میں سے ۶۲ فیصد نے منصوبہ کے حق میں اور ۲۹ فیصد نے اس کی مخالفت میں ووٹ دیے۔ جو لوگ واضح طور پر مولانا وحیدالدین خاں کے منصوبہ کے حق میں نہیں ہیں انھوں نے بھی یہ پوچھے جانے پر کہ کیا یہ فارمولا ایسی بات چیت کا نقطۂ آغاز بن سکتا ہے "ہاں" میں جواب دیا۔ اس طرح انٹرویو کیے جانے والے افراد میں سے صرف ۵ فی صد ایسے تھے جنھوں نے مولانا کی تجویز کو سرے سے نامنظور کر دیا۔"

(انقلاب (بمبئی) ۷ فروری ۱۹۹۲)

مسلمان : ۱۰۰ فیصد
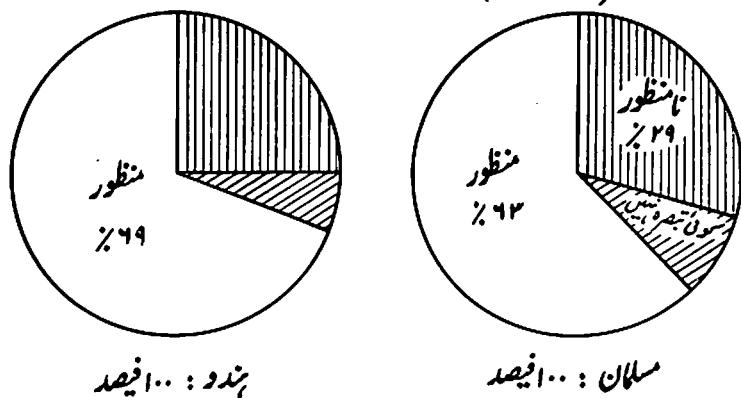
اس کے علاوہ مختلف مقامات سے ہمیں اطلاعات مل رہی ہیں کہ لوگ بڑی تعداد میں اس فارمولے سے اتفاق کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ کا ایک خط یہ ہے : یہ اصل خط ہندی میں ہے۔ یہاں اس کو اردو رسم خط میں نقل کیا جاتا ہے :

"بعد سلام کے آپ کی نئی زمین سمواد داتا سے بات چیت "نئی زمین" ۲۱ فروری سے ۲۷ فروری ۱۹۹۲ اخبار میں پڑھی۔ آپ کے تین سوتری فارمولا کے بارے میں جانکاری ملی۔ میں اس کا سمرتھن کرتا ہوں۔ یہاں ناگدا میں میں نے ناگدا کی جنتا سے موکھک سروے کیا۔ لگ بھگ سبھی لوگوں نے سمرتھن کیا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ تین سوتری فارمولے پر ہستاکچھر ابھیان دیش بھر میں کرائیں۔ جس سے لوگوں کی رائے کا پتہ چلے۔ اگر آپ ہستاکچھر ابھیان شروع کر چکے ہیں تو ہمیں بھی جانکاری دیویں کہ ہمیں کیا کرنا ہوگا۔ آج دیش بھر میں جو سامپردائک اُنماد پھیل رہا ہے اس میں آپ کا فارمولا جیون رکشک گھول کا کام کرے گا" (۲۶-۲-۱۹۹۲)

شجاع الدین اگوان - پترکار - ۱۰۱ جنم جے مارگ - ناگدا ۴۵۶۲۳۵

مسٹر کلدیپ نائر کا ایک مضمون ناگپور کے انگریزی روزنامہ ہیتاوادا (The Hitavada) کے شمارہ ۱۷ مارچ ۱۹۹۲ میں شائع ہوا ہے، یہ مضمون اجودھیا کے مسئلہ سے متعلق ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ پچھلے دو مہینوں میں میں پورے ملک میں گھوما ہوں، اور میں اس تاثر کے ساتھ واپس آیا ہوں کہ مسلمان اس کے لیے راضی ہو جائیں گے کہ وہ بابری مسجد سے اپنا دعویٰ واپس لے لیں، بشرطیکہ اس کے بعد کسی اور مذہبی عمارت کے لیے مزید مانگ نہ کی جائے :

I have gone round the country in the last two months and I have come back with the impression that the Muslims may be willing to withdraw their claim on the Babri Masjid provided there are no further demands on other religous buildings. (p.8).

اجودھیا اور اس کے بعد

اجودھیا کی بابری مسجد کا مسئلہ آج پوری ملت اسلامیہ کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ بن گیا ہے۔ اس مسجد کے ڈھانچہ میں پتھروں کی جتنی تعداد ہوگی، اس سے بھی زیادہ تعداد میں مسلمان ملک کے مختلف حصوں میں اب تک مارے جا چکے ہیں۔ اور ہلاکت اور رسوائی کا یہ سلسلہ بظاہر لامتناہی طور پر جاری ہے۔

یہ مسجد بابر کے گورنر میر باقی نے ۱۵۲۸ء میں اجودھیا میں تعمیر کی تھی۔ بعد کو اس کے سلسلہ میں کچھ نزاع پیدا ہوئی۔ تاہم ابتداءً اس کی حیثیت ایک معمولی مقامی مسئلہ کی تھی۔ آزادی کے بعد ۲۲ دسمبر ۱۹۴۹ کی رات کو کچھ مقامی ہندوؤں نے مسجد کے اندر تین مورتیاں رکھ دیں۔ لیکن اب بھی اس نے خطرناک مسئلہ کی صورت اختیار نہیں کی۔ کیوں کہ عدالت کے حکم سے جلد ہی مسجد کے دروازہ پر تالا لگا دیا گیا تھا۔ اس کے بعد یکم فروری ۱۹۸۶ کو یہ واقعہ پیش آیا کہ انتظامی ذمہ داروں نے مسجد کا تالا کھول دیا اور مقامی ہندوؤں کو مورتیوں کے درشن اور پوجا کے لیے اندر جانے کی اجازت دے دی۔ یہاں سے مسئلہ نے نیا رخ اختیار کر لیا۔

اب کچھ مسلم لیڈروں نے بابری مسجد کے نام پر دھواں دھار تحریک شروع کر دی۔ دوسری طرف کچھ ہندو لیڈروں نے رام مندر کا شوشہ لے کر شدید تر انداز میں اپنا اندولن جاری کر دیا۔ دونوں طرف سے یہ تحریکیں چلتی رہیں۔ یہاں تک کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو یہ حادثہ پیش آیا کہ ہندو انتہا پسند بڑی تعداد میں اجودھیا میں جمع ہوئے۔ اور انھوں نے بابری مسجد کو ڈھا کر مکمل طور پر اسے ختم کر دیا اور اس کی جگہ ایک عارضی مندر بنا دیا۔

اس واقعہ کے بعد پورے ملک کا ضمیر چیخ اٹھا ہے۔ ملک کے تمام باشعور لوگوں نے اس کی سخت مذمت کی ہے۔ بابری مسجد کو اس طرح ڈھانا دستور، قانون، عدالتی فیصلہ، مذہبی اور اخلاقی روایات، نیز خود رام مندر تحریک کے لیڈروں کے اپنے اعلانات کے خلاف تھا۔ اس لیے وہ سادہ طور پر ایک عمارت کو ڈھانے کا واقعہ نہ رہا، بلکہ وہ پوری ایک تاریخ کو ڈھانے کا واقعہ بن گیا۔

یہی وجہ ہے کہ بھارتیہ جنتا پارٹی کے سینیر لیڈر مسٹر اٹل بہاری باجپئی نے ۶ دسمبر کے واقعہ کو ایک قومی المیہ (national tragedy) قرار دیا ہے۔ مسٹر جے ایس یادو (ہندستان ٹائمس ۲ جنوری ۱۹۹۲) کے الفاظ میں، اب خود ملک کا وجود و بقا داؤ پر لگا ہوا ہے :

The very survival of our nation is at stake.

غیر گاندھیائی طریقہ

مہاتما گاندھی نے ۱۹۲۱ میں انگریزوں کے خلاف سول نافرمانی (civil disobedience) کی تحریک چلائی۔ ان کا اعلان تھا کہ یہ تحریک مکمل طور پر اہنسا کے اصول پر چلے گی۔ اس کے دوران کسی کے خلاف کسی بھی قسم کا تشدد نہیں کیا جائے گا۔

لیکن ۵ فروری کو کانگریس کمیٹی کے لوگوں نے چورا چوری میں وہاں کے تھانہ کو آگ لگا دی۔ اس میں کچھ کانسٹبل جل کر مر گئے۔ مہاتما گاندھی کو معلوم ہوا تو انھوں نے اس واقعہ کو ہمالیائی غلطی (Himalayan blunder) بتایا اور فوراً تحریک کے خاتمہ کا اعلان کر دیا۔

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو اجودھیا میں سخت تر انداز میں تشدد کا واقعہ پیش آیا ہے۔ مگر اس کے باوجود اس تحریک کے لیڈروں نے اپنی مندر۔ مسجد تحریک کے خاتمہ کا اعلان نہیں کیا۔ اس کے برعکس ان کے انتہا پسند عناصر بلا روک یہ کہہ رہے ہیں کہ : اجودھیا تو جھانکی ہے، متھرا کاشی باقی ہے۔

یہ بلاشبہ قوم کے باپو مہاتما گاندھی کے مسلّمہ طریقہ کے خلاف ہے۔ اور یہ غیر گاندھیائی طریقہ دیش کو کامل تباہی کے سوا کہیں اور پہنچانے والا نہیں۔ اجودھیا کی غلطی کی کم سے کم تلافی یہ ہے کہ اب اس قسم کی بولی بولنا مکمل طور پر بند کیا جائے۔ اور یہ عہد کیا جائے کہ اس قسم کا عمل اب کہیں اور کبھی ہرگز نہیں دہرایا جائے گا۔

متھرا کی مسجد

متھرا میں ایک بڑی مسجد ہے۔ اس کو اورنگ زیب نے ۱۶۶۹ء میں بنوایا تھا۔ عام طور پر یہ پروپگنڈا کیا گیا ہے کہ یہ مسجد شری کرشن کے جنم استھان پر بنائی گئی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس کو توڑ کر وہاں شری کرشن کا مندر تعمیر کیا جائے۔

اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے میں خود ۱۶ جنوری ۱۹۹۳ کو دہلی سے متھرا گیا۔ وہاں میں نے کئی

ہندو دوستوں کے ساتھ اس کو مکمل طور پر دیکھا۔ متھرا کے کچھ واقف کار ہندوؤں اور مسلمانوں سے اس کے بارہ میں گفتگو بھی کی۔

میں نے دیکھا کہ وہاں ایک طرف ایک خوب صورت مسجد ہے۔ اگرچہ اس کا راستہ زیادہ اچھا نہیں۔ دوسری طرف مندر کا وسیع اور عظیم کامپلکس ہے جس کو شری کرشن کا جنم استھان کہا جاتا ہے۔ اجودھیا کے تجربہ کے پیش نظر میرا خیال تھا کہ شری کرشن کا جنم استھان غالباً کسی متنازعہ زمین پر مسجد کے اندرونی حصہ میں واقع ہے۔ اور اسی لیے اس کی مانگ کی جارہی ہے۔ مگر دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ حقیقی صورت حال اس سے بالکل مختلف ہے۔

ہم لوگ مندر کے مختلف حصوں کو دیکھتے ہوئے ایک خاص کمرہ میں پہنچے۔ یہاں ایک سجائے ہوئے چبوترہ پر شری کرشن کی تصویر رکھی ہوئی تھی۔ ساتھ ہی دوسری متعلق چیزیں آس پاس موجود تھیں۔ بتایا گیا کہ یہی وہ خاص مقام ہے جہاں شری کرشن نے جنم لیا تھا۔ یہ جگہ پوری طرح مندر کے احاطہ میں تھی۔ چنانچہ اس کو دیکھ کر ایک ہندو بھائی نے کہا: متھرا کو اجودھیا کی کیٹگری میں نہیں ڈالنا چاہیے۔ کیوں کہ کرشن کا جنم استھان تو مندر کے اندر ہے، وہ مسجد میں شامل نہیں۔

کوئی بھی شخص متھرا جا کر اس واقعہ کو دیکھ سکتا ہے۔ جب شری کرشن کے جنم کی جگہ عملاً مندر کے احاطہ میں ہے تو اس کے لیے مسجد کی مانگ کیوں کی جاتی ہے جو اس سے باہر الگ زمین پر واقع ہے۔ اگر اجودھیا کی مسجد کے خلاف تحریک کا جواز یہ تھا کہ وہ شری رام کے جنم کی جگہ پر بنی ہے تو متھرا کی مسجد کی مانگ کا جواز کیا ہوگا جو واضح طور پر شری کرشن کے جنم استھان سے باہر بنائی گئی ہے۔

مزید یہ کہ متھرا کے مسئلہ میں مبینہ طور پر مقامی ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تقریباً چالیس سال پہلے ایک راضی نامہ ہو چکا ہے۔ اس سے پہلے مقامی ہندوؤں اور مسلمانوں میں اس مسئلہ پر نزاع ہوئی۔ معاملہ عدالت تک پہنچا۔ آخر کار ۱۹۶۸ میں متھرا کے کئی بزرگوں کی کوشش سے، جن میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی، دونوں فریقوں کے درمیان ایک تحریری معاہدہ ہوا۔ اس معاہدہ کے مطابق، مسلمانوں نے مسجد کے پاس کی موقوفہ زمین کا بڑا حصہ ہندوؤں کے حوالے کر دیا۔ اس زمین پر شری کرشن مندر کا بہت بڑا کامپلکس تعمیر کیا جا چکا ہے۔ ایسی حالت میں ایک طے شدہ معاملہ کو دوبارہ اٹھانے کے لیے اس کے دعوے داروں کے پاس کیا جواز ہے۔

ایک رپورٹ

اس موضوع پر اخبارات ورسائل میں کئی معلوماتی رپورٹیں چھپ چکی ہیں۔ انھیں میں سے ایک رپورٹ مدراس کے انگریزی میگزین فرنٹ لائن (Frontline) کی ہے۔ یہ اس کے شمارہ ۲۹ جنوری ۱۹۹۲ کی کور اسٹوری ہے جس کا عنوان ہے کیسری انتہا پسند (Saffron Extremism)

میگزین کے رپورٹر ونکٹیش راما کرشنن (Venkitesh Ramakrishan) نے متھرا جاکر وہاں جو براہ راست معلومات حاصل کی ہیں، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس معاملہ میں کرشن جنم استھان ٹرسٹ اور عیدگاہ مسجد ٹرسٹ کے درمیان عرصہ سے مقدمات جاری تھے۔ یہاں تک کہ ۱۹۶۸ میں دونوں فریقوں نے باہمی رضامندی سے ایک تحریری معاہدہ کیا۔ اس معاہدہ کی تکمیل میں کئی مقامی ہندوؤں اور مسلمانوں کا ہاتھ تھا۔ مثلاً دیو دھر شاستری وغیرہ۔ پنڈت مدن موہن مالویہ اور مولانا ابوالکلام آزاد کی کوششیں بھی اس میں شامل رہی ہیں۔

اس معاہدہ کے مطابق، دونوں کی زمینی حد بندی کر دی گئی تھی اور یہ طے پایا تھا کہ مسجد اور مندر دونوں آس پاس قائم رہیں گے۔ رپورٹر نے اس سلسلہ میں مختلف مقامی لوگوں سے ملاقاتیں کیں، رپورٹ کے مطابق، ہندوؤں کی اکثریت کا یہ خیال ہے کہ یہاں کوئی نزاع نہیں۔ عام ہندوؤں کا کہنا ہے کہ ہر بات طے ہو چکی ہے۔ ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی، ہر ایک کو اجازت ہے کہ وہ یہاں آئے اور اپنی عبادت کرے۔ ہم کیوں لوگوں کو الگ کرنے کرنے کی کوشش کریں اور نئے مسائل پیدا کریں۔ بابو لال شلپی، جو کہ کرشن جنم بھومی کی تعمیرات میں شریک رہے ہیں، انھوں نے کہا کہ وہ عیدگاہ مسجد کو ہٹانے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ہر بات ۱۹۶۸ میں طے ہو گئی تھی۔ گربھ گریہ ہم کو مل چکا ہے۔ عیدگاہ مسجد کو ہٹانے کی یہ تمام باتیں صرف سیاست ہیں۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں :

And a majority of Hindus believe that there is no dispute. "Everything has been settled. Everybody, Hindus, Christians, Sikhs and Muslims, is permitted entry and the right to worship. Why should we try to segregate and create new problems?" is thegeneral response. Babulal Shilpi, who has been involved in the construction of the various shrines at Krishna janamabhoomi, said he did not see the need to displace the idgah (masjid). "Everything was settled in 1968. We have got the garbha griha (santum sanctorum). All this talk about displacing the idgah (masjid) is politics. I have no concern for that (p.17).

بنارس کی مسجد

اب بنارس (کاشی) کے معاملہ کو لیجئے۔ مندر۔مسجد تحریک کے لیڈروں کا کہنا ہے کہ وہاں گیان واپی کے نام سے جو مسجد ہے، اس کو اورنگ زیب نے ایک مندر کو توڑ کر بنایا تھا۔ اس لیے اب ہم اس کو ختم کریں گے اور اس کی جگہ پر دوبارہ ایک مندر کی تعمیر کریں گے۔ اپنے اس منصوبہ کو وہ لوگ "تاریخ کی تصحیح" کا نام دیتے ہیں۔

اس سے قطع نظر کہ بنارس کی مذکورہ مسجد کے بارہ میں یہ دعوی صحیح ہے یا غلط، تاریخ کی تصحیح کا یہ نظریہ آج عالمی سطح پر رد کیا جا چکا ہے۔ اس قسم کا نظریہ درحقیقت مذہبی تعذیب (religious persecution) کے اس دور کو نئے نام کے ساتھ واپس لانا ہے جس کو موجودہ زمانہ میں صرف دور وحشت کی چیز سمجھا جاتا ہے۔ یہ نظریہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے فاشزم ہے نہ کہ فی الواقع تاریخ کی تصحیح۔

ناگپور کے ایک بودھ دانشور ڈاکٹر ویمل کیرتی (Dr. Vimal Kirti) نے بجا طور پر کہا ہے کہ جو ہندو صاحبان آج تاریخ کی تصحیح کی بات کرتے ہیں، کیا وہ اپنے اس نظریہ کو تاریخ میں اور پیچھے تک لے جائیں گے۔ کیا وہ اس کے لیے تیار ہیں کہ خود ان کے ساتھ بھی وہی کیا جائے جو وہ دوسروں کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں۔ کیوں کہ یہ ہندو صاحبان جس چیز کا الزام اورنگ زیب کو دے رہے ہیں، وہ اس سے زیادہ بڑے پیمانہ پر خود انھوں نے بھی انڈیا کے بودھوں کے ساتھ کیا تھا۔

یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ چھٹی صدی عیسوی اور ساتویں صدی عیسوی میں بھارت کے برہمنوں نے اس وقت کے راجاؤں کی مدد سے بدھوں کے خلاف سخت تعذیبی اقدامات کیے۔ انھوں نے بہت سے بودھ عبادت خانے توڑ ڈالے اور ان کی جگہ ہندو مندر بنا دیا :

From time to time Hindus, especially Saivites, took aggressive action against Buddhism. At least two Saivite kings - the Huna invader Mihirakula (early 6th century) and the Bengal King Sasanka (early 7th century) - are reported to have been active persecutors, destroying monasteries and killing monks (8/914).

عبادت خانوں کو توڑنے کے واقعات اس گزرے ہوئے زمانہ میں پیش آئے جب کہ

دنیا میں مذہبی تعذیب (religious persecution) کا عام رواج تھا۔ اب وہ دور ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اس قسم کی بات کرنا ایک سنگین قسم کی خلافِ زمانہ حرکت (anachronism) ہے۔ اس تحریک کے علم برداروں کو جاننا چاہیے کہ یہاں زمانی عامل (age-factor) ان کی راہ میں حائل ہے۔ جو لوگ ایسا کام کرنے کے لیے اٹھیں، ان کو زمانہ ہمیشہ رد کر دیتا ہے۔ دنیا ان کو رجعت پسند قرار دے کر انھیں پیچھے کی صف میں دھکیل دیتی ہے۔

اس انجام سے بچنے کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ باہر کی دنیا میں صفائی پیش کرنے والے وفود بھیجے جائیں۔ اس سے بچنے کا طریقہ صرف ایک ہے۔ یہ کہ ایسا کام ہی نہ کیا جائے جو زمانہ کے مسلّمہ معیار کے خلاف ہو۔ جو زمانہ کی نظر میں اپنے آپ کو حقیر بنادینے والا ہو۔

قدیم زمانہ میں مذکورہ قسم کے واقعات ہر جگہ پیش آئے ہیں۔ اس لیے اگر تصحیح تاریخ کے اس اصول کو اختیار کیا جائے تو وہ کسی ایک گروہ پر نہیں رکے گا بلکہ وہ ہر گروہ تک جا پہنچے گا۔ اور پھر اس کے نتیجہ میں جو چیز حاصل ہوگی وہ تاریخ کی تصحیح نہیں ہوگی بلکہ صرف تاریخ کی تخریب ہوگی۔ یہ ماضی کو لینے کے نام پر حال کو کھو دینا ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تحریک کے علم برداروں کے لیے یہاں انتخاب دوبارہ مسجد اور تصحیح تاریخ میں نہیں ہے، بلکہ مسجد اور مکمل تباہی میں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں عالمی طور پر یہ مان لیا گیا ہے کہ اس طرح کے نزاعی معاملات میں ماضی کے بند ابواب کو نہ کھولا جائے۔ بلکہ حال اور مستقبل کو سامنے رکھتے ہوئے مثبت طور پر قومی تعمیر کا کام جاری رکھا جائے۔

فرنٹ لائن کا جائزہ

ہفت روزہ فرنٹ لائن کے رپورٹر وینکٹیش راما کرشنن نے بنارس جا کر اس معاملہ کی تحقیق کی ہے۔ فرنٹ لائن کے شمارہ (۲۹ جنوری ۱۹۹۲) میں اس کی تفصیلی رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اجودھیا کی طرح متھرا اور بنارس میں بھی جھگڑے کی بنیاد حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ وہ صرف افسانہ پر مبنی ہے:

As at Ayodhya, the "disputes" at Mathura and Varanasi have their basis in myths (p.12).

انھوں نے لکھا ہے کہ ہندتو کے علم بردار یہ کہتے ہیں کہ گیان واپی مسجد جو کہ کاشی وشوناتھ مندر کے پاس ہے، اس کو ایک مندر کو توڑ کر بنایا گیا تھا۔ مگر اس دعوے کے حق میں ان کے پاس کوئی واضح ثبوت (clear proof) موجود نہیں۔ حتی کہ اس سلسلہ میں مہنت لوگوں کے بیانات بھی یکساں نہیں۔ مختلف مہنت مختلف بات کہتے ہیں۔ مثلاً پنڈت رام شنکر ترپاٹھی کہتے ہیں کہ اصل مندر رضیہ بیگم کی مسجد کی جگہ تھا۔ جو کہ گیان واپی مسجد سے دو کیلو میٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ پنڈت کیلاش پتی تیواری گیان واپی مسجد ہی کو قدیم مندر کا اصل مقام بتاتے ہیں، مگر ان کے پاس اس کا کوئی تاریخی ریکارڈ نہیں۔ کچھ اور مہنت یہ کہتے ہیں کہ اصل وشوناتھ مندر وشیشور گنج میں تھا۔ یہ مقام بھی گیان واپی مسجد سے دو کیلو میٹر دور ہے۔ اور بھی کئی رائیں ہیں۔ مگر تاریخی دستاویزات (historical records) کسی کے پاس بھی نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ گیان واپی مسجد کی جگہ ایک وشوناتھ مندر تھا۔ اورنگ زیب نے اس کو ڈھا کر ۱۶۶۹ میں یہاں ایک مسجد تعمیر کی لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ بنارس کے سنتوں اور پنڈتوں سے اس مغل بادشاہ کے اچھے تعلقات تھے۔ ایسی حالت میں اس نے مندر کو کیوں ڈھایا (صفحہ ۱۴)

مزید یہ کہ موجودہ وشوناتھ مندر کو اندور کی مہارانی اہلیا بائی ہولکر نے ۱۷۷۷ میں بنوایا تھا۔ اس وقت ایک تجویز یہ تھی کہ گیان واپی مسجد کو ڈھا دیا جائے۔ مہارانی نے بنارس کے پنڈتوں سے رائے لی۔ لوک پتی ترپاٹھی کے بیان کے مطابق، پنڈتوں نے اس کی مخالفت کی۔ کیوں کہ ان کے نزدیک کسی دوسرے فرقہ کی عبادت گاہ کو ڈھا کر وہاں مندر نہیں بنایا جا سکتا۔ چنانچہ یہ تجویز ختم ہو گئی:

The temple was rebuilt by the Maharani of Indore, Ahalya Bai Holkar, in 1777 Then there was a suggestion to demolish the Gyanvapi Mosque, and the Maharani consulted the pandits of Varanasi. According to Lokpati Tripathi, Congress (I) leader, the pandits were against this, for, according to them, a mandir could not be built by demolishing another community's place of worship. this put an end to the move. (14)

اقتصادی نقصان

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو جو لوگ بابری مسجد کو ڈھا رہے تھے، وہ اپنے خیال کے مطابق، پتھر کے ایک قدیم ڈھانچہ کو ڈھا رہے تھے۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے انھوں نے ملک کے پورے اقتصادی ڈھانچہ

کو ڈھا دیا۔ اس سلسلہ میں مختلف رپورٹیں اخباروں میں آتی رہی ہیں۔ مثلاً ۶ دسمبر کے بعد دیش میں جو گڑبڑ ہوئی، اس کی وجہ سے صرف دسمبر ۱۹۹۲ اور جنوری ۱۹۹۳ میں گورنمنٹ کے کسٹم اور اکسائز ڈیوٹی کی وصولیابی میں ۲۵۰۰ کرور روپے کی کمی واقع ہوئی۔ فسادات کے نتیجہ میں اکثر بڑے بڑے شہروں میں براہ راست یا بالواسطہ طور پر جو نقصان ہوا، اس کی مقدار اربوں روپیہ تک جاتی ہے۔ باہر کے انوسٹ منٹ میں غیر معمولی کمی واقع ہوئی۔ حتیٰ کہ متعدد بیرونی تجارتی ادارے اپنا کاروبار بند کرکے ہندستان سے واپس چلے گئے۔

ٹائمس آف انڈیا (۸ فروری ۱۹۹۳) نے اس سلسلہ میں ایک جامع سروے شائع کیا ہے جس کو اگلے صفحات میں نقل کیا جا رہا ہے۔ اس کے مطابق، ملک بھر کا تجارتی طبقہ مندر۔ مسجد سیاست سے گھبرا اٹھا ہے۔ کیوں کہ اس کا اقتصادی نقصان ناقابل برداشت حد تک زیادہ ہے۔ صرف بمبئی کے فسادات میں جو نقصان ہوا، اس کا اندازہ تقریباً دو ہزار کرور ہے۔ احمد آباد اور سورت میں یہ نقصان تین ہزار کرور روپیہ تک پہنچ گیا۔ یہ مقدار بھی براہ راست نقصان کی ہے۔ بالواسطہ نقصان اس اندازہ میں شامل نہیں۔

جے پور میں فرقہ وارانہ فساد کی صورت میں دو ہزار کرور روپیہ کا نقصان ہوا۔ راج کوٹ میونسپل کارپوریشن میں ہر روز پانچ لاکھ روپیہ چنگی کی رقم آتی تھی۔ مگر دسمبر میں وہ ۵۰ ہزار روپیہ روزانہ تک گر گئی۔ لکھنؤ کے تاجروں کو اس دوران پانچ سو کرور روپیہ کا نقصان پہنچا۔ اتر پردیش کے تاجروں کا خیال ہے کہ ریاست کی اقتصادیات دس سال پیچھے چلی گئی ہے۔ وغیرہ۔

ہندو۔ ہندو مسئلہ

اس سلسلہ میں کاشی بیوپار منڈل کا فیصلہ قابل ذکر ہے جو بتاتا ہے کہ اجودھیا کے تجربہ کو بنارس میں دہرانا اپنے اندر ایک سنگین خطرہ لیے ہوئے ہے۔ یہ ہندو مسلم مسئلہ میں مزید اضافہ کرکے اس کو ہندو ہندو مسئلہ بنا دینے کے ہم معنی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خود ہندوؤں کا تاجر طبقہ معینہ طور پر اس کے خلاف ہو گیا ہے۔

اس سلسلہ میں مسٹر دیویک بھارتی (Vivek Bharati) کا مضمون (شائع شدہ ٹائمس آف انڈیا ۶ جنوری ۱۹۹۳) اس تحریک کے علم برداروں کے لیے ایک چیتاونی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا

دوسطری عنوان انھوں نے ان الفاظ میں قائم کیا ہے :

Lessons Of Varanasi
Pitting Economy Against Hindutva

اس مضمون کا ایک حصہ صفحہ کے نیچے درج کیا جا رہا ہے ۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوؤں نے اب جان لیا ہے کہ اجودھیا کے نام پر اٹھائی جانے والی تحریک ایک تخریبی تحریک تھی ۔ اس کا ایک مظاہرہ بنارس میں سامنے آیا ہے ۔ بنارس میں تقریباً پانچ لاکھ تاجروں کی طاقت ور کمیونیٹی ہے ۔ ان کی تنظیم کا نام کاشی بیوپار منڈل ہے ۔ اس تنظیم کے ہندو تاجروں نے اس سے پہلے بی جے پی کو کافی مالی تعاون دیا تھا ۔

لیکن ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے بعد جب انھیں معلوم ہوا کہ بابری مسجد کے فاتح بنارس کی گیان واپی مسجد کا رخ کرنے والے ہیں تو کاشی بیوپار منڈل فوراً اس کے خلاف حرکت میں آگیا ۔ اس نے بنارس کے پانچ لاکھ تاجروں کے نام پُرزور اپیل جاری کی جس میں کہا گیا تھا کہ بنارس کے تمام تاجر مندر اور مسجد کی

As the communal violence unleashed by the Ayodhya tragedy hit the headlines, the numerous instances from all over the country of people from both the communities joining hands to resist the destructive onslaught of communalism were relegated to the background. One such spontaneous mass action preaching peace and sanity in the historic city of Varanasi is particularly noteworthy. Sensing that the "conquerors" of Babri Masjid have a similar design for the Gyanvapi mosque at Varanasi, the city's traders' association, the Kashi Vyapar Mandal, issued a strong appeal to the five-lakh strong trader community comprising both Hindus and Muslims to stay away from the politics of Mandirs and Masjids and followed it up by organizing peace marches. Ironically, the Hindu members of the Vyapar Mandal have supported the BJP in the past and even mobilised donations for the kar sevaks who ran amok at Ayodhya. The issue is not whether these erstwhile supporters of the BJP have suddenly turned secular but that they have found it necessary to maintain peaceful co-existence. If Varanasi goes the Ayodhya way, the traders would be the worst hit as lawlessness and killings would drive away thousands of tourists who flock to this temple city and also kill a flourishing business in carpets and sarees which caters to both the home and export markets. Since both Muslims and Hindus are equally dependent on this commerce, it is plain that economic interests have prevailed over political or communal prejudices. This should send a clear signal that a powerful economic agenda has to be a major plank in the fight against communalism. Over the last two decades India has lost the race of development and its status in the world. A large number of countries which were poorer than us have passed us by and it is not India but China which is emerging as the new economic giant. It is time to spread the message of Varanasi that communalism can only disrupt and destroy and prevent us from seizing the last chance we have of recharging our economic system and retrieving our national pride. It is time to spread the message of Kautilya that "of the three ends of human life, material gain is, verily, the most important." On material gain depends the realization of dharma and pleasure. (*The Times of India*, January 6, 1993)

سیاست سے الگ رہیں۔ اسی کے ساتھ کاشی بیوپار منڈل نے شہر میں شانتی مارچ بھی کیے۔

اس کی وجہ تجارتی نقصان کا اندیشہ ہے۔ بنارس کے تاجروں نے محسوس کیا کہ ان کی تجارت قائم رہنے کے لیے ضروری ہے کہ اجودھیا جیسی تحریک بنارس میں داخل نہ ہو۔ اگر یہ تحریک بنارس پہنچتی ہے تو اس کے بعد جولا قانونیت اور دنگا ہوگا اس میں سب سے زیادہ نقصان تاجر طبقہ کا ہوگا۔ ایسی حالت میں کاروبار ٹھپ ہوگا اور ان سیاحوں کی آمد رک جائے گی جو ہزاروں کی تعداد میں مسلسل بنارس آتے ہیں اور جن کی وجہ سے بنارس میں قالینوں اور ساڑیوں کا نفع بخش بزنس چل رہا ہے۔ یہی اقتصادی مسئلہ متھرا میں بھی پیش آیا ہے (ملاحظہ ہو فرنٹ لائن، ۲۹ جنوری ۱۹۹۳)

بنارس کے اس تجربہ کو آج پھیلانے کی ضرورت ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ دیش کے لوگوں کو بتایا جائے کہ اس قسم کی تحریکیں چلانا گویا نان اشو کو اشو بنانا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ پچھلے چالیس برسوں میں انڈیا ترقی کی دوڑ میں پیچھے ہوگیا ہے۔ اور دنیا میں اس نے اپنا مقام کھو دیا ہے۔ بہت سے ملک جو ہم سے زیادہ غریب تھے، وہ ہم سے آگے بڑھ گئے۔ مثلاً چین، کوریا اور سنگاپور۔ ضرورت ہے کہ دیش کی تعمیر کے لیے مذہب کے بجائے اقتصادیات کو اشو بنایا جائے۔

مسئلہ کی سنگینی

اس مسئلہ کی سنگینی، نتائج کے اعتبار سے اتنی زیادہ ہے کہ نہ صرف انڈیا میں بلکہ ساری دنیا میں اس پر تشویش کا اظہار کیا جارہا ہے۔ یہاں میں بطور نمونہ ایک انگریزی میگزین ایشیا ویک کا حوالہ دوں گا۔ یہ ہانگ کانگ سے نکلتا ہے اور ٹائم گروپ سے تعلق رکھتا ہے۔

ایشیا ویک نے اپنے شمارہ ۲۰ جنوری ۱۹۹۳ کے ایڈیٹوریل کا عنوان یہ بنایا ہے —— ایک خطرناک گھاٹی (A dangerous pass) اس میں اپنے مخصوص انداز میں تجزیہ کرتے ہوئے اس نے لکھا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ ایشیا کو اجودھیا کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑے:

Asia may have to pay heavy price for Ayodhya

ایشیا ویک نے موجودہ تحریک کو ہندو فسطائیت (Hindu fascism) قرار دیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ یہ تحریک اگر اپنی منطقی حد (logical extreme) تک پہنچ گئی تو انڈیا کو اس کی ہولناک قیمت (terrible price) چکانی پڑے گی جس کا تحمل انڈیا نہ کر سکے گا جہاں ۵۰۰ ملین

آدمی افلاس کا شکار ہیں۔ اور ۰ ، فی صد آدمی اب بھی بے پڑھے لکھے ہیں۔

ایسی حالت میں انتہائی طور پر ضروری ہے کہ مندر۔ مسجد کی اس نزاع کو بلا تاخیر ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔ اسی میں ہندو کا بھی فائدہ ہے، اسی میں مسلمان کا بھی فائدہ۔ اور اسی کے ذریعہ دیش کو ترقی کی طرف لے جایا جاسکتا ہے۔

مانع اسباب

انسانی جسم میں خون سخت پریشر کے ساتھ دوڑتا ہے۔ اس لیے اگر جسم میں کوئی زخم آجائے تو خون فوراً بہنا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ ایک خطرہ کی صورت حال ہے۔ مگر جسم کے اندر ایک فطری نظام (Natural mechanism) کے تحت ایسا ہوتا ہے کہ جب زخم کی وجہ سے خون نکلنا شروع ہوتا ہے تو فوراً ہی جسم کے اندر کئی مانع اسباب پیدا ہو جاتے ہیں جو خون کے بہاؤ کو روک دیتے ہیں۔ مثلاً رگوں کا سکڑنا، خون میں کلاٹ بننا (blood clotting) وغیرہ۔ اس فطری نظام کو ہیمو اسٹاسس (hemostasis) کہا جاتا ہے۔ (IV/1015)

یہ ایک آفاقی قانون ہے جو حادثہ کی ہر صورت حال میں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ جب کوئی تخریب کی کارروائی وقوع میں آتی ہے تو عین اسی وقت کچھ مانع طاقتیں (deterrent forces) پیدا ہو جاتی ہیں جو اس تخریبی عمل کو روکنے کے لیے اس کے خلاف سرگرم ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی سماج میں کوئی تخریبی عمل صرف کچھ دیر جاری رہتا ہے اور پھر اپنے آپ اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

یہاں میں اضافہ کروں گا کہ یہ فطری عمل اجودھیا کے معاملہ میں بھی پوری طرح پیدا ہو چکا ہے۔ انتہا پسند لیڈر چاہیں یا نہ چاہیں، واقعہ یہ ہے کہ یہ مانع طاقتیں اس حد تک ظاہر ہو چکی ہیں کہ اب انھوں نے اس طرح کے حادثہ کے دوبارہ ظہور کے امکان کو سرے سے ختم کر دیا ہے۔ ایسی حالت میں اگر یہ انتہا پسند لیڈر اپنی تحریک کے خاتمہ کا اعلان کر دیں تو یہ عین ان کے حق میں ہوگا۔ اس کے بعد وہ ایک ایسے عمل کا کریڈٹ پالیں گے جس کے لیے وہ مشکل ہی سے مستحق قرار دیے جاسکتے ہیں۔

اخبار اسٹیٹسمین کے سابق ایڈیٹر مسٹر جے این نان پوریا کی اس رائے سے مجھے اتفاق ہے

Having suffered enormous losses in the wave of communal violence after the Ayodhya episode, businessmen and traders all over the country are perturbed about the growing communal divide and lawlessness.

A *Times of India* survey of the business community in major urban centres reveals that it desperately yearns for peaceful resolution of divisive conflicts and is fairly united in its opposition to politics of communalism and the increasing proclivity of political parties to mix religion with politics.

The near-unanimous condemnation by businessmen of the political forces and practices which have disrupted normal life in the country is understandable considering the hefty losses inflicted by riots in production and distribution of goods and destruction of property.

Losses in Bombay alone are estimated at about Rs. 2,000 crores caused by the disruption in trade and production and destruction of property and goods. In Ahmedabad and Surat, these are expected to be in the region of Rs 3,000 crores. However, since the entire industrial belt stretching from Bombay to Surat and Ahmedabad has strong bonds of interdependence across the country, these estimates represent only part of the loss inflicted by communal violence.

SAURASHTRA CALM: The Saurashtra region for instance, barring a few stray incidents remained calm and quiet. Yet rioting in Bombay and Ahmedabad disrupted both trade and manufacturing. As a director of the Rajkot engineering association, Mr. Vajubhai Mavani said: 'with Bombay shut, it was just impossible to send goods there. And with Ahmedabad in a state of disarray, there was no way of getting either raw materials or sending goods.'

A measure of the loss is provided by the Rajkot municipal corporation's income from octroi which in normal times averaged Rs. 5 lakh's a day. In the week after the Ayodhya episode it dipped to a measly Rs 75,000 per day. According to one estimate Gujarat as a whole may have suffered unprecedented losses worth nearly Rs. 12,000 crores spread across most sectors of trade and manufacturing like textiles, engineering, and industrial raw materials.

The impact of Bombay and Gujarat spread right across the Malwa region of Madhya Pradesh which has major industrial estates at Indore, Pithampur, Dewas and Ujjain. Trade and transport operations were also hit hard affecting truckers and merchants and manufacturers dealing in textiles, bullion and engineering goods.

Karnataka could not remain unaffected either. According to the President of the Federation of Karnataka chamber of commerce and industry, the state lost over Rs 100 cores as the entire mercantile activity was affected for a couple of weeks because of problems arising from riots in Bombay. Trucks remained off the roads, goods either kept piling up in factories or were stuck in Bombay and raw materials were in short supply. The leather industry, garment manufacturers and chemicals and automobile traders were the worst hit.

The communal violence in Jaipur inflicted losses worth about Rs. 200 crores, claims Mr. K.L. Jain, general secretary of the Rajasthan chamber of commerce and industry. Apart from he small-scale sector and the export-oriented gems and jewellery industry, riots had a severe impact on small shopkeepers, tea-stall owners and kiosks selling pan and cigarettes.

Lucknow is another state capital where local businessmen suffered losses exceeding Rs. 500 crores. What worries them even more is a sense of uncertainty about the future as they apprehend another round of violence if the prevailing communal tension in the city and adjoining areas like Ayodhya and Kanpur is allowed to persist. Mr AK Aggarwal, executive director of Indian industries association says.' 'If the situation is allowed to remain like this the state's economy will be hit hard.' According to Mr Banwari Lal Kanchchal, general secretary, Lucknow Vyapar Mandal, the economy of the state has already been pushed back by about 10 years.

FEAR OF VIOLENCE: The fears of future violence have motivated businessmen to speak up against politics of communalism. Mr Sandeep Bansal, president of Lucknow's Yuva Vyapar Mandal and an active member of the BJP says that all political parties should desist from taking those steps which militate against interests of trade and business and that communal co-existence is necessary for the all-round development of the state.

This view is articulated more sharply in Bangalore where all the businessmen and traders who spoke to *The Times of India* are vehemently opposed to the politics of communalism. Mr Abdus Subhan, a shopkeeper in Russel market bemoaned that politicians were exploiting issues like Ayodhya for their selfish ends and this kind of politicking must stop.

POLITICAL ISSUE: Likewise most traders in Bhopal do not see Ayodhya as a religious issue. Mr. Ajay Kumar, who runs a general store says 'It is clear that this is nothing but politics. Who cares about religion. Politicians are only interested in Ayodhya because it means votes on either side.

Businessmen and traders across the country are fairly united in advocating that religious issues must be kept out of politics and all cases of disputes should be resolved peacefully and within the parameters laid down by the Constitution. The president of Karanataka Small Industries Association, Mr D.N. Gangadhar argues that religion is a purely individualistic subject and politicians should not meddle with it and the secularism means that religion and politics are kept apart. Mr. Bimal Poddar, branch manager of Caprihans India in Ahmedabad, blames all political parties for making a mess of the Ayodhya issue, which he contends should be settled in a constitutional manner.

CENTRE'S FAILURE: Most traders and businessmen are also critical of the government's failure in checking communal riots and the breakdown of the law and order machinery. Mr Satish Chandra Patel, a small engineering goods' seller in Indore says good governance means that the politician-police-criminal nexus should be broken.

It is not just the prospect of losses that makes businessmen wary communalism but the fact that it is unsustainable as in most manufacturing and trading activities both Hindus and Muslims form a complex web of interdependence which is critical to the very survival of business.

In the gems and jewellery industry of Jaipur for instance, while a majority of traders are Hindus, the cutting, polishing and packaging work is done mostly by Muslims. Likewise the powerloom sector in Gujarat is dependent on workmen from both the communities. The same situation obtains in most other places from Bombay to Bhopal and Indore to Lucknow. As the BJP activist in Lucknow, Mr Sandeep Bansal puts it, 'The people of the two communities are so dependent on each other that their co-existence is necessary for the prosperity of trade and industry.'

(The Times of India, February 8, 1993)

جو انھوں نے روزنامہ پانیر (۲۰ جنوری ۱۹۹۲) میں شائع کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ بی جے پی اپنے سیاسی مقصد کو ہندتو کے لفظ سے ظاہر کرتی ہے۔ اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے اس نے تمام تر فرقہ وارانہ جذبات (communal feeling) کو ابھارنے پر انحصار کیا ہے۔ مگر فرقہ وارانہ جذبات کی ایک حد ہے۔ اور واقعات بتاتے ہیں کہ بی جے پی کے لیے وہ آخری حد اب آگئی۔ وہ ہندتو جس کو یہ انتہا پسند لیڈر پیش کرتے ہیں وہ ۶ دسمبر کو اپنی خطرناک حدوں پر پہنچ چکا ہے، اب وہ مزید قابل استعمال نہیں :

Hindutva as interpreted by the hardliners reached its dangerous limits on December 6 and is no longer exploitable. (N.J. Nanporia)

تمام سنجیدہ لوگوں کی اس خواہش میں میں شریک ہوں کہ اس معاملہ کو اب باضابطہ طور پر ختم ہو جانا چاہیے۔ ذاتی طور پر میں اس مسئلہ کے ساتھ ۱۹۸۶ سے برابر وابستہ رہا ہوں۔ اب کافی غور و خوض اور طرفین سے تبادلۂ خیال کے بعد اس کا ایک حل سامنے آیا ہے۔ یہ حل تین نکات پر مشتمل ہے۔ میرا احساس ہے کہ یہی اس مسئلہ کے حل کی واحد ممکن تدبیر ہے۔ اور وہ یقیناً تمام متعلقہ فریقوں کے لیے قابل قبول ہو سکتا ہے۔

تین نکاتی فارمولا

اجودھیا مندر۔ مسجد کے قضیہ میں تین فریق ہیں —— ہندو، مسلمان اور گورنمنٹ۔ تینوں فریق اگر مندرجہ ذیل اصول پر اپنی اپنی ذمہ داری ادا کریں تو انشاء اللہ یہ مسئلہ ختم ہو سکتا ہے۔

۱۔ ہندوؤں نے مندر اور مسجد کے نام پر جو اندولن چلایا، اس کو اب وہ اجودھیا ہی میں اسٹاپ کر دیں۔ کسی حال میں بھی وہ اس کو اجودھیا سے آگے نہ لے جائیں۔ اس کی عملی صورت یہ ہے کہ ہندوؤں کی طرف سے ایک تحریری اعلان نامہ (declaration) جاری ہو جس میں چاروں شنکراچاریہ، اور مندر۔ مسجد تحریک میں شامل تمام ہندو جماعتوں (بھارتیہ جنتا پارٹی، وشو ہندو پریشد، آر ایس ایس، بجرنگ دل) کے ذمہ دار افراد اپنا دستخط کریں۔ اس میں واضح لفظوں میں یہ اقرار کیا گیا ہو کہ ہندو صاحبان اجودھیا کی بابری مسجد کے بعد اب کسی اور مسجد کے لیے اس قسم کا سوال کبھی نہیں اٹھائیں گے۔ بھارت کی بقیہ تمام مسجدیں، خواہ کسی شخص کے نزدیک ان کی جو بھی تاریخی

نوعیت ہو، وہ ہمیشہ کے لیے مقدس مسجد کی حیثیت سے باقی رہیں گی۔ ہندو صاحبان کی طرف سے آئندہ ان میں کسی بھی تبدیلی کی مانگ نہیں کی جائے گی۔

۲۔ مسلمان اب اجودھیا کے اشو پر بالکل چپ ہو جائیں۔ بابری مسجد کی حفاظت اگر ان کی ذمہ داری تھی تو اس ذمہ داری کو وہ قربانی کی حد تک جا کر ادا کر چکے ہیں۔ اب اس معاملہ میں وہ معذور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لیے مسلمان شعوری طور پر یہ فیصلہ کر لیں کہ اب وہ عملاً اس مسئلہ سے مکمل طور پر الگ ہو جائیں گے۔ اب تک انھوں نے خود اس مسئلہ کو اٹھا رکھا تھا۔ اب وہ اس کو چھوڑ کر اس مسئلہ کو ملک کے ضمیر کے حوالے کر دیں گے۔

۳۔ حکومت ہند نے ۱۹۹۱ میں عبادت گاہوں کا قانون (Places of Worship Act 1991) منظور کیا ہے۔ جو عبادت گاہوں کے تحفظ سے متعلق ہے۔ اس میں یہ قانونی ضمانت دی گئی ہے کہ تمام عبادت گاہوں کو (باستثنا بابری مسجد) ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کی حالت پر باقی رکھا جائے گا۔ یہ صحیح سمت میں ایک قدم ہے۔ اب حکومت اتنا اور کرے کہ وہ عبادت گاہوں کے تحفظ کے اس ایکٹ کو دستور ہند کا جزء بنا دے۔ دستور کا حصہ بننے کے بعد بقیہ عبادت گاہوں کے تحفظ کی زیادہ پائدار ضمانت حاصل ہو جائے گی۔

آخری بات

مذکورہ تین نکاتی فارمولے میں ہر فریق کی رعایت ہے۔ اگر سنجیدگی کے ساتھ دیکھا جائے تو وہ ہر ایک کے لیے قابل قبول حیثیت رکھتا ہے۔ اس کو مان لینے کے بعد ایک طرف موجودہ حالات میں اعتدال آئے گا۔ اور دوسری طرف اس سے جو پُر امن فضا پیدا ہوگی وہ بے روک ٹوک ملک کی ترقی کی ضمانت بن جائے گی۔

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو اور اس کے بعد ملکی اور بین اقوامی سطح پر جو حالات پیش آئے ہیں وہ بیحد قابل غور ہیں۔ ان کا تقاضا ہے کہ اب یہ حتمی فیصلہ کر لیا جائے کہ اجودھیا کے تجربہ کو اب کہیں اور نہیں دہرانا ہے۔ موجودہ حالات میں کسی مسجد کو توڑ کر وہاں مندر تعمیر کرنا کوئی سادہ واقعہ نہیں۔ ۶ دسمبر نے ثابت کر دیا ہے کہ ایسا صرف اس وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ دستور، قانون، اخلاقی روایات، سب کو بیک وقت ڈھا دیا جائے۔ ایک عمارتی ڈھانچہ کی خاطر پورے ملک کے

ڈھانچہ کو توڑ پھوڑ ڈالا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسجد۔مندر تحریک کے انتہا پسند لیڈروں کے لیے جو انتخاب (Choice) ہے وہ مسجد اور مندر کے درمیان نہیں ہے، بلکہ مسجد اور بربادی کے درمیان ہے۔ انڈیا میں سابق امریکی سفیر جے کے گال بریتھ نے انڈیا کو ایک فنکشننگ انارکی بتایا تھا۔ اگر موجودہ قسم کی مندر۔مسجد تحریک جاری رہی تو یقینی طور پر آئندہ آنے والا مبصر اس ملک کو ننگی انارکی (naked anarchy) کہنے پر مجبور ہوگا۔

بھارت کی آج کی نسل کو یہ طے کرنا ہے کہ وہ اپنی اگلی نسل کو کون سا بھارت دینے جا رہی ہے۔ ایک ترقی یافتہ بھارت یا ایک ایسا تباہ شدہ بھارت جو کسی کے لیے سرے سے رہنے کے قابل ہی نہ ہو، نہ ہندو کے لیے اور نہ مسلمان کے لیے اور نہ کسی اور کے لیے۔

یہ دنیا تبدیلی اور انقلاب کی دنیا ہے
اس دنیا میں بار بار نیا فیصلہ لینا پڑتا ہے
نئے حالات میں جو لوگ نیا فیصلہ نہ لے سکیں
وہ کامیابی کے ساتھ زندگی کا سفر طے نہیں کر سکتے

اجودھیا کا سبق

اجودھیا میں ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو جو کچھ پیش آیا، اس کا سامنا کرنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ اس کو ٹریجڈی کے طور پر نہ لیا جائے بلکہ سبق کے طور پر لیا جائے۔ اگر ہم اجودھیا کو اس ذہن کے تحت لیں تبھی یہ ممکن ہے کہ ہم دوبارہ اجودھیا کو کسی نئی ٹریجڈی میں تبدیل ہونے سے بچا سکیں۔

۱۔ بابری مسجد کا مسئلہ اتنا گمبھیر کیوں بنا۔ اس کی واحد سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کا نام بابری مسجد تھا۔ جیسا کہ معلوم ہے، بابر کے نام کے ساتھ اس ملک کی ایک خاص تاریخ وابستہ ہے۔ چنانچہ اجودھیا کے اسٹرکچر کو جب بابری مسجد کے نام سے پکارا گیا تو ہندو اور مسلمان دونوں کو وہ ایک مخصوص تاریخ یاد دلانے کا مستقل ذریعہ بن گیا۔ مسلمان نے بابری مسجد کو اپنی فتح کی علامت کے طور پر دیکھا۔ اور ہندو نے بابری مسجد کو دیکھا تو وہ اس کو اپنی ہار کی علامت کے روپ میں نظر آئی۔

اس طرح دونوں دو الگ الگ نفسیات کے تحت بابری مسجد کے اوپر جم گئے۔ ہندو کو نظر آیا کہ نئے انڈیا میں اگر اپنی سیاسی شکست کی علامت کو مٹانا ہے تو بابری مسجد کو ڈھا دینا پڑے گا۔ اس کے برعکس مسلمان نے محسوس کیا کہ اسے ہر حال میں بابری مسجد کو بچانا ہے تاکہ اس کے فاتحانہ ماضی کا نشان بدستور باقی رہے۔ اسی دوطرفہ ٹکراؤ کا وہ آخری نتیجہ تھا جو ۶ دسمبر کو پیش آیا۔

اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ کسی عبادت گاہ کو سادہ طور پر صرف عبادت گاہ یا مسجد کہنا چاہیے۔ اس کو "بابری مسجد" جیسا نام دینے سے مکمل طور پر پرہیز کرنا چاہیے۔

۲۔ بابری مسجد ۱۵۲۸ء میں تعمیر ہوئی۔ مگر وہ باقاعدہ مسئلہ ۱۹۸۶ میں بنی جب کہ انتظامیہ نے اس کے بند تالے کو کھول دیا۔ یہ تالا اتفاقاً نہیں کھلا۔ اس کا براہ راست سبب وہ ایجی ٹیشنل تحریک تھی جو عام طور پر شاہ بانو تحریک کے نام سے مشہور ہے۔ اس تحریک کے پُرشور مطالبہ کے نتیجہ میں جب حکومت نے یہ طے کیا کہ وہ مسلم پرسنل لا کے متعلق ایک نیا ایکٹ بنائے۔ اسی وقت اس نے ہندو لیڈروں کے مطالبہ کی بنا پر، یہ بھی طے کیا کہ بابری مسجد کا تالا کھول دے تاکہ مسلم اور ہندو دونوں کو مطمئن کیا جا سکے۔

اس میں یہ سبق ہے کہ کسی پلورل سوسائٹی میں اس کا ایک گروپ اگر اپنے لیے ایک امتیازی

حق کی مانگ کرتا ہے تو اس کو جاننا چاہیے کہ دوسرا گروپ بھی اسی کے مساوی کوئی چیز اپنے لیے لینا چاہے گا۔ اس طرح عملاً یہ ہوگا کہ اس کے لیے ایک نئی محرومی کا مسئلہ پیدا ہو جائے گا جو اس کی یافت کی مکمل نفی کر دے گا۔

۳۔ جیسا کہ معلوم ہے، بابری مسجد کا تالا کھلنے کے بعد بھی ابتداءً یہ مسئلہ تمام تر صرف ایک مقامی مسئلہ تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ ایک ٹاؤن کا مسئلہ تھا۔ مگر اس کے نام پر جب دونوں طرف سے پورے ملک میں ایجی ٹیشن چلایا گیا تو وہ مقامی حد سے نکل کر ایک آل انڈیا مسئلہ بن گیا۔ حتیٰ کہ وہ یہاں تک بڑھا کہ وہ ایک عالمی مسئلہ بن گیا۔ اس نے دونوں فرقوں کے لیے وقار کے مسئلہ کی حیثیت اختیار کر لی۔ اس طرح غیر متناسب طور پر بڑھانے ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ وہ موجودہ المناک وسعت تک پہنچ گیا۔ ورنہ مسئلہ بننے کے بعد بھی وہ ایک گم نام مسئلہ رہتا جیسا کہ اس سے پہلے کئی سو سال تک وہ گم نام مسئلہ بنا ہوا تھا۔

اس میں یہ سبق ہے کہ سماجی زندگی میں جب بھی کوئی مسئلہ پیدا ہو تو اس کو حل کرنے کی کوشش ہمیشہ اس طرح کرنا چاہیے کہ وہ اپنے ابتدائی دائرہ میں محدود رہے۔ وہ کسی بھی حال میں اس سے آگے بڑھنے نہ پائے۔

۴۔ آخری بات یہ کہ اس معاملہ میں اب ہمیں کیا کرنا ہے۔ اس سلسلہ میں میں کہوں گا کہ جو لوگ یہ مانگ کر رہے ہیں کہ بابری مسجد دوبارہ وہیں بناؤ وہ ایک ختم شدہ معاملہ کو دوبارہ نئی شدت کے ساتھ زندہ کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تاریخ کو الٹی سمت میں چلانا ہے۔ اور تاریخ کو الٹی سمت میں چلانا کبھی ممکن نہیں ہوتا۔

اسی نزاکت کے پیش نظر میں نے اس معاملہ میں اپنا سہ نکاتی فارمولا پیش کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ (۱) مسلمان اب بابری مسجد کے لیے اپنا ایجی ٹیشن مکمل طور پر ختم کر دیں (۲) ہندو اپنی مندر۔ مسجد تحریک کو ہمیشہ کے لیے اجودھیا میں اسٹاپ کر دیں، اس کے بعد وہ کسی بھی دوسری مسجد کا باب ہرگز نہ کھولیں (۳) حکومت یہ کرے کہ عبادت گاہوں کا تحفظ کے قانون ۱۹۹۱ کو دستور میں شامل کر کے اس کو بنیادی حقوق کا جزء بنا دے۔

یہ فارمولا دونوں فرقوں کے لیے باعزت سمجھوتہ کی ایک بنیاد ہے۔

زندگی میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک ناخوش گوار حقیقت کو ماننا پڑتا ہے۔ کیوں کہ عملی اعتبار سے اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں ہوتا۔ فارمولے کا پہلا نکتہ اسی اصول پر مبنی ہے۔ کیونکہ بابری مسجد کے معاملہ میں اب مسلمانوں کے لیے جو چوائس ہے وہ یہ نہیں ہے کہ وہ بابری مسجد کو دوبارہ اسی جگہ پر بنائیں۔ حقیقی چوائس یہ ہے کہ بابری مسجد کو اسی جگہ بنانے کی کوشش میں ہزاروں نیا مسئلہ اپنے لیے کھڑا کرلیں۔

فارمولے کا دوسرا نکتہ اس مقصد کے لیے ہے کہ اس قسم کی بھیانک غلطی کو اب کسی اور مسجد کے معاملہ میں نہ دہرایا جائے۔ یہ نکتہ اس حقیقت پر مبنی ہے کہ ۶ دسمبر کے بعد ہر پیش آنے والے واقعات نے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ ہندو صاحبان کے لیے جو چیز ممکن ہے وہ مسجد کی جگہ مندر بنانا نہیں ہے۔ بلکہ مسجد کی جگہ مندر بنانے کے جوش میں پورے ملک کو تباہ و برباد کر دینا ہے۔

تیسرا نکتہ قانونی ہے۔ اس کا مدعا یہ ہے کہ قانونی اعتبار سے مسجد اور عبادت گاہ کے معاملہ کو اس طرح مستحکم کر دیا جائے کہ اب کوئی فریق دوبارہ اس قسم کی غلطی نہ کر سکے۔ اور اس کی عملی صورت یہ ہے کہ اس بات کی مستحکم قانونی ضمانت فراہم کر دی جائے کہ ۱۹۴۷ میں جو مسجد یا عبادت گاہ جس حال میں تھی، اسی حال میں اس کو برقرار رکھا جائے گا۔

چونکہ اس معاملہ میں ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو ہندو سائڈ کی طرف سے ایک جارحانہ اقدام کیا گیا ہے اور بابری مسجد کے تاریخی ڈھانچہ کو کسی جواز کے بغیر توڑ دیا گیا ہے، اس لیے اب سب سے پہلے ہندو سائڈ کو یہ کرنا ہے کہ ان کی طرف سے ایک تحریری ڈیکلریشن جاری ہو۔ اس میں فارمولے کے تینوں اجزا کو صدق دل سے تسلیم کرنے کا متفقہ اعلان کیا گیا ہو۔

اس ڈیکلریشن پر چاروں شنکراچاریہ دستخط کریں۔ تمام ان سیاسی اور غیر سیاسی پارٹیوں کے ذمہ دار اس پر دستخط کریں جو اجودھیا کے اشو میں شامل رہی ہیں۔ ملک کے مشہور اور معتمد افراد کا تصدیقی دستخط بھی اس میں شامل ہو۔ اسی کے ساتھ حکومت کی طرف سے اس کا ذمہ دار اس پر اپنا دستخط ثبت کرے۔ اس قسم کا ایک ڈیکلریشن جاری ہونے کے بعد وہ بحران ختم ہو جائے گا جس سے ۶ دسمبر کے بعد پوری قوم دوچار ہو گئی ہے۔

آگے کی طرف

آگے کو یاد رکھنا اور پیچھے کو بھلا دینا ——— یہی موجودہ دنیا میں ترقی کا راز ہے۔ یہاں ہر فرد اور ہر گروپ کے ساتھ کچھ نہ کچھ حادثات پیش آتے رہتے ہیں۔ یہ حادثات اکثر حالات میں قابل واپسی نہیں ہوتے۔ جو لوگ ان حادثات کو یاد رکھیں وہ ٹھٹھر کر رہ جاتے ہیں۔ اور جو لوگ ان حادثات کو بھلا کر از سر نو زندگی شروع کرنے کی تدبیر کریں وہی اس دنیا میں کامیاب ہوتے ہیں۔ بھلانے کا یہ اصول ایک یونی ورسل اصول ہے۔ اس میں کسی بھی فرد یا کسی بھی گروپ کا کوئی استثنا نہیں۔

انڈیا کے ہندو اور مسلمان دونوں آج اسی امتحان میں کھڑے ہوئے ہیں۔ دونوں ہی کو یہ کرنا ہے کہ وہ پیچھے کی بات کو بھلا دیں اور آگے کی بات کو لے کر اپنی عملی جدوجہد شروع کر دیں۔ دونوں کے لیے ترقی اور کامیابی کا یہی واحد راستہ ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی دوسرا ممکن راستہ ان کے لیے نہیں۔

مختصر طور پر یہ کہ انڈیا کے ہندوؤں کو بٹوارہ کو بھلا دینا ہے، اور انڈیا کے مسلمانوں کو بابری مسجد کو بھلا دینا ہے۔ دونوں ہی ماضی کی یادوں کا بوجھ اپنے سر پر لیے ہوئے ہیں۔ ہندو کے لیے ان یادوں کا علامتی عنوان "بٹوارہ" ہے۔ اور مسلمان کے لیے ان یادوں کا علامتی عنوان "بابری مسجد"۔ اگر دونوں یہ چاہتے ہیں کہ وہ اپنے لیے ایک ترقی یافتہ مستقبل کی تعمیر کریں تو دونوں کو یہ کرنا ہے کہ وہ اپنے اپنے ذہن کو ماضی کی یادوں سے نکالیں اور مستقبل کی روشنی میں سوچنا شروع کریں۔ اگر انھوں نے ایسا نہیں کیا تو نہ صرف یہ کہ دونوں فرقے کی ترقی رکی رہے گی، بلکہ وسیع تر اعتبار سے خود ملک کا مستقبل بھی تباہ ہو کر رہ جائے گا۔ ۱۹۴۷ سے پہلے کے دور میں غیر ملکی لوگوں کا "ظلم" تو ملک کو تباہ نہ کر سکا۔ مگر ۱۹۴۷ کے بعد ملکی لوگوں کی نادانی ضرور اسے تباہ و برباد کر کے رکھ دے گی۔

برادران وطن کے ایک طبقہ کی سوچ یہ ہے کہ ۱۹۴۷ میں ملک کے بٹوارہ کے ذمہ دار مسلمان ہیں۔ اس بنا پر وہ مسلمانوں کو مسلسل طور پر اپنا رقیب اور حریف بنائے ہوئے ہیں۔ جس

کا اظہار مختلف ناخوشگواریوں کی صورت میں ہوتا رہتا ہے۔ بٹوارہ کا ذمہ دار مسلمانوں کو قرار دیتے ہوئے میں یہ کہوں گا کہ اب برادران وطن کے لیے اس کے سوا کوئی متبادل صورت نہیں کہ وہ بٹوارہ کو گزری ہوئی تاریخ کے خانے میں ڈال دیں اور یہ بھول جائیں کہ کس نے بٹوارہ کرایا اور کس نے اس کی مانگ کی۔ اب مسئلہ بٹوارہ کا نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ بٹوارہ کا حساب چکانے میں خود ملک تباہ ہوا جا رہا ہے۔

۱۹۴۷ تک بٹوارہ مسلمانوں کا مسئلہ تھا۔ مگر اب یہ خود ہندوؤں کا مسئلہ بن چکا ہے۔ کیوں کہ بٹوارہ کی یاد ان کے اندر معتدل نفسیات پیدا نہیں ہونے دیتی۔ اور جب تک معتدل نفسیات نہ آئے وہ ملک کی ترقی میں اپنا بھرپور حصہ ادا کرنے میں بھی ناکام رہیں گے۔

بٹوارہ بذات خود کوئی ایسا حادثہ نہیں جو بالمی ترقی کی راہ میں ناقابل عبور رکاوٹ بن جائے۔ تاریخ کی متعدد مثالیں اس کی تصدیق کرتی ہیں۔ ایک تازہ مثال جرمنی کی ہے۔ ۱۹۴۸ میں جرمنی کی تقسیم ہوئی۔ مگر یہ تقسیم مغربی جرمنی کو ترقی کی طرف بڑھنے سے نہ روک سکی۔

دوسری عالمی جنگ کے نتیجہ میں جرمنی کی اقتصادیات بالکل تباہ ہو گئی۔ اس کو مغربی جرمنی اور مشرقی جرمنی میں بانٹ کر اسے کمزور کر دیا گیا تھا۔ الائیڈ ہائی کمیشن (Allied High Commission) کی کونسل نے ۱۹۴۹ میں مغربی جرمنی کے لیے یہ حکم نافذ کیا تھا کہ اس کے یہاں کوئی نیشنل پولیس نہ ہوگی، وہ صرف میونسپلٹی کی سطح کی پولیس رکھ سکے گا۔ وغیرہ۔

مگر تقسیم اور کمزوری جرمنی کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکی۔ وہ اپنی جدوجہد سے آگے بڑھا۔ یہاں تک کہ یورپ کا نمبر ایک ملک بن گیا، جرمنی اس شاندار انجام تک کیسے پہنچا، کچھ لوگ اس کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ اس نے دوسرے یورپی ملکوں کے مقابلے میں دیر سے اپنا ترقی کا سفر شروع کیا۔ کہا جاتا ہے کہ بعد کو سفر شروع کرنے والے زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ ترقی کرتے ہیں۔ کیوں کہ وہ پہلے شروع کرنے والوں سے اعلیٰ ٹکنالوجی حاصل کر سکتے ہیں:

Late starters can grow faster because they can borrow advanced technology from the early starters. (6/214)

یہ توجیہہ صحیح نہیں۔ کیوں کہ بعد کو شروع کرنے والوں میں تو انڈیا بھی ہے مگر وہ اب

تک کوئی قابل ذکر ترقی نہ کر سکا۔ اصل یہ ہے کہ مغربی جرمنی کی تیز رفتار ترقی کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اس نے دوسری عالمی جنگ کے نقصان اور اس کے بعد ہونے والی ملکی تقسیم کو بھلایا۔ گزرے ہوئے ماضی کو بھلا کر اس نے اپنی تمام طاقت آنے والے مستقبل کی تعمیر میں لگا دی۔

بدقسمتی سے ہندوؤں کی ایک تعداد، خاص طور پر شمالی ہند کے ہندوؤں کی اکثریت ۱۹۴۷ میں ہونے والے بٹوارہ کو بھلا نہ سکی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شمالی ہند کا علاقہ، جو ملک کا قائدانہ علاقہ ہے، وہ زیادہ تر منفی سرگرمیوں میں پڑا رہا۔ وہ یکسوئی کے ساتھ مستقبل کی تعمیر میں اپنے آپ کو وقف نہ کر سکا۔

اب آخری وقت آ گیا ہے کہ برادرانِ وطن اس کوتاہی کو محسوس کریں۔ وہ بٹوارہ کی نفسیات سے اپنے آپ کو خالی کر کے نئے انڈیا کی مثبت تعمیر میں لگ جائیں۔ اس کے بعد وہ دن دور نہیں جب کہ ملک تیز رفتاری کے ساتھ اپنا سفر شروع کر دے اور عالمی نقشہ میں اپنے لیے وہ باعزت جگہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے جس کا وہ بجا طور پر مستحق ہے۔

اب انڈیا کے مسلمانوں کے مسئلہ کو لیجئے۔ ملک کے مختلف فرقوں میں وہ پہلے ہی ترقی کے اعتبار سے پیچھے تھے، اب ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو بابری مسجد ڈھائے جانے کے بعد وہ مزید مایوسی کا شکار ہو گئے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اب ان کے لیے اس ملک میں ترقی کے مواقع موجود نہیں۔

یہ سوچ سراسر غلط ہے۔ اس سلسلہ میں بنیادی بات یہ ہے کہ کوئی بھی خارجی حادثہ کسی قوم کے عروج و زوال کا فیصلہ نہیں کرتا۔ کسی قوم کے عروج و زوال میں جو چیز فیصلہ کن بنتی ہے وہ اس قوم کی داخلی طاقت ہے، نہ کہ خارجی واقعات۔ قومیں ہمیشہ اپنے داخلی عزم سے آگے بڑھتی ہیں۔ اگر عزم و ہمت موجود ہو تو کوئی بھی خارجی حادثہ قوم کی ترقی میں رکاوٹ نہیں بن سکتا۔

جہاں تک مسجد کا تعلق ہے، تو مسجدوں کے ساتھ اس طرح کے حادثات بار بار پیش آئے ہیں۔ ۶۹۲ء میں حجاج بن یوسف کی فوجوں نے کعبہ کے اوپر منجنیق کے ذریعہ گولہ باری کی۔ حتی کہ تاریخ میں اس کی بابت یہ الفاظ لکھے گئے کہ مکہ کا محاصرہ کر لیا گیا۔ حرم پر گولہ باری کی گئی۔ اور کعبہ میں آگ لگا دی گئی۔ مقدس حجر اسود تین جگہ سے ٹوٹ گیا:

Mecca was besieged, the haram bombarded with missiles, and the Kaba set on fire, the sacred Black Stone was split in three pieces. (1/1047)

اس کے باوجود اسلام کی تاریخ نہیں رکی۔ اور کعبہ کی مقدس مسجد پر گولہ باری کرنے والوں ہی نے دوبارہ اس کی تعمیر کرائی۔ ۱۲۵۸ء میں تاتاریوں نے مسلم دنیا پر حملہ کیا اور سمرقند سے حلب تک سیکڑوں مسجدوں کو ڈھادیا۔ مگر اس حادثہ کے بعد بھی اسلام کی تاریخ نہیں رکی اور دوبارہ انھیں تاتاریوں نے ان تمام مسجدوں کو پھر سے تعمیر کرایا۔ خود انڈیا میں ۱۹۴۷ میں ہریانہ اور پنجاب اور راجستھان کے علاقہ میں ہزاروں کی تعداد میں مسجدیں ڈھائی گئیں۔ مگر اس کے باوجود یہاں اسلام کی تاریخ نہیں رکی۔ پھر اجودھیا کی بابری مسجد کے ڈھائے جانے سے کیوں ایسا ہوگا کہ اسلام کی تاریخ آگے بڑھنے سے رک جائے گی۔

اس وقت مسلمانوں کے لیے اہم بات یہ نہیں ہے کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو بابری مسجد ڈھادی گئی۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اب بھی تین لاکھ سے زیادہ مسجدیں انڈیا میں موجود ہیں۔ اس سے بھی زیادہ بڑی تعداد میں ان کے چھوٹے اور بڑے مدرسے سارے ملک میں قائم ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں بڑے بڑے اسلامی ادارے اور اسلامی جماعتیں موجود ہیں۔ ان کے علاوہ ۶ دسمبر کا حادثہ پیش آنے کے باوجود مسلمانوں کے لیے ترقی کے تمام مواقع بدستور یہاں موجود ہیں۔

ایسی حالت میں ان کے لیے مایوسی یا دل شکستگی کا کوئی سوال نہیں۔ انھیں چاہیے کہ وہ نئے عزائم کے ساتھ اپنی تعمیر کا عمل شروع کردیں، اور پھر بہت جلد وہ دیکھیں گے کہ ۶ دسمبر کو انھوں نے جتنا کھویا تھا اس سے بہت زیادہ انھوں نے ۶ دسمبر کے بعد یہاں اپنے لیے پالیا ہے۔ یہی ماضی کا پیغام ہے اور یہی مستقبل کی پکار بھی۔

ہمت کا امتحان

انڈیا میں مسجد۔مندر کا جھگڑا پچاس سال سے بھی زیادہ عرصہ سے چل رہا ہے۔ مگر واقعات بتاتے ہیں کہ دونوں فرقوں کے درمیان موجودہ قسم کی سرگرمیاں اس جھگڑے کو صرف بڑھاتی رہی ہیں۔ یہاں تک کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے بعد اب یہ قضیہ اس مرحلہ میں پہنچ گیا ہے کہ بی جے پی کے سینیر لیڈر مسٹر اٹل بہاری باجپائی نے اس کو قومی المیہ (national tragedy) قرار دیا ہے۔
مسٹر جے ایس یادو (J.S. Yadava) کا ایک مضمون ہندستان ٹائمس (۲ جنوری ۱۹۹۲) میں چھپا ہے۔ اس کا عنوان ہے :

Turning adversity into an opportunity.

اس میں انھوں نے بجا طور پر لکھا ہے کہ یہ مسئلہ اب ہمارے سماج کے لیے سرطان بن گیا ہے۔ اور ۶ دسمبر کو بابری مسجد کا ڈھایا جانا اس عداوتی سرطان کا پہلا اظہار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خود قوم کا بقا اس وقت داؤ پر لگا ہوا ہے :

It has become cancerous and the demolition of the Babari Masjid is the first major eruption of the malignant tumor of Indian polity. The very survival of our nation is at stake. (p.11)

اب سوال یہ ہے کہ کیا ہم اس مسئلہ کو لامتناہی طور پر جاری رکھیں گے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی اس آخری حد پر پہنچ جائے کہ ہر طرف انارکی پھیل جائے۔ ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے اور ہندو اور مسلمان دونوں دو برباد فرقے بن کر رہ جائیں جس طرح لبنان اور یوگوسلاویہ میں اسی طرح کے جھگڑوں کے نتیجہ میں پیش آچکا ہے۔

یا ہم ایسا کریں گے کہ مسجد اور مندر کے جھگڑے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں گے تاکہ ملک ترقی کے راستہ پر بے روک ٹوک اپنا سفر شروع کر سکے اور بالآخر ایک طاقت ور قوم کی حیثیت سے عالمی نقشہ پر نمایاں ہو۔ ہر محب وطن یقیناً یہ کہے گا کہ ہمیں اسی دوسری بات کا فیصلہ کرنا چاہیے اور جرأت مندانہ طور پر ایک ایسے حل پر راضی ہو جانا چاہیے جس میں یکساں طور پر دونوں فرقوں کا بھلا ہو۔

زندگی مسائل سے بھری ہوئی ہے۔ جب کوئی مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو نادان آدمی اپنی نادانی سے اس کو بگاڑ لیتا ہے، اور دانش مند آدمی مسئلہ کو عبور کرکے دوبارہ آگے بڑھ جاتا ہے۔

زندگی کا سفر کبھی ہمواری کے ساتھ طے نہیں ہوتا۔ یہاں بار بار اونچ نیچ کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ یہاں ہمیشہ احوال وظروف بدلتے رہتے ہیں۔ اس لیے اس دنیا میں بار بار نیا فیصلہ لینے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ جو لوگ بدلے ہوئے حالات میں نیا فیصلہ لے سکیں وہ کامیاب رہتے ہیں۔ اور جو لوگ نیا فیصلہ لینے کی دانش مندی نہ دکھا سکیں وہ یہاں ناکام و نامراد ہو کر رہ جاتے ہیں۔

دور اول میں جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا وطن چھوڑ کر مکہ سے مدینہ جانے کا ارادہ کیا تو یہ ایک نیا فیصلہ تھا۔ حدیبیہ کے موقع پر جب عمرہ کے لیے آگے بڑھنے کے بجائے آپ نے یہ طے کیا کہ جہاں سے آئے تھے وہیں دوبارہ واپس چلے جائیں تو یہ ایک نیا فیصلہ تھا۔ غزوۂ موتہ کے موقع پر جب خالد بن الولیدؓ نے یہ منصوبہ بنایا کہ رومیوں سے لڑائی جاری رکھنے کے بجائے اپنی فوجوں کو پیچھے کی طرف لے جائیں تو یہ ایک نیا فیصلہ تھا۔

اسلام کے دور اول کی تاریخ میں بار بار اس طرح کے نئے فیصلے لیے گئے ہیں۔ یہی نئے فیصلے تھے جن کی وجہ سے اسلام کی تاریخ مسلسل آگے بڑھتی رہی۔ اگر اہل اسلام میں نیا فیصلہ لینے کی طاقت نہ ہوتی تو اسلام کی تاریخ بند گلی میں پھنس کر رہ جاتی، وہ آگے بڑھنے کی صلاحیت کھو دیتی۔

آج عالمی سطح پر مسلمانوں کی بربادی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے نیا فیصلہ لینے کی صلاحیت کھو دی ہے۔ ان کے تمام لیڈروں کا حال یہ ہے کہ وہ صرف راستہ کی رکاوٹوں سے ٹکرانا جانتے ہیں، وہ رکاوٹوں سے ہٹ کر اپنے لیے نیا راستہ بنانا نہیں جانتے۔ موجودہ زمانہ میں بار بار یہ صورت پیش آئی کہ مسلم رہنماؤں کو کوئی نیا فیصلہ لینا تھا۔ مگر ان کا حال یہ ہوا کہ ایک بار جس راستہ پر چل پڑے، بس آنکھ بند کرکے اس پر چلتے رہے۔ یہاں تک کہ خود بھی خندق میں گر پڑے اور قوم کو بھی خندق میں گرا دیا۔

یہ دنیا ایک تغیر پذیر دنیا ہے۔ یہاں افراد اور قوموں کے لیے تخلیقی صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ تخلیقی صلاحیت کے بغیر یہاں ترقی اور کامیابی ممکن نہیں۔

یہ دنیا ایک بدلتی ہوئی دنیا ہے۔ یہاں افراد اور قوموں کو بار بار تخلیقی صلاحیت کا ثبوت دینا ہوتا ہے۔ تخلیقی صلاحیت ہی اس تغیر پذیر دنیا میں ترقی کا واحد راز ہے۔ تخلیقی صلاحیت کے بغیر یہاں کسی کے لیے بھی ترقی اور کامیابی کو پانا ممکن نہیں۔

اس دنیا میں ایسا ہوتا ہے کہ آدمی بولنا شروع کرتا ہے۔ پھر حالات کا تقاضا ہوتا ہے کہ وہ چپ ہو جائے۔ آدمی آگے کی طرف بڑھتا ہے۔ پھر حالات کہتے ہیں کہ پیچھے کی طرف لوٹ جاؤ۔ آدمی ایک مانگ لے کر اٹھتا ہے۔ پھر حالات پکارتے ہیں کہ اپنی زبان بند کر لو۔ آدمی حالات کا ایک اندازہ کر کے اپنا منصوبہ بناتا ہے۔ پھر حالات کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں، اور ضرورت ہوتی ہے کہ نیا نقشہ اور نیا منصوبہ بنایا جائے۔

اس دنیا کا یہ قانون افراد کے لیے بھی ہے اور قوموں کے لیے بھی۔ یہاں صرف وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو پیش آمدہ مواقع پر نیا فیصلہ لے سکیں۔ جو لوگ حالات کے مطابق نیا فیصلہ لینے سے محروم رہیں وہ یقیناً کامیابی کی منزل تک پہنچنے سے بھی محروم رہیں گے۔

جب بھی کوئی نیا فیصلہ لیا جاتا ہے تو اس میں رسک بھی ضرور شامل رہتا ہے۔ رسک زندگی کا ایک ناگزیر عنصر ہے۔ رسک لیے بغیر اس دنیا میں کوئی بھی عمل نہیں کیا جاسکتا، نہ شخصی سطح پر اور نہ قومی سطح پر۔ رسک سے خالی دنیا صرف قبرستان میں مل سکتی ہے۔ جہاں تک زندگی کے میدانوں کا تعلق ہے، وہ ہمیشہ رسک سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔

زندگی میں جب بھی کوئی نیا موڑ آتا ہے تو وہ افراد اور قوموں کے لیے امتحان ہوتا ہے۔ یہ موڑ ہر ایک کے لیے آتا ہے، موڑ آنے پر جو لوگ وہاں مڑنے سے ہچکچائیں وہ ٹھٹھر کر رہ جائیں گے۔ اور جو لوگ موڑ آنے کے بعد حوصلہ کیساتھ آگے بڑھ جائیں، وہی انقلابات کی اس دنیا میں کامیابی کی منزل تک پہنچیں گے۔

اجودھیا کا مسئلہ جو اس وقت ملک کے اکثریتی فرقہ اور اقلیتی فرقہ کے درمیان نزاع کا سبب بنا ہوا ہے، وہ بھی اسی قسم کا ایک موڑ ہے۔ ضرورت ہے کہ دونوں فرقے اس نازک تاریخی موقع پر نیا فیصلہ لینے کی ہمت کریں۔ کسی انقلابی فیصلہ تک پہنچنا صرف اس وقت ممکن ہوگا جبکہ دونوں حوصلہ مندی کا ثبوت دیں، دونوں ایک دوسرے پر اعتماد کریں۔ حتی کہ خطرہ مول لے کر معاملہ کو ختم کرنے پر راضی ہو جائیں۔ زندگی ہمت کا امتحان ہے، اور اجودھیا آج دونوں فرقوں کے لیے اسی ہمت کا امتحان بن گیا ہے۔

سب سے بڑا خطرہ

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے بعد پوری قوم میں نہایت شدت کے ساتھ خود احتسابی کی فضا پیدا ہوئی ہے۔ عام طور پر یہ سوچا جا رہا ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ آزادی کے تقریباً نصف صدی گزرنے کے بعد بھی ہمارا ملک ترقی کی طرف اپنا سفر شروع نہ کر سکا۔ ہمارے عوام و خواص آج بھی اشوز اور نان اشوز کا فرق نہیں سمجھتے۔ وہ ایک نظر انداز کرنے والے معاملہ پر بھی اسی جوش کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جس طرح ایک ایسے معاملہ پر کھڑا ہونا چاہیے جو نظر انداز کرنے کے قابل نہ ہو۔

اس نیشنل ڈیبیٹ میں جو لوگ حصہ لے رہے ہیں ان میں بظاہر دو گروپ ابھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک وہ جس کا کہنا ہے کہ ساری قومی مصیبتوں کی جڑ بناوٹی سیکولرزم (Pseudo secularism) ہے۔ اس کے مقابلہ میں دوسرے گروہ کا یہ کہنا ہے کہ تمام مصیبتیں بناوٹی ہندوازم (Pseudo Hinduism) کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ یہ دونوں ہی سطحی توجیہیں ہیں۔ ہماری موجودہ مصیبتوں کی اصل جڑ وہ چیز ہے جس کو میں بناوٹی انٹلکچولزم (Pseudo intellectualism) کا نام دینا پسند کروں گا۔

اصل یہ ہے کہ ہر سماج میں ہمیشہ خواص کا ایک طبقہ ہوتا ہے۔ اس طبقہ کے لوگوں کو آپ رائے بنانے والے (opinion makers) کہہ سکتے ہیں۔ یہ طبقہ پچھلے سماجوں میں بھی موجود رہتا تھا۔ مگر اب پریس اور میڈیا کے ذرائع وجود میں آنے کے بعد اس طبقہ کا رول بہت بڑھ گیا ہے۔ پچھلے سماج میں کوئی رائے بنانے والا اپنی باتوں سے جتنے لوگوں کو متاثر کر سکتا تھا، آج اس سے ہزار گنا زیادہ بڑے پیمانہ پر متاثر کرنا ایک شخص کے لیے ممکن ہو گیا ہے۔

موجودہ زمانہ میں، مختلف اسباب سے، ہمارے انٹلکچول کلاس نے بہت غلط کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے پوری قوم، خاص طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں کی سوچ کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔

ہر سماج میں ہمیشہ مختلف قسم کے واقعات پیش آتے ہیں۔ ان واقعات کو صحیح رخ سے دیکھا جائے تو آدمی کے اندر صحیح ذہن بنے گا۔ اور اگر ان کو غلط رخ سے دیکھا جائے تو غلط

ذہن بننے لگے گا۔ انٹلکچول کلاس کا کام یہ ہے کہ وہ لوگوں کی فکری تربیت اس طرح کرے کہ وہ پیش آنے والے واقعات کو صحیح رخ سے دیکھ سکیں۔ مگر ہمارے ملک کا انٹلکچول کلاس اس معاملہ میں اپنی ذمہ داری کو درست طور پر نبھانے میں ناکام ثابت ہوا ہے۔

اپنے ناقص علم کی بنا پر یا اپنے حقیر مفادات کی بنا پر، اس نے یہ کیا کہ نان اشو کو اشو بنایا۔ ایک واقعہ جس کا تعلق کسی اور پہلو سے تھا اس کو کسی اور پہلو سے جوڑ دیا۔ ایک معاملہ جو نظرانداز کرنے کے قابل تھا اس کو بڑھا چڑھا کے پیش کر کے اس پر لوگوں کو بھڑکا دیا۔ دس باتوں میں نو باتیں اگر اچھی تھیں تو ان نو باتوں کو بیان نہیں کیا اور ایک بری بات کا چرچا زور شور کے ساتھ ہر طرف پھیلا دیا۔ ایک چیز جو افواہ کے نوعیت کی تھی، اور ضرورت تھی کہ اس کی تحقیق کی جائے، مگر بلا تحقیق اس کو شہرت دینا شروع کر دیا۔ وغیرہ۔

اس قسم کی باتوں کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ لوگوں کی سوچ بگڑ گئی۔ اب عام لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ نہ مسائل کا صحیح تعین کر پاتے اور نہ یہ سمجھ پاتے کہ ان مسائل کے حل کے لیے انھیں کیا کرنا چاہیے۔ پہلے وہ زیادہ تر اپنی فطرت اور کامن سنس کی رہ نمائی میں ایک قریبی فیصلہ کر لیتے تھے۔ مگر اب میڈیا کے دور میں وہ انٹلکچول کلاس کی باتوں کو سن کر یا پڑھ کر رائے بناتے ہیں، اس بنا پر سارا معاملہ غلط ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے یہاں میں کچھ مثالیں دوں گا:

۱۔ ہندو دانشوروں کے ایک طبقہ نے پچھلے کچھ برسوں سے ہندوؤں میں نہایت شدت کے ساتھ یہ ذہن پیدا کیا ہے کہ کانگریس پارٹی اپنے طویل دور حکومت میں مسلمانوں کے ساتھ خوش کرنے (Appeasement) کی پالیسی چلاتی رہی ہے۔ اس پالیسی کی ایک روشن مثال (glaring example) ان کے نزدیک، شاہ بانو تحریک کے بعد بننے والے اس ایکٹ کی ہے جس کا پورا نام اس طرح ہے:

Muslim Women (Protection of Rights on Divorce) Act 1986)

اس ایکٹ کو راجیو گاندھی کی حکومت نے منظور کیا تھا۔ مگر اس کو مسلمانوں کو خوش کرنے کی پالیسی سے جوڑنا سراسر بے اصل ہے، کیونکہ خوش کرنا ایک ایسا کام ہے جو یک طرفہ طور پر کیا جاتا ہے۔ جب کہ یہاں واضح طور پر دو طرفہ معاملہ کیا گیا۔ راجیو گاندھی کی حکومت نے ۶ مئی ۱۹۸۶

کو یہ ایکٹ لوک سبھا میں منظور کرایا تھا، مگر جب کانگریسی حکومت نے اس "مسلم نوازی" کا فیصلہ کیا تو اسی کے ساتھ اس نے زیادہ بڑے پیمانہ پر "ہندو نوازی" کا عمل کیا۔ چنانچہ اس نے یکم فروری ۱۹۸۶ کو بابری مسجد کے دروازے پر عدالتی فیصلہ کے تحت لگے ہوئے تالے کو کھلوا دیا۔ دونوں کا تقابل کیجئے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کے ساتھ اگر اپیزمنٹ ہوا تو ہندوؤں کے ساتھ سپر اپیزمنٹ کا معاملہ کیا گیا۔

ہندو دانشوروں نے تالا کھولنے کے معاملہ کو حذف کر کے ایکٹ بنانے کے معاملہ کو خوب بڑھا چڑھا کر پھیلایا۔ یہاں تک کہ ہندوؤں کے ایک بڑے طبقہ کے ذہن کو انھوں نے مسموم کر دیا۔ اس کے نتیجہ میں اور اس طرح کی دوسری باتوں کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ ہندوؤں کے دل میں مسلمانوں کے خلاف شدید نفرت پیدا ہوگئی۔ ہندو لوگ دیش کی مثبت تعمیر کے بجائے مسلمانوں کے خلاف منفی سرگرمیوں میں اپنی طاقت صرف کرنے لگے۔

اب اسی نوعیت کی برعکس مثال لیجئے جب کہ انٹلکچول کلاس نے اپنا صحیح رول ادا کیا اور اس کے نتیجہ میں قوم کو زبردست ترقی کا تحفہ ملا۔ یہ دوسری مثال جاپان کی جدید تاریخ سے تعلق رکھتی ہے۔

ہیروشیما کو جاپان کے ایک بڑے شہر کی حیثیت حاصل ہے۔ ہیروشیما میں جنگی اہمیت کی صنعتیں قائم کی گئیں۔ ۱۸۶۸ کے بعد تقریباً ۵۰ سال تک اس کو جاپان میں سب سے بڑے ملٹری سنٹر کی حیثیت حاصل تھی۔ دوسری عالمی جنگ میں ۶ اگست ۱۹۴۵ کو امریکہ نے ہیروشیما کے اوپر ایٹم بم گرایا اور اس کو پوری طرح تباہ کر دیا۔

اس کے بعد جاپان میں امریکہ کے خلاف شدید نفرت پیدا ہوئی۔ خاص طور پر فوج کے لوگ امریکہ کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھنے لگے اور نتائج کی پروا کیے بغیر اس سے لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس وقت جاپانیوں میں سے کچھ سچے قسم کے انٹلکچول اٹھے۔ انھوں نے پوری جاپانی قوم کی سوچ کو بدل دیا۔

انھوں نے جاپانیوں کو بتایا کہ اگست ۱۹۴۵ میں امریکہ نے اگر ہمارے ہیروشیما کو تباہ کیا تو اس سے پہلے دسمبر ۱۹۴۱ میں ہم امریکہ کے پرل ہاربر کو تباہ کر چکے تھے، اس طرح معاملہ برابر ہو گیا۔ اس بات نے جاپانیوں کے ذہن کو ٹھنڈا کر دیا۔ وہ منفی رخ پر دوڑنے کے بجائے

مثبت رخ پر چل پڑے۔ وہ امریکہ کی تخریب کے بے فائدہ عمل میں لگنے کے بجائے خود اپنی تعمیر کے میدان میں سرگرم ہو گئے۔ اس کا نتیجہ ایک عظیم ترقی کی صورت میں آج ساری دنیا کے سامنے ہے۔

ہندو دانشور اگر یہی دانشوری کرتے تو وہ ہندوؤں سے کہتے کہ حکومت نے اگر مسلمانوں کو پرسنل لا ایکٹ دیا ہے تو تم کو بھی اس نے ایک بہت بڑی چیز دی ہے۔ وہ یہ کہ بابری مسجد کا بند تالا کھول کر اس کے اندر تم کو درشن اور پوجا کی اجازت دے دی۔ اگر وہ ایسا کرتے تو انڈیا میں بھی وہی واقعہ ہوتا جو جاپان میں پیش آیا۔ مگر ہندو دانشور جاپانی دانشوروں جیسی رہنمائی دینے میں ناکام رہے۔ اس کا نتیجہ عظیم تباہی کی صورت میں آج ہمارے سامنے ہے۔

ہر سماج میں ہمیشہ مختلف قسم کے واقعات پیش آتے ہیں۔ ان واقعات کی ایک اصل توجیہہ ہوتی ہے، اور ایک اصل حقیقت سے ہٹی ہوئی توجیہہ۔ عام آدمی اس فرق کو سمجھ نہیں پاتا۔ یہ خواص (انٹلکچول کلاس) کا کام ہے کہ وہ واقعہ کا گہرا مطالعہ کرے اور اس کی صحیح توجیہہ لوگوں کے سامنے پیش کرے۔ یہی وہ بات ہے جو قرآن میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے :

اور جب ان کو کوئی بات امن یا خوف کی پہنچتی ہے تو وہ اس کو پھیلا دیتے ہیں۔ اور اگر وہ اس کو رسول تک یا اپنے ذمہ دار اصحاب تک پہنچاتے تو ان میں سے جو لوگ تحقیق کرنے والے ہیں، وہ اس کی حقیقت کو جان لیتے۔ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تھوڑے لوگوں کے سوا تم سب شیطان کے پیچھے لگ جاتے (النساء ۸۳)

بدقسمتی سے انڈیا میں دونوں فرقوں کے انٹلکچول کلاس نے اس معاملہ میں اپنی ذمہ داری کو ادا نہیں کیا۔ دونوں ہی نے ذہن کو بگاڑنے کا کام بہت بڑے پیمانہ پر انجام دیا۔ ایک طرف ہندوؤں کے انٹلکچول کلاس کے لوگوں نے واقعات کو غلط انداز میں پیش کر کے ہندوؤں کی سوچ کو زہر آلود کر دیا۔ دوسری طرف مسلم انٹلکچول کلاس نے مسلمانوں کی سوچ کو الٹے رخ پر موڑ دیا۔ یہاں تک کہ دو پڑوسی فرقے جو سیکڑوں سال سے ایک دوسرے کے دوست بنے ہوئے تھے وہ ایک دوسرے کے دشمن بن کر کھڑے ہو گئے۔

قرآن میں ایک مرد کو چار عورتوں تک سے نکاح کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ یہ قطعی طور پر ایک ایمرجنسی کا قانون ہے۔ مگر ہندو دانشوروں نے اس کو انتہائی خلاف واقعہ طور پر عام حکم

کی حیثیت دے دی۔ انھوں نے ہندو کو بتایا کہ دیکھو، پاکستان بنوا لینے کے بعد بھی مسلمان تمہارے لیے خطرہ بنا ہوا ہے۔ ہر مسلمان اپنے مذہب کی تعلیم کے مطابق، چار شادی کرتا ہے اور بے تحاشا بچے پیدا کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہونے والا ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد انڈیا میں مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں سے زیادہ ہو جائے۔ اور وہ یہاں تمہارے اوپر حکومت کرنے لگیں۔

یہی خطرہ کی نفسیات مسلم دانشوروں نے بھی مسلمانوں کے اندر بڑے پیمانہ پر پیدا کی۔ ملک کا بٹوارہ ہندو۔مسلم منافرت کی بنا پر ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ آزادی کے بعد لوگ معمولی معمولی باتوں پر بھڑکنے لگے اور فساد کی صورتیں پیدا ہوتی رہیں۔ ان فرقہ وارانہ فسادات کا اصل سبب صبر و اعراض نہ کرنا تھا۔ مگر مسلم دانشوروں نے اس کو غلط طور پر اس مفروضہ سے جوڑ دیا کہ ہندو انڈیا کو مسلمانوں کے لیے دوسرا اسپین بنانا چاہتے ہیں اور ہندو لیڈر بار بار اسپین کا سفر کر رہے ہیں تاکہ وہاں سے وہ تکنیک سیکھ کر آئیں جس کو یہاں دہرا سکیں۔

یہ دونوں ہی باتیں بالکل بے بنیاد تھیں۔ ان میں سے کسی کی بھی کوئی اصل نہ تھی۔ مسلمانوں میں چار شادی یا اضافۂ آبادی کی بات سراسر افسانہ تھی۔ اسی طرح ہندوؤں کے بارہ میں یہ بات قطعی طور پر ایک افواہ تھی کہ وہ انڈیا کو دوسرا اسپین بنانا چاہتے ہیں۔ مگر دونوں طرف کے دانشوروں نے ان کو عوام میں اس طرح پھیلایا کہ یہ خیالات دونوں فرقوں کے اوپر کابوس بن کر چھا گئے۔

یہی بابری مسجد کے سلسلہ میں پیش آیا۔ ایک طرف ہندو دانش وروں نے دوسری ہار (second defeat) کا نظریہ ایجاد کیا۔ انھوں نے کہا کہ ۱۹۴۷ کا بٹوارہ تمہارے لیے پہلی ہار تھی۔ اب بابری مسجد کی جگہ رام مندر کا نہ بننا تمہارے لیے دوسری ہار ہوگی۔ چنانچہ ہندو بھڑک اٹھا۔ اس نے سوچا کہ پہلی ہار ہم نے انگریزوں کی موجودگی کی وجہ سے برداشت کر لی۔ اب ہم آزاد ہیں، اب ہم کسی قیمت پر دوسری ہار کو قبول نہیں کریں گے۔

دوسری طرف مسلم دانشوروں نے "علامت" کا جھوٹا نظریہ ایجاد کیا۔ انھوں نے کہا کہ بابری مسجد کا معاملہ صرف ایک مسجد کا معاملہ نہیں ہے، وہ پوری ملت کے وجود و بقا کی علامت ہے۔ اگر یہاں ہم پیچھے ہٹے تو اس کے بعد اس ملک سے ہمارا سارا خیمہ اکھڑ جائے گا۔ مگر یہ ایک لغو بات تھی۔ چنانچہ بابری مسجد کا ڈھانچہ ٹوٹ گیا اور ملت کا وجود بدستور پوری طرح باقی ہے۔

بھارتیہ جنتا پارٹی نے وہ کام کر دیا ہے جو سر سید بھی نہ کر سکے تھے۔ سر سید صرف کچھ مسلمانوں کو تعلیم کی طرف متوجہ کر سکے تھے، بھارتیہ جنتا پارٹی نے عام مسلمانوں کو تعلیم کے راستہ میں ڈال دیا۔

۱۷ جنوری ۱۹۹۲ کی رات کو دس بجے حیدر آباد سے حبیب بھائی کا ٹیلی فون آیا۔ انھوں نے بتایا کہ ۶ دسمبر کے حادثہ نے حیدر آباد کے مسلمانوں کو ہلا دیا ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اب مسلمانوں میں واضح طور پر تعمیری ذہن بن رہا ہے۔ ہر آدمی ماضی کی شکایت کرنے کے بجائے مستقبل کی تعمیر کی بات کر رہا ہے۔ لوگ عام طور پر یہ سوچنے لگے ہیں کہ ہمیں جھگڑے والی باتوں کو نظر انداز کر کے تعلیم اور اقتصادیات اور دوسرے ترقی کے میدانوں میں اپنی جدوجہد جاری کر دینا چاہیے۔ اس عمل کو تیز تر کرنے کے لیے حبیب بھائی اور ان کے ساتھیوں نے طے کیا ہے کہ اپنے علاقہ میں الرسالہ کو زیادہ سے زیادہ پھیلا دیں۔

اس گفتگو کے بعد میں اپنے بستر پر سو گیا۔ صبح ساڑھے پانچ بجے دوبارہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ریسیور اٹھایا تو آواز آئی کہ میں مسز زبیر رضوی ریڈیو اسٹیشن سے بول رہی ہوں۔ ہم لوگوں نے طے کیا ہے کہ دہلی میں مسلم خواتین کی بیداری کا کام کریں۔ اس وقت سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ ہم اپنے بچوں میں تعمیری ذہن پیدا کریں۔ ان کو نفرت اور شکایت والی سوچ سے بچائیں اور ان کے اندر یہ شعور پیدا کریں کہ وہ جھگڑے والی باتوں سے دور رہ کر اپنے مستقبل کی تعمیر کی جدوجہد کر سکیں۔ اس کے مطابق ہم نے آج شام کو دہلی میں مسلم خواتین کا ایک اجتماع رکھا ہے۔ آپ اپنی صاحبزادی ڈاکٹر فریدہ خانم کو وہاں بھیجیں تاکہ وہ اس معاملہ میں ہمارا تعاون کر سکیں۔

یہ ان بہت سے تجربات میں سے صرف دو تجربے ہے جو ۶ دسمبر کے بعد سے مسلسل سامنے آ رہا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ۶ دسمبر کے واقعہ کو ہندستان کے مسلمانوں نے ٹریجڈی کے دن کے طور پر نہیں لیا۔ بلکہ اس کو ایک نیا فیصلہ لینے کا دن بنا دیا۔ اب انھوں نے طے کیا ہے کہ مسلم لیڈروں کی دوسروں کے خلاف شکایتی تقریروں اور غیر مسلم انتہا پسندوں کے اشتعال انگیز نعروں کو نظر انداز کر کے "اپنی تعمیر آپ" کے اصول پر آگے بڑھیں گے۔ چنانچہ تعلیم کا رجحان مسلمانوں میں بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔

یہ بلاشبہ ایک صحت مند فیصلہ ہے۔ اور جو لوگ ایسا فیصلہ کر لیں، ان کی ترقی کسی بھی حال میں اور کسی بھی مقام پر رکنے والی نہیں۔

ایک تقریر

آج کی بحث کا موضوع ہے : ہماری ری پبلک ۶ دسمبر کے بعد (Our Republic - Post 6 December 1992) انڈیا کی تاریخ میں ۶ دسمبر کا واقعہ بلاشبہ ایک ہلا دینے والا واقعہ ہے، مگر میں سمجھتا ہوں کہ اس کی وجہ سے ہماری ری پبلک کے ڈھانچہ میں کوئی قابل لحاظ تبدیلی آنے کا امکان نہیں۔ اس کے کئی واضح اسباب ہیں۔

۱۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کا واقعہ ایک کھلا ہوا تشدد کا واقعہ تھا۔ یہ ایک مسلّم اصول ہے کہ اگر کسی کو یقین ہو کہ وہ غیر متشددانہ طور پر اپنا مقصد حاصل کر سکتا ہے تو وہ کبھی تشدد کا طریقہ اختیار نہیں کرتا۔ تشدد کا طریقہ اختیار کرنا صرف اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی کے لیے پُرامن اپنا مقصد حاصل کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔

اگر یہ مان لیا جائے تو ۶ دسمبر کا واقعہ اصحابِ واقعہ کے لیے اپنی نفی آپ (سلف نگیشن) کے ہم معنی تھا۔ جن لوگوں نے یہ تشدد کیا، انھوں نے ایسا کر کے خود اپنے آپ کو پیچھے دھکیل دیا ہے نہ کہ ہماری ڈیموکریٹک سیکولر ری پبلک کو۔ ۶ دسمبر کے بارہ میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس کے پیچھے جو تحریک ہے، یہ اس کے لیے خاتمہ کا آغاز (beginning of the end) کے ہم معنی ہے۔

۲۔ دوسری بات یہ کہ جس مذہبی سیاسی تحریک نے ۶ دسمبر کا واقعہ کیا وہ دراصل پاکستان اور دوسرے مسلم ملکوں میں چلنے والی ان تحریکوں کا بھارتی ایڈیشن ہے جس کو عام طور پر اسلامائزیشن کی تحریک کہا جاتا ہے۔ اسلامائزیشن کی یہ تحریکیں اس سے پہلے پاکستان اور مصر اور دوسرے کئی مسلم ملکوں میں زور و شور سے چلائی گئیں۔ لیکن ہر جگہ وہ ناکام رہیں۔ مسلم ملکوں کی ان تحریکوں نے وقتی طور پر سماج میں کچھ ازعاج (nuisance) تو ضرور پیدا کیا۔ مگر اس سے آگے ملک کا نقشہ بدلنے میں وہ کوئی قابلِ ذکر کامیابی حاصل نہ کر سکے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلم ملکوں کی یہ تحریکیں دراصل خلاف زمانہ تحریکیں تھیں۔ وہ اسپرٹ آف دی ایج کے خلاف تھیں۔ ٹھیک اسی طرح انڈیا کی مذہبی۔ سیاسی تحریک بھی اسپرٹ آف دی ایج کے خلاف ہے۔ اس لیے وہ بھی زیادہ سے زیادہ سماج میں کچھ ازعاج پیدا کر سکتی ہے۔ اس سے

آگے وہ کوئی انقلابی کردار ادا نہیں کر سکتی۔ کیوں کہ کسی کے لیے بھی یہ ممکن نہیں کہ وہ زمانہ سے لڑ کر اپنا ایک الگ سیاسی جزیرہ بنا سکے۔ مسلم فنا ٹزم مسلم ملکوں میں سیاسی طاقت حاصل کرنے میں ناکام رہا ہے۔ اسی طرح ہندو فنا ٹزم بھی یہاں سیاسی طاقت حاصل کرنے میں ناکام رہے گا۔

۳۔ انڈیا کی یہ مذہبی۔ سیاسی تحریک بنیادی طور پر ہندی اسپیکنگ کمیونٹی کی تحریک ہے۔ اس کا سب سے بڑا مرکز یوپی ہے جہاں ایک ہی ریاست میں پارلی منٹ کی ۸۵ سیٹیں موجود ہیں۔ اس تحریک کا خاص ایڈوانٹج یہ ہے کہ وہ ہندی اپلیکنگ ریاستوں کے ووٹروں کے تقریباً ۲۵ فیصد حصہ کو اپنی طرف مائل کرنے میں کامیاب ہوئی ہے، مگر اس کا سب سے بڑا ایڈوانٹج ہی اس کا سب سے بڑا ڈس ایڈوانٹج بھی ہے، کیوں کہ اس کی جس صفت میں نصف انڈیا کے لیے اپیل ہے، وہی صفت بقیہ نصف میں اس کو غیر معقول بنا دیتی ہے۔ یہ انڈیا کا غیر ہندی خواں علاقہ ہے۔

ساؤتھ انڈیا کے سلسلہ میں یہ بات سامنے آچکی ہے کہ وہ ہندی کے لسانی غلبہ کو بھی گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں۔ پھر وہ ہندی کے لسانی غلبہ کے ساتھ ہندی دانوں کے سیاسی غلبہ کو کس طرح گوارا کرے گا۔

۴۔ مذہب کا کام کیریکٹر بلڈنگ ہے، مذہب کا کام گورنمنٹ بلڈنگ نہیں۔ مذہب سے اگر کیریکٹر بنانے کا کام لیا جائے تو یہ مذہب کی تعمیل ہے لیکن اگر مذہب کو گورنمنٹ حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا جائے تو یہ مذہب پر عمل کرنا نہیں، یہ مذہب کا اکسپلائٹیشن ہے۔ اور اکسپلائٹیشن کبھی بھی بہت دیر تک کارآمد نہیں ہوتا۔

کسی بھی چیز کا غلط استعمال (misuse) کرنا برا ہے۔ اور مذہب جیسی مقدس چیز کا غلط استعمال کرنا اور بھی زیادہ برا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ مذہب کو اکسپلائٹیشن کا ذریعہ بناتے ہیں وہ کبھی کامیابی کی منزل تک نہیں پہنچتے۔

اس قسم کے مختلف اسباب ہیں جو واضح طور پر بتاتے ہیں کہ ۶ دسمبر نے ہماری ری پبلک کے لیے کوئی قابل لحاظ مسئلہ پیدا نہیں کیا ہے۔ کچھ وقتی خلفشار کے بعد ہماری گاڑی دوبارہ اپنی پٹری پر آجائے گی۔ اور پھر وہ اسی طرح چلنے لگے گی جس طرح وہ اس سے پہلے چل رہی تھی۔

نیا دور

ہندو مسلم ڈائیلاگ

ڈاکٹر سید عابد حسین (۱۹۷۸-۱۸۹۶) نے اپنی کتاب مسلمانانِ ہند کی تقدیر The Destiny of Indian Muslims میں یہ نشاندہی کی ہے کہ ۱۹۴۷ کے بعد انڈیا میں جو انقلاب آیا ہے، اس کے بعد یہاں کے سماجی اور سیاسی حالات میں بنیادی تبدیلی آچکی ہے۔ اب انڈیا میں جمہوریت کا نظام ہے۔ مگر ہندستانی مسلمان ابھی تک قدیم حاکمانہ دور میں سوچ رہے ہیں۔ سوچ کا یہ پچھڑا پن ہی ان کے تمام مسائل کا بنیادی سبب ہے۔

۱۹۴۷ سے پہلے برٹش دور میں ان کا سابقہ ایک ایسی گورنمنٹ سے تھا جو یہاں کے عوام کے سامنے جواب دہ نہیں تھی۔ اس کی حیثیت ایک مختار کل Supreme Arbiter کی سی تھی جو عوام کی مرضی کا لحاظ کیے بغیر کارروائی کر سکتی تھی۔ مگر اب انڈیا ایک جمہوریت ہے۔ اب یہاں کے حکمراں کو عوام کی مرضی کے مطابق کام کرنا ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ یہاں کے عوام سے اپنے معاملات طے کریں نہ کہ حکمرانوں سے۔

مگر انڈیا کے مسلمان اب بھی اپنے معاملات میں حکومت کی طرف دیکھتے ہیں۔ وہ آج بھی اپنے مسائل کو گورنمنٹ کے پاس لے جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ ان کے مسائل کو حل کر دے گی:

> But Muslims still labour under the impression that solution of their problems is in the hands of the Government. To the Government alone they take their troubles and from it alone they expect a remedy (p.295).

مسلمانانِ ہند کی جدید تاریخ کے بارہ میں یہ تبصرہ بالکل درست ہے۔ اور بابری مسجد اجودھیا کے نام پر اٹھائی جانے والی تحریک اس کی بدترین مثال ہے۔ ۱۹۸۶ کے بعد مسلمانوں کے نااہل لیڈروں نے جس طرح بابری مسجد تحریک کو چلایا، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ انھوں نے اس اشو پر ہندو عوام سے ٹکراؤ کا طریقہ اختیار کیا، اور حکومت کی یہ ذمہ داری سمجھی کہ وہ ان کی طرف سے کافی ہو جائے اور اس معاملہ میں مختار کل بن کر ان کے حق میں فیصلہ دیدے۔ مگر ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے واقعہ نے بتایا کہ یہ مفروضہ سراسر غلط تھا۔ ۱۵ اگست ۱۹۹۲ کی تقریر

میں وزیر اعظم ہند نے اعلان کیا کہ وہ بابری مسجد کو ڈھانے نہیں دیں گے۔ دسمبر میں انھوں نے پولیس فورس کی دس کمپنی (۲۰ ہزار سے زیادہ) اجودھیا کی سرحد پر پہنچا دیں اور بہت سے دوسرے سرکاری انتظامات کیے۔ مگر عملاً وہی ہوا جو ہندو عوام چاہتے تھے۔۔۔۔۔۔ ۶ دسمبر کو کارسیوکوں نے اجودھیا میں گھس کر بابری مسجد کو ڈھا دیا، انھوں نے اس کا ایک ایک پتھر وہاں سے اٹھا کر دور پھینک دیا۔ اس کے بعد انھوں نے عین اسی جگہ پر ایک عارضی مندر بنا دیا۔ مزید یہ کہ انھیں اس کی بھی عدالتی اجازت مل گئی کہ وہ اس نئے مندر میں رام للا کی مورتیاں رکھ کر اس کا درشن اور پوجا شروع کر دیں۔

یہ واقعہ واضح طور پر حکومت کے اوپر عوام کی برتری کا ثبوت ہے۔ وہ آخری طور پر ثابت کر رہا ہے کہ اس ملک میں برتر حیثیت عوام کو حاصل ہے نہ کہ ان افراد کو جو عوام کے ووٹوں سے منتخب ہو کر محدود مدت کے لیے وزارت بناتے ہیں۔ اب عقل و تدبر سے خالی ہی کوئی شخص یہ یقین کر سکتا ہے کہ جو مرکزی حکومت بابری مسجد کے تاریخی ڈھانچہ کو توڑے جانے سے نہ بچا سکی وہ مرکزی حکومت ایسا کر سکتی ہے کہ نئے بنے ہوئے مندر کو بزور توڑے، اس میں نصب شدہ رام کی مورتیوں کو ہٹائے، اور پھر عین اسی جگہ پر دوبارہ بابری مسجد بنا کر کھڑی کر دے۔

مگر حیرت انگیز بات ہے کہ یہ کھلا ہوا واقعہ بھی مسلمانوں کے نااہل لیڈروں کی بے خبری کو توڑ نہ سکا۔ جیسا کہ اخبارات سے معلوم ہو چکا ہے، ۵ اپریل ۱۹۹۳ کو آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے تقریباً ڈیڑھ درجن ممتاز افراد دہلی میں جمع ہوئے۔ انھوں نے اتفاق رائے سے ایک میمورنڈم تیار کیا۔ اس میمورنڈم میں یہ مانگ کی گئی تھی کہ حکومت اجودھیا کے موجودہ عارضی مندر کو اور مورتیوں کو ہٹائے اور بابری مسجد کو اس کی سابقہ جگہ پر دوبارہ تعمیر کرے۔ اس کے بعد یہ وفد وزیر اعظم پی وی نرسمہا راؤ سے ملا اور مذکورہ میمورنڈم کو ان کے حوالے کیا۔

یہ بلاشبہ خلاف زمانہ عمل Anachronism کی بدترین مثال ہے۔ ۶ دسمبر کے واقعہ سے مسلمانوں کو سب سے بڑا سبق یہ لینا چاہیے تھا کہ اب انھیں ہندو عوام کی طرف جانا ہے۔ اب انھیں اپنی کوششوں کا رخ ہندو جنتا کی طرف کرنا ہے نہ کہ دہلی میں بیٹھے ہوئے حکمرانوں کی طرف۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ مسلمانوں کے نادان رہنما بدستور دہلی کا طواف کرنے میں مشغول ہیں۔

ایسی حالت میں مسلم پرسنل لا بورڈ کے وفد نے یہ ناقابل فہم نادانی کیوں کی کہ انھوں نے وزیر اعظم سے مل کر یہ مطالبہ کیا کہ مندر کو توڑ کر دوبارہ وہیں مسجد بناؤ۔ اس کی واحد وجہ ان کی بے شعوری ہے۔ وہ ابھی تک پچاس سال پہلے والے ہندستان میں سوچ رہے ہیں۔ انھیں معلوم نہیں کہ آج انڈیا میں عوام کی حکومت ہے نہ کہ کسی مطلق العنان بادشاہ کی حکومت۔

اب آخری وقت آگیا ہے کہ مسلمان اپنی اس روش کو بدلیں۔ وہ حکومت یا ایڈمنسٹریشن کی طرف دیکھنے کے بجائے ہندو عوام کی طرف دیکھیں۔ مسلم رہنما ہندو رہنما سے ملیں۔ مسلم عوام اور ہندو عوام میں زیادہ سے زیادہ تعلقات بڑھائے جائیں۔ ہر سطح پر ہندو اور مسلم میل جول کے مواقع پیدا کیے جائیں۔ تاکہ دونوں فرقوں میں ایک دوسرے کے خلاف غلط فہمیاں دور ہوں۔ تاکہ باہمی تناؤ کے حالات ختم ہوں اور دونوں فرقے خوش گوار تعلقات کے ساتھ مل کر رہنے لگیں۔

ڈائیلاگ کی ضرورت

ہمارے مسائل کا حل مسلم۔ حکمراں ملاقات نہیں ہے بلکہ مسلم۔ ہندو ملاقات ہے۔ آج شدید ترین ضرورت ہے کہ کل ہند سطح کا ایک ہندو۔ مسلم ڈائیلاگ منعقد کیا جائے۔ اس میں دونوں فرقوں کے سنجیدہ اور بااثر افراد جمع ہوں۔ اس کا مقصد خالص غیر سیاسی انداز میں امن کی تلاش ہو۔

اس ڈائیلاگ میں دونوں فرقوں کے لوگ کھلے دل کے ساتھ ایک دوسرے کے سامنے اپنی بات رکھیں۔ وہ کوشش کریں کہ باہمی نزاع کی صورت حال ختم ہو اور وہ مشترک بنیاد دریافت کی جائے جس کو اختیار کرکے دونوں فرقے اچھے پڑوسی کی طرح ایک ساتھ رہنے لگیں۔

اس قسم کا ڈائیلاگ اسلامی شریعت کے عین مطابق ہے۔ اسلام کی تاریخ میں حدیبیہ کا واقعہ اسی قسم کا ایک کامیاب ڈائیلاگ تھا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت (۶۲۲ء) کے بعد قدیم عرب میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات بہت خراب ہو گئے۔ کئی جنگیں اور جھڑپیں واقع ہوئیں۔ ایک دوسرے کے خلاف نفرت کی دیواریں کھڑی ہو گئیں۔

آخر کار پیغمبر اسلام ؐ نے ۶۲۸ء میں مکہ کے قریب حدیبیہ کے مقام پر تقریباً دو ہفتہ قیام کیا۔ یہاں آپ نے مکہ کے غیر مسلم سرداروں سے گفتگو کی۔ اور پھر ان کی اکثر شرطوں کو مانتے ہوئے

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ایک امن معاہدہ پر دستخط کیے جو کہ اسلام کی تاریخ میں معاہدۂ حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے۔

یہ ڈائیلاگ اگر فی الواقع سنجیدگی اور انصاف کے ساتھ کیا جائے تو وہ ہندستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا۔ انڈیا کی تاریخ آج جہاں رکی ہوئی ہے وہ ہندو۔مسلم تعلقات کا مسئلہ ہے۔ اگر یہ مسئلہ ایک بار حل ہو جائے تو اس کے بعد دونوں فرقوں کے درمیان نارمل تعلقات قائم ہو جائیں گے۔ اور ایسا ہونے کے بعد کوئی بھی دوسری چیز انڈیا کی ترقی کو روکنے والی نہیں۔

ڈائیلاگ کی کامیابی اس پر منحصر ہوگی کہ دونوں فریق ڈائیلاگ کو مناظرہ نہ بنائیں۔ وہ اپنے اپنے فرقے کے وکیل بن کر نہ بولیں بلکہ یہ سوچ کر بولیں کہ وسیع تر قومی مفاد کس چیز میں ہے، اور ملک کی مشترک بھلائی کا راستہ کیا ہے۔

دونوں فریق کو اپنے آپ سے یہ عہد کرنا ہوگا کہ وہ اشوز اور نان اشوز میں فرق کریں گے۔ وہ کسی معاملہ کو اپنے لیے وقار کا مسئلہ نہیں بنائیں گے۔ وہ کلیم اور کاونٹر کلیم کا طریقہ اختیار نہیں کریں گے۔ وہ جو بھی کہیں گے رزلٹ کو سامنے رکھ کر کہیں گے۔ ان کا انداز غیر جانب داری کا ہوگا نہ کہ طرفداری کا۔ وہ منوانے کے ساتھ ماننے کے لیے بھی تیار رہیں گے۔ وہ دوسرے سے لینا بھی چاہیں گے اور دوسرے کو دینا بھی۔

ڈائیلاگ کوئی حریفانہ میٹنگ نہیں، وہ برادرانہ میٹنگ ہے۔ اس کو ہار جیت کی نفسیات سے اوپر اٹھ کر انجام دیا جاتا ہے۔ اس کا مقصد معاملہ کو سلجھانا ہوتا ہے نہ کہ معاملہ کو الجھانا۔ ڈائیلاگ کے پیچھے مفاہمت کا جذبہ ہونا چاہیے نہ کہ مقابلہ کا جذبہ۔

ڈائیلاگ کا مطلب یہ ہے کہ اختلافی معاملہ کو ٹکراؤ کے بجائے بات چیت کے ذریعہ حل کیا جائے۔ اگر اس اسپرٹ کے ساتھ ڈائیلاگ شروع کیا جائے تو اس کی کامیابی یقینی ہے۔ ہمارے ملک کی ترقی کا دروازہ تقریباً آدھی صدی سے بند پڑا ہوا ہے۔ اور یہ ڈائیلاگ اس بند دروازہ کو یقیناً کھول سکتا ہے، بشرطیکہ اس کو سچی اسپرٹ کے ساتھ انجام دیا جائے۔

نئے عہد کے دروازہ پر

۱۹۴۶ میں جب انڈیا کے بٹوارہ کا فیصلہ ہوگیا تو مہاتما گاندھی نے طے کیا کہ وہ پاکستان جائیں گے۔ یہ سفر ایک مشن کے لیے تھا۔ اور یہ مشن ان کے اپنے الفاظ میں ہندو۔ مسلم دشمنی (Hindu-Muslim antagonism) کو ختم کرنا تھا۔ اس وقت وہ ۷۷ سال کے ہو چکے تھے۔ انھیں کلکتہ سے نواکھلی جانا تھا جو ان کے لیے بے حد مشکل راستہ تھا۔ مگر وہ مشکلات سے بے پروا ہو کر نواکھلی گئے۔ وہاں انھوں نے اپنی یادداشت میں ۵ دسمبر ۱۹۴۶ کو یہ الفاظ تحریر کیے:

My present mission is the most difficult and complicated one of my life... I am prepared for any eventuality. 'Do or Die' has to be put to the test here. 'Do' here means Hindus and Mussulmans should learn to live together in peace and amity. Otherwise, I should die in the attempt.
(Louis Fischer, *The Life of Mahatama Gandhi,* p.449)

میرا موجودہ مشن بے حد مشکل مشن ہے۔ وہ میری زندگی کا سب سے زیادہ پیچیدہ مشن ہے۔ میں کسی بھی صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ یہ میرے لیے 'کرو یا مرو' کا امتحان ہے۔ کرنے کا مطلب اس وقت یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان کو یہ سیکھنا ہوگا کہ وہ امن اور دوستی کے ساتھ باہم مل کر رہیں۔ ورنہ میں اس کی کوشش میں اپنی جان دے دوں گا (صفحہ ۴۴۹)

مہاتما گاندھی نے اس معاملہ کو اتنی زیادہ اہمیت کیوں دی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آزادی کے بعد یہی واحد چیز تھی جس پر ملک کے مستقبل کا انحصار تھا۔ ہندو اور مسلمان دونوں کو یا تو باہم مل کر ترقی کرنا تھا یا دونوں کو برباد ہو جانا تھا۔ بعد کو پیش آنے والے حالات نے مہاتما گاندھی کے اس نظریہ کی مکمل تصدیق کر دی ہے۔

انڈیا میں ہندو۔ مسلم مسئلہ اتنا زیادہ پیچیدہ کیوں بن گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انڈیا کی آبادی میں ہندو ۸۰ فی صد ہیں اور مسلمان ۱۵ فی صد۔ بقیہ فرقے صرف ایک دو فی صد ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان اس ملک میں نکسٹ ٹو مجارٹی (بعد از اکثریت) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور یہ عام سماجی اصول ہے کہ جہاں ایک گروہ مجارٹی میں ہو اور دوسرا گروہ نکسٹ ٹو مجارٹی کا درجہ

رکھتا ہو تو وہاں ایسے دو گروہوں کے درمیان حریفانہ کش مکش کی فضا قائم ہو جاتی ہے۔ دونوں کے درمیان مستقل طور پر فرضی یا حقیقی مسائل چھڑے رہتے ہیں۔

انڈیا میں ہندو اور مسلم مسئلہ کا اصل سبب یہی نزاکت ہے۔ ہندو یہاں مجارٹی میں ہیں اور مسلمان یہاں نکسٹ ٹو مجارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس طرح کی صورت حال میں یہ مسئلہ ہر سماج میں پایا جاتا ہے۔ اس کے نقصانات سے بچنے کی صورت صرف یہ ہے کہ اس کے بارہ میں لوگوں کو باشعور بنا دیا جائے۔ باشعور آدمی اپنی تعمیری سوچ کی بنا پر ان چیزوں سے اپنے آپ کو بچا لیتا ہے جن سے بے شعور آدمی اپنے آپ کو بچا نہیں پاتا۔

دو طرفہ معاملہ

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو اکثریتی فرقہ کے جن لوگوں نے اجودھیا کی بابری مسجد کے ڈھانچہ کو ڈھایا تھا، وہ بطور خود سمجھ رہے تھے کہ یہ معاملہ ان کے لیے یک طرفہ معاملہ ہے۔ مگر اس کے بعد ۱۲ مارچ ۱۹۹۲ کو اقلیتی فرقہ کے کچھ ناراض افراد نے جب بمبئی میں تیرہ طاقتور بموں (High-tech bombs) کا بھیانک دھماکہ کر کے ملک کی اقتصادی راجدھانی کو ہلا دیا تو معلوم ہوا کہ یہ معاملہ دو طرفہ ہے۔ پہلا فرقہ اگر دوسرے فرقہ کو نقصان پہنچا سکتا ہے تو دوسرا فرقہ بھی نقصان پہنچانے کے معاملہ میں پہلے فرقہ سے کم نہیں۔ چنانچہ بمبئی کے بم دھماکوں (Bomb blasts) کے بعد آر ایس ایس کے انگریزی ہفت روزہ آرگنائزر (۲۸ مارچ ۱۹۹۳) نے اپنے پہلے صفحہ پر اس کی جو رپورٹ چھاپی ہے، اس کی سرخی بامعنی طور پر یہ قائم کی گئی ہے ——— ہم کتنے محفوظ ہیں :

How safe are we?

اس حقیقت کا اعتراف دوسرے بہت سے مبصرین نے بھی کیا ہے۔ مثال کے طور پر بزرگ صحافی مسٹر کلدیپ نائر (ریڈئنس ۴-۱۰ اپریل ۱۹۹۲) نے بمبئی کے حادثہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ واقعہ ایک چیتاونی ہے کہ اگر آبادی میں ۱۲ فی صد کی تعداد رکھنے والا گروہ تباہ کیا جا سکتا ہے تو ۸۲ فی صد کی تعداد رکھنے والے ہندو بھی نقصان سے محفوظ نہیں رہ سکتے :

It is a warning that if they, the 12 per cent of the population, are sought to be destroyed, the 82 per cent of the Hindus will not stay unhurt.

اس دنیا میں جمہوری طاقت اور تشدد کی طاقت کے درمیان لازمی طور پر کوئی برابری نہیں ہے۔ اکثریت اور اقلیت کے درمیان عددی تناسب کے اعتبار سے یقیناً فرق ہوتا ہے۔ مگر تخریب کاری کی صلاحیت کے اعتبار سے دونوں میں کوئی حقیقی فرق نہیں۔ ایک گروہ جتنی تخریب کاری کر سکتا ہے، دوسرا گروہ بھی یقینی طور پر اتنی ہی یا اس سے زیادہ تخریب کاری کر سکتا ہے۔ اس لیے اب آخری وقت آگیا ہے کہ اس معاملہ پر از سر نو غور کیا جائے اور اس کا کوئی قابل عمل حل تلاش کیا جائے، اس سے پہلے کہ بربادی کی وہ حد آجائے جس کے بعد تلافی کی کوئی صورت باقی نہ رہے۔

اولاً ۶ دسمبر اور اس کے بعد ۱۲ مارچ کے واقعہ کا سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ اس ملک میں ہندو اور مسلمان کا مسئلہ دوگونہ نوعیت کا ایک مسئلہ ہے۔ نتیجہ کے اعتبار سے، وہ دونوں میں سے کسی کے لیے بھی یک طرفہ برتری کا مسئلہ نہیں۔

اس مسئلہ کی سنگینی یہ ہے کہ ہندو اپنی اکثریتی طاقت کی بنا پر مسلمان کے لیے ایک مستقل چیلنج ہے، مسلمان کے لیے ممکن نہیں کہ وہ ہندو سے اس کی یہ حیثیت چھین سکے۔ دوسری طرف مسلمان اپنی تمام تر عددی کمی کے باوجود، یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ وہ ہندو کے لیے ازعاج (nuisance) پیدا کر سکے۔ اور ہندو بھی کسی حال میں مسلمان سے اس کی یہ حیثیت چھیننے پر قادر نہیں۔

اس طرح ہندو اور مسلمان دونوں یکساں طور پر ایک دوسرے کے لیے سامان تشویش (concern) بن گئے ہیں۔ حقیقت پسندی کا تقاضا ہے کہ دونوں ہی ٹھنڈے دل کے ساتھ اس معاملہ پر غور کریں اور دو طرفہ مفاد (mutual interest) کی خاطر اس کا کوئی مستقل حل نکالیں۔ ورنہ اگر یہی حالات باقی رہے تو دونوں اپنے آپ کو تباہ کر لیں گے۔ اس کے بعد دونوں میں سے کوئی بھی ترقی کی منزل تک پہنچنے والا نہیں۔

ڈائیلاگ کی ضرورت

ان حالات میں میری تجویز ہے کہ یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے نمائندہ افراد کے درمیان ایک موثر قسم کا ڈائیلاگ منعقد کیا جائے۔ اس کا مقصد یہ ہو کہ ہندو۔مسلم جھگڑے کو اس

ملک سے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔ اس ڈائیلاگ میں دونوں فرقوں کے نمائندہ افراد جمع ہوں اور پوری سنجیدگی کے ساتھ باہم تبادلۂ خیال کریں۔ وہ ہمدردی کے جذبہ کے تحت ایک دوسرے کے مسائل کو سمجھیں۔ اس ڈائیلاگ میں وہ اپنے فرقہ کے محدود مفاد سے زیادہ دیش کے عمومی مفاد کو اپنے سامنے رکھیں۔ وہ کھلے دل کے ساتھ ایک دوسرے سے بھائی بھائی کی مانند گفتگو کریں۔

ڈائیلاگ کا طریقہ یہ ہونا چاہیے کہ دونوں فریق حقیقت پسندی اور ملک کے وسیع تر مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے گفتگو کا ایک ایجنڈا تیار کریں۔ اس میں مشترک نوعیت کی بالکل ضروری باتیں درج ہوں۔ یہ ایجنڈا منصفانہ بھی ہو اور فائنل بھی۔ اس ایجنڈے کی بنیاد پر دونوں کے درمیان سنجیدہ گفتگو ہو۔ اور پھر دو اور لو (Give and take) کے اصول پر تمام باہمی نزاعات کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔

تقریباً یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس ڈائیلاگ کے لیے حالات پوری طرح سازگار ہو چکے ہیں۔ حالات کی اسی سازگاری سے حوصلہ افزا تاثر لیتے ہوئے ہندستان ٹائمس (۹ اپریل ۱۹۹۲) نے اپنے اڈیٹوریل میں اس کی موثر وکالت کی ہے۔ اس اڈیٹوریل کا عنوان ہے ——— تحمل کی ضرورت :

Need for restraint

اس سلسلہ میں جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، وہ پوری طرح ڈائیلاگ کے موڈ میں نظر آتے ہیں۔ انھوں نے جزئی طور پر اس اسپرٹ کا مظاہرہ بھی کیا ہے جو ڈائیلاگ کو کامیابی تک پہنچانے کے لیے ضروری ہے۔ مثال کے طور پر، بمبئی میں ہندو صاحبان کی یہ مانگ تھی کہ ہندو محلوں میں واقع مساجد میں رات کے وقت لاوڈ اسپیکر پر اذان نہ دی جائے۔ یا جمعہ کے دن سڑک کے اوپر نماز ادا نہ کی جائے۔ یہ بات سالہا سال سے چل رہی تھی مگر کوئی فیصلہ نہیں ہو پاتا تھا۔ ۱۹۹۲ کے آغاز میں دونوں فرقوں کے لوگوں نے اس مسئلہ پر گفتگو کی اور باہمی رضامندی سے ایک متفقہ فیصلہ کر لیا گیا۔

اس معاملہ میں جہاں تک ہندو صاحبان کا تعلق ہے، اپنے مذہب کے زیر اثر ان کا

مزاج عام طور پر رواداری رہا ہے۔ تاہم بھارتیہ جنتا پارٹی کے عروج کے بعد ہندوؤں کے ایک طبقہ میں کسی قدر جارحانہ مزاج پیدا ہو گیا تھا جو کامیاب ڈائیلاگ کے راستہ میں رکاوٹ تھا۔ مگر ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے بعد سامنے آنے والے حالات نے انھیں اپنے رویہ پر نظر ثانی کے لیے مجبور کر دیا ہے۔ اب ان کے اندر بھی وہ حقیقت پسندی آگئی ہے جو ڈائیلاگ کی کامیابی کے لیے ہمیشہ ضروری ہوتی ہے۔ اپریل ۱۹۹۳ کے دوسرے ہفتہ میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی نیشنل ایگزیکیٹیو کی میٹنگ (کلکتہ) بھی اس معاملہ میں ایک حوصلہ افزا مثال ہے۔ کیوں کہ اس میٹنگ میں پارٹی کے اعلیٰ ذمہ داروں نے طے کیا ہے کہ وہ ٹکراؤ اور جارحیت کے طریقہ کو چھوڑ کر امن اور مفاہمت کے اصول پر اپنی تحریک چلائیں گے۔

آخری چارۂ کار

اس ہندو۔مسلم ڈائیلاگ کو اس عزم کے ساتھ منعقد ہونا چاہیے کہ اس کو بہر حال نتیجہ خیز بنانا ہے۔ اس کو کسی بھی حال میں "نشستند و گفتند و برخاستند" کا مصداق نہیں ہونے دینا ہے، اور اگر عزم صحیح ہو تو ایسا ہونا کچھ بھی مشکل نہیں۔

اس ڈائیلاگ کا پہلا مطلوب نشانہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے دونوں فرقے ایک مشترک اتفاق نامہ تک پہنچ جائیں۔ اگر ایسا ہو تو بلاشبہ یہ پوری ہندستانی قوم کے لیے نہایت خوش قسمتی کی بات ہوگی، اور ہم سب کو اس کے حق میں خدا سے اسی کی دعا کرنا چاہیے۔

لیکن بالفرض اگر اس سے اس قسم کا مثبت نتیجہ برآمد نہ ہو، اور ڈائیلاگ کی کارروائی بتائے کہ دو طرفہ بنیاد پر اس مسئلہ کا حل نکلنے والا نہیں ہے۔ تو ایسی صورت میں آخری چارہ کار کے طور پر میں اپنے مسلم بھائیوں سے کہوں گا کہ وہ اپنے پیغمبر کے اسوہ پر عمل کرتے ہوئے اس کے لیے تیار ہو جائیں کہ وہ یک طرفہ بنیاد پر اس مسئلہ کو ختم کر دیں گے تاکہ ملک میں امن وامان قائم ہو، اور اس خطہ ارض میں بسنے والے تمام لوگ معتدل حالات میں زندگی گزارنے کا موقع پا سکیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے تیرہ سالہ دعوتی عمل کے بعد مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ مگر اس ہجرت کے بعد بھی ایسا نہ ہو سکا کہ دونوں فریق کے درمیان جھگڑا ختم ہو جائے اور اہل عرب

کو پُرامن زندگی کے مواقع حاصل ہو جائیں۔ حتیٰ کہ معاملات اس نوبت کو پہنچ گئے کہ بالکل ظاہر ہو گیا کہ یہ نزاع دوطرفہ بنیاد پر ختم ہونے والی نہیں ہے۔ اس وقت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے حریف طبقہ کی تمام شرطوں کو مانتے ہوئے یک طرفہ بنیاد پر اس نزاع کا خاتمہ کر دیا۔ ختم نزاع کا یہی وہ عمل ہے جس کو اسلام کی تاریخ میں صلح حدیبیہ کہا جاتا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے وقت اعلان کیا تھا کہ قریش (فریق مخالف) آج مجھ سے جس چیز کے لیے بھی کہیں گے جس میں کہ قرابت داری پائی جاتی ہو تو وہ چیز ضرور میں انھیں دوں گا (لا تدعونی قریش الیوم الی خطۃ یسألوننی فیھا صلۃ الرحم الا اعطیتھم ایاھا) سیرۃ ابن ہشام ۲۵۸/۳

میرا مشورہ ہوگا کہ ایسی صورت میں مسلمان اس اسوۂ رسول کی اسپرٹ پر عمل کرتے ہوئے برادران وطن سے یہ کہہ دیں کہ ملک میں شانتی لانے کی خاطر ہم ہر اس شرط کو ماننے کے لیے تیار ہیں جس سے انڈیا کا وقار اور اس کی اعلیٰ روایتیں باقی رہتی ہوں، جو دیش کی مجموعی ترقی کا راستہ کھولنے والا ہو۔

مسلمان بھائیوں کے اطمینان کے لیے مزید میں کہوں گا کہ اس طرح کا تصفیہ ہمیشہ وقتی ہوتا ہے، وہ کبھی بھی مستقل یا ابدی نہیں ہوتا۔ مسلمان اگر اس معاملہ میں یک طرفہ ایڈجسٹمنٹ پر راضی ہو جائیں تو وقتی طور پر بظاہر یہ ان کے لیے کھونے کا واقعہ دکھائی دے گا۔ مگر عین ممکن ہے کہ مستقبل کے لحاظ سے وہ ان کے لیے نئی، زیادہ بڑی کامیابی کا دروازہ کھولنے کے ہم معنی بن جائے۔

دو مثالیں

اس کی عملی مثالیں قریب کی تاریخ میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد امریکہ (اور اس کے حلیفوں) نے جرمنی کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اسی طرح امریکہ کی فوجیں جاپان کی سرزمین پر اتر گئیں۔ اور جنرل میکارتھر نے جاپانی قوم کے لیے ایک نیا دستور تیار کیا جس میں یہ لکھا ہوا تھا کہ جاپان آئندہ کبھی بھی اور کسی اعتبار سے بھی فوجی طاقت بننے کی کوشش نہیں کرے گا۔ (10/87)

جرمنی اور جاپان کے مدبروں نے محسوس کیا کہ اب ان کے لیے دو میں سے ایک کا انتخاب ہے۔ یا تو وہ امریکہ اور اس کے حلیفوں سے جنگ جاری رکھیں اور اس کے نتیجہ میں بدستور تباہ ہوتے رہیں۔ یا یک طرفہ طور پر وہ فریق ثانی کی شرطوں کو مان لیں۔ انھوں نے پہلے انتخاب کو چھوڑ کر دوسرے انتخاب کو لے لیا۔

یہ بظاہر یک طرفہ ایڈجسٹمنٹ تھا۔ مگر اس کا نتیجہ اتنا بڑا نکلا کہ چالیس سال کے اندر تاریخ بدل گئی۔ جرمنی ہمیشہ سے زیادہ طاقت ور ہوکر دوبارہ متحد ہوگیا۔ اسی طرح جاپان بھی پہلے سے زیادہ ترقی یافتہ ہوکر اس حالت میں آگیا کہ وہ خود امریکہ کو دفاعی پوزیشن میں ڈال دے۔

یک طرفہ ایڈجسٹمنٹ کوئی ہار کا معاملہ نہیں۔ قرآن (الفتح ۱) کے مطابق، وہ عین جیت کا معاملہ ہے۔ یک طرفہ ایڈجسٹمنٹ اپنے پہلے روز ہی فریق ثانی کے اوپر اخلاقی فتح ہے۔ اور اگر مزید دانش مندی کا ثبوت دیا جائے تو بعد کے مرحلہ میں مادی فتح بھی۔

یہاں ایک اضافہ بہت سبق آموز اور بہت بامعنی ہے۔ آر ایس ایس کے ہفتہ وار انگریزی میگزین آرگنائزر (دہلی) نے اپنے شمارہ ۲۵ اپریل ۱۹۹۲ میں ایک مفصل مضمون شائع کیا ہے۔ یہ راقم الحروف کی تجویز ہندو مسلم ڈائیلاگ کے بارہ میں ہے۔ تجویز کے تعارف اور تبصرہ کے بعد آخر میں اس نے کسی قدر طنزیہ انداز میں لکھا ہے:

Thus a Muslim leader, however well-meaning and well-intentioned in quest of peace, must search for a precedent in Hadis for talks with the non-Muslims. But then everybody knows the fate of Hudaibia agreements which proved only a convenient truce to bale them out of a difficult situation, for a total conquest of Mecca ultimately (p.14).

انڈیا آج ایک نئے عہد کے دروازہ پر کھڑا ہے۔ آج اہل ملک کو، خاص طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں کو، ایک نیا تاریخی فیصلہ کرنا ہے۔ اگر دونوں یہ تاریخی فیصلہ لینے میں کامیاب رہے تو دیش کامیاب ہوگا۔ اور اگر دونوں یہ تاریخی فیصلہ لینے میں ناکام ہوگئے تو اس کے بعد دیش کے لیے تباہی اور بربادی کے سوا کوئی اور مستقبل نہیں۔

قیادت کا خلا

قومی پریس میں آج کل مسلسل ایسے مضامین اور ایسی رپورٹیں چھپ رہی ہیں جن میں ملک کے مستقبل کے بارہ میں سخت تشویش کا اظہار ہوتا ہے۔ ہندستان ٹائمس (۱۲ اپریل ۱۹۹۳) میں مسٹر ایس ایس گل کا ایک آرٹیکل چھپا ہے، اس کا عنوان بمبئی کے بعد (Beyond Bombay) ہے۔ مضمون نگار نے ملک کی موجودہ ابتری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

> In modern times India has never before faced such a threat to its integrity and its very existence as a nation state. And we have never been so ill-equipped to face this challenge. The maladies are known, the remedies are known, but the physician is missing.

عہد حاضر میں انڈیا کو اپنے استحکام اور قومی ریاست کی حیثیت سے اپنے وجود کے لیے کبھی ایسا خطرہ پیش نہیں آیا تھا۔ اور ہم اس چیلنج کا سامنے کرنے کے لیے کبھی اتنے بے مایہ نہ تھے۔ مصیبتیں معلوم ہیں، ان کا علاج بھی معلوم ہے، مگر ڈاکٹر موجود نہیں (صفحہ ۱۲)

یہ قیادت کے خلا کا مسئلہ ہے، مسلمان اس خلا کو پُر کر سکتے ہیں۔ مگر اس طرح نہیں کہ وہ کسی شاعرانہ کلام کے حوالے سے اپنے کو محتسب کائنات ثابت کریں۔ یا یہ اعلان کریں کہ ہم خیر الامم ہیں، اس لیے ہمیں ساری دنیا پر حکمرانی کا حق حاصل ہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ قیادت صبر کی قیمت پر ملتی ہے (وجعلنا منهم ائمة يهدون بامرنا لما صبروا) اس وقت جو صبر درکار وہ یہ کہ مسلمان ماضی کی تلخیوں کو بھلائیں۔ برادران وطن کی زیادتیوں پر مشتعل ہونا ترک کریں۔ وہ مانگنے کے بجائے دینے والے بنیں۔ وہ ملّی وقار کو اشو بنانے کے بجائے انسانی خدمت کو اشو بنائیں۔ وہ تمام نزاعات کو یک طرفہ بنیاد پر ختم کرنے کے لیے راضی ہو جائیں۔ وہ دوسری قوموں کے حریف بننے کے بجائے ان کے خیر خواہ بن جائیں۔ وہ اپنی تصویر یہ بنائیں کہ وہ حقوق کے لیے اٹھنے والے لوگ نہیں ہیں بلکہ ذمہ داریوں کو پورا کرنے والے لوگ ہیں۔

یہی صبر قیادت کی لازمی شرط ہے۔ مسلمان اگر اس شرط کو پورا کر دیں تو قیادت ان کی طرف اس طرح دوڑ کر آئے گی جس طرح ڈھلوان کی طرف سیلاب کا پانی۔

اصل مسئلہ

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی سیاست کو، ایک لفظ میں، احتجاج یا پروٹسٹ کی سیاست کہا جاسکتا ہے۔ مسلمانوں کا ہر چھوٹا بڑا لیڈر ہندو قوم یا "ہندو حکومت" کو نشانہ بنا کر اس کے خلاف پرجوش تقریر کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس طرزِ عمل نے مسلمانوں کو ایک نئے قسم کا پروٹسٹنٹ فرقہ بنا کر رکھ دیا ہے۔

اگر ان حضرات سے کہیے کہ آپ اس احتجاجی سیاست میں کیوں اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں تو وہ جواب دیں گے کہ یہ ہمارا دستوری حق ہے۔ اس ملک میں باقاعدہ دستور کی حکومت ہے۔ اگر ہمارے دستوری حقوق ہم کو نہ دیئے جائیں تو خود دستور ہی ہم کو یہ حق دیتا ہے کہ ہم پُرامن ذرائع کو کام میں لے کر اس کے خلاف آواز اٹھائیں۔

یہ بات گرامر کے اعتبار سے صحیح مگر حقیقت کے اعتبار سے غلط ہے۔ اس دنیا میں ہندستان کے تحریری دستور کے اوپر ایک اور غیر تحریری دستور ہے۔ یہ غیر تحریری دستور پہلے دستور سے زیادہ اہم ہے۔ یہ غیر تحریری دستور یہ ہے کہ ——— جب دستور اور حقیقتِ واقعہ کے درمیان ٹکراؤ ہو تو حقیقتِ واقعہ باقی رہے اور دستور کے الفاظ ہواؤں میں گم ہو کر رہ جائیں۔

یہاں میں اس کی ایک واضح مثال دیتا ہوں۔ ہندستان کا دستور جو ملکی قیادت کے اتفاق رائے کے ساتھ ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ کو نافذ کیا گیا تھا۔ اس کی دفعہ ۳۴۳ میں یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے کہ پندرہ سال کی مدت تک انگریزی زبان یونین کی سرکاری زبان رہے گی۔ اس کے بعد اس کی سرکاری زبان ہندی دیوناگری رسم الخط میں ہو جائے گی:

For a period of fifteen years the English language shall continue to be the official language of the Union. Thereafter the official language shall be Hindi in Devanagri script.

اس دستوری دفعہ کے مطابق ہندی زبان کو پندرہ سال کے اندر یونین کی سرکاری زبان بننا تھا۔ مگر دو سنگین حقیقتیں اس کی راہ میں رکاوٹ بن گئیں۔ ایک یہ کہ ہندی زبان ابھی اتنی زیادہ

ترقی یافتہ نہیں کہ وہ کامیاب طور پر دور جدید کی ایک ریاست کی سرکاری زبان بن سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندی زبان کے تمام بڑے بڑے علم بردار اپنے بچوں کو ہندی اسکول کے بجائے انگلش اسکول میں پڑھانا پسند کرتے ہیں۔

دوسری بڑی وجہ وہ تھی جو جنوبی ہند کی طرف سے پیدا ہوئی۔ جنوبی ہند جو ہندستان کا نصف حصہ ہے، اس کو خطرہ محسوس ہوا کہ اگر ہندی کو انڈین یونین کی سرکاری زبان بنایا گیا تو تمام مرکزی شعبوں میں شمالی ہند کا غلبہ ہو جائے گا اور وہ پیچھے ہو کر رہ جائیں گے۔ چنانچہ جنوبی ہند میں اس کے خلاف شدید رد عمل ہوا۔ یہاں تک کہ نئی دہلی کے پالیسی ساز لیڈروں کو دستور کی اس دفعہ کو تاریخ کے سرد خانہ میں ڈال دینا پڑا۔

ہندستانی مسلمانوں کے مسئلہ کو دستوری حقوق نہ ملنے کا مسئلہ کہنا اس کی سنگینی کو گھٹانا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ خود مسلمانوں کے اپنے پچھڑے پن کا مسئلہ ہے۔ مسلمان اس ملک میں دراصل اپنے پچھڑے پن کی قیمت ادا کر رہے ہیں اور اس کو غلط طور پر وہ دوسروں کے ظلم اور تعصب کے خانہ میں ڈال دینا چاہتے ہیں۔

جو صورت حال حقیقت کے زور پر پیدا ہوئی ہو، اس کو آپ قانون کے زور پر ختم نہیں کر سکتے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے تمام مسائل کی جڑ ان کی بے شعوری ہے۔ اسی بے شعوری کی وجہ سے وہ اب تک تعلیم کی اہمیت کو سمجھ نہ سکے۔ اسی بنا پر وہ اس راز کو نہیں جانتے کہ مواقع کو استعمال کرنے کے لیے مسائل کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ تقریریں کرنے اور بڑے بڑے الفاظ بولنے کو کام سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ محض لفظ بازی ہے نہ کہ کوئی واقعی کام۔

اسی شعوری پچھڑے پن کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمان ہر چیز میں پیچھے ہو گئے ہیں۔ شعور آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ حالات کو زیادہ گہرائی کے ساتھ سمجھے۔ وہ اپنے لیے صحیح منصوبہ بنائے۔ وہ لوگوں کی مخالفانہ کارروائیوں کی کاٹ کر سکے۔ وہ اپنے امکانات کو سمجھے اور ہوش مندی کے ساتھ ان کو استعمال کرے۔ اس دنیا میں آدمی کو دوسروں کے ظلم اور تعصب کے باوجود اپنے لیے راہ نکالنی پڑتی ہے، مسلمان اس صلاحیت کو کھو چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حالات کے خلاف صرف چیخ پکار کر رہے ہیں، وہ ابھی تک اپنے لیے کوئی راستہ دریافت کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

نیا دور

ٹائمس آف انڈیا (۲ جنوری ۱۹۹۲) میں صفحہ ۱۰ پر نقطۂ نظر (Viewpoint) کے کالم کے تحت مسٹر چندرابی کھنڈوری کی یادداشت چھپی ہے۔ اس کا عنوان ہے : (The Muslim Role)
مسٹر کھنڈوری لکھتے ہیں کہ وہ لوگ جنھوں نے انڈیا کی آزادی کے وقت مولانا ابوالکلام آزاد کو دیکھا تھا، انھیں یاد ہوگا کہ اس وقت وہ بٹوارہ کے المیہ پر بری طرح رو رہے تھے :

Those who watched Maulana Azad on the eve of independence remember him weeping bitterly at the tragedy of partition. (Chandra B. Khanduri)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کو ملک کے بٹوارہ کا کتنا زیادہ غم تھا۔ وہ یہ یقین کرنے میں حق بجانب تھے کہ بٹوارہ ملک کے لیے زہر ہے۔ اس کے نتیجہ میں آزادی ایک نئے قسم کی بربادی کے ہم معنی بن جائے گی۔

اس معاملہ میں واقعہ کا ایک پہلو یہ تھا کہ ۱۹۴۷ سے پہلے کے ہندستان میں مولانا ابوالکلام آزاد کی بات نہیں چلی۔ مسلمانوں کے درمیان مسٹر محمد علی جناح نے سب سے بڑے قائد کی حیثیت حاصل کرلی۔ اس کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ مولانا آزاد کے نقشہ کے خلاف انڈیا دو حصوں میں بٹ گیا۔

مگر اس واقعہ کا ایک اور پہلو بھی تھا۔ وہ یہ کہ ۱۹۴۷ کے بعد ملک میں جو حالات پیدا ہوئے اس نے اچانک مولانا ابوالکلام آزاد کو مسلمانوں کے درمیان رہنما نمبر ایک کی حیثیت دے دی۔ ملک کے تمام مسلمان اب ان کی طرف دیکھنے لگے کہ نئے ہندستان میں وہ انھیں کوئی راہ دکھائیں۔ مگر ۱۹۴۷ سے پہلے کے دور میں فعال قائد بننے والے مولانا آزاد ۱۹۴۷ کے بعد کے دور میں ایک غیر فعال قائد بن کر رہ گئے۔ انھوں نے مسلمانانِ ہند کو نئے حالات کے اعتبار سے کوئی واضح رہنمائی نہ دی۔ حالانکہ ملک کی تقسیم کے بعد مولانا آزاد گیارہ سال تک زندہ رہے۔ اس طرح انھیں کام کرنے کا طویل وقفہ حاصل ہوا۔

اسی سے ملتا جلتا معاملہ مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کا ہے۔ مولانا مدنی آزادی کے بعد دس سال تک زندہ رہے۔ مولانا سیوہاروی کو آزادی کے بعد پندرہ سال تک جینے

کا موقع ملا۔ مسلمانانِ ہند کے تحفظ کے سلسلہ میں ان لوگوں کی خدمات بلاشبہہ قابل قدر ہیں مگر ان حضرات نے بھی نئے حالات کے اعتبار سے مسلمانوں کو کوئی واضح اور مثبت رہنمائی نہ دی۔ یہاں تک کہ وہ اس دنیا سے چلے گئے۔

مثال کے طور پر، ۱۹۴۷ سے پہلے مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، سب کے سب یہ کہتے تھے کہ قوم وطن سے بنتی ہے۔ اس لیے اس ملک کے ہندو اور مسلمان دونوں ایک قوم ہیں۔ لیکن حیرت انگیز بات ہے کہ ۱۹۴۷ کے بعد اس معاملہ میں یہ سب حضرات بالکل خاموش ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے کبھی یہ مہم نہیں چلائی کہ مسلمانوں میں علٰحدگی پسندی کا ذہن ختم کریں اور ان کے اندر ہندستانی قومیت کا ذہن بنائیں۔ جب کہ حالات کے اعتبار سے سب سے زیادہ ضروری کام یہی تھا۔ اگر وہ ایسا کرتے تو ہندستانی مسلمانوں کو سوچ کا ایک رخ مل جاتا، اور ان کے لیے ممکن ہو جاتا کہ وہ حالات سے موافقت کر کے اس ملک میں اپنی زندگی کی تعمیر کر سکیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کے ہم خیال دوسرے رہنماؤں کی اس غیر فعالیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۴۷ کے بعد کے انڈیا میں بھی مسلمانوں کے اندر وہی سوچ جاری رہی جو ۱۹۴۷ سے پہلے کے انڈیا میں انھیں مسٹر جناح نے دی تھی۔ ۱۹۴۷ کے بعد اٹھنے والے نئے لیڈروں میں بھی کوئی اس صلاحیت کا نہ تھا کہ وہ مسٹر جناح اور ان کے ہم نوا ڈاکٹر اقبال کے فکری غلبہ کو توڑ سکے۔ چنانچہ بعد کا دور عملی طور پر پچھلی قیادت کی توسیع بن گیا جو آج تک جاری ہے۔

مسٹر جناح اور ان کے ساتھیوں نے مسلمانوں کو دو قومی نظریہ سکھایا تھا۔ مسلمانوں کا پورا ذہن اس فکر کے تحت بنا تھا کہ ہندو الگ قوم ہیں اور مسلمان الگ قوم۔ اس فکر نے مسلمانوں کو جو طریقہ دیا وہ دوری اور ٹکراؤ کا طریقہ تھا۔ وہ احتجاج اور مطالبات پر مبنی تھا۔ وہ حقوق طلبی کی زبان کے سوا کوئی اور زبان نہیں جانتا تھا۔ وہ یہ تھا کہ مسائل کو نمایاں کیا جائے اور مواقع کو غیر مذکور چھوڑ دیا جائے۔

چنانچہ ۱۹۴۷ کے بعد کا پورا دور اسی سابقہ فکری راستہ پر چل پڑا۔ مسٹر جناح نے چودہ پوائنٹ پر مشتمل اپنے مطالبات پیش کیے تھے۔ نئی لیڈرشپ نے بیس پوائنٹ پر مشتمل اپنے مطالبات پیش کر دیے۔ مسٹر جناح نے علٰحدہ قومیت کی بات کی تھی، نئی قیادت نے علٰحدہ تشخص کی بات شروع کر دی، مسٹر جناح نے مسلمانوں کی تمام مصیبتوں کا ذمہ دار ہندو کو بتایا تھا۔ نئے لیڈروں نے اکثریتی فرقہ

کی حکومت کو مسلمانوں کی تمام مصیبتوں کا ذمہ دار بتانے پر اپنی ساری طاقت خرچ کر دی۔ مسٹر جناح نے مسلمانوں میں زرد صحافت کو رواج دیا تھا۔ وہ مزید شدت کے ساتھ بعد کے دور میں بھی جاری رہی۔

مسٹر جناح کی غلط رہ نمائی کے نتیجہ میں مسلمانوں نے انتہائی غلط طور پر ہندوؤں کو غیر قوم سمجھ لیا تھا، ۱۹۴۷ کے بعد رہ نمائی کے خلا کی بنا پر مسلمان دوبارہ ہندوؤں کو غیر قوم ہی سمجھتے رہے۔ مسٹر جناح کی غلط رہ نمائی نے مسلمانوں کا یہ ذہن بنایا تھا کہ مشترک ہندستان ان کا وطن نہیں بن سکتا، یہی ذہن بعد کو بھی مسلمانوں میں کم و بیش باقی رہا۔ وہ اب بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر یہی سمجھتے رہے کہ ہندستان ان کا اصلی وطن نہیں ہے۔ اس طرح مسلمان ذہنی طور پر خود اپنے وطن میں بے وطن بن کر رہ گئے۔

میرے نزدیک، موجودہ مسلم قیادت، بے ریش اور باریش دونوں، تقریباً بلا استثناء مسٹر جناح کے قیادتی انداز کی توسیع ہے، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ ہر ایک بنیادی طور پر وہی بات کہہ رہا ہے جو مسٹر جناح نے اور ان کے فکری ہم نوا ڈاکٹر اقبال نے کہی تھی۔ دونوں کے درمیان الفاظ کا فرق ہو سکتا ہے، مگر ان میں حقیقت کا کوئی فرق نہیں۔

اور ہندو بھی

گہرائی کے ساتھ دیکھا جائے تو ہندو بھی عملاً مسٹر جناح کے راستہ پر چل پڑے۔ ۱۹۴۷ کے بعد وہ بھی مسٹر جناح کے فکری پیرو بن گئے۔ انھوں نے بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر مسٹر جناح کے زیر تاثر یہ سمجھ لیا کہ انڈیا میں دو قومیں بستی ہیں۔ ایک ہندو، اور دوسرے مسلمان۔ یہی وہ چیز ہے جو ہندو مسلم تعلقات کے بگاڑ کا اصل سبب ہے۔

انڈیا میں مسلمان ایک ہزار سال سے بھی زیادہ مدت سے آباد ہیں۔ ان کی تعداد پہلے تھوڑی تھی۔ اب بڑھتے بڑھتے تقریباً پندرہ کرور ہو چکی ہے۔ یہ مسلمان کون لوگ ہیں۔ یہ زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو پہلے ہندو تھے۔ بعد کو انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ گویا کہ یہ مسلمان بھی نسلی اعتبار سے اسی طرح انڈین ہیں جس طرح دوسرے ہندو انڈین ہیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے بجا طور پر لکھا ہے کہ پچھلے ہزار سال کے دوران ہندوؤں میں کبھی یہ خیال پیدا نہیں ہوا کہ صرف ہندو لوگ انڈین ہیں، مسلمان انڈین نہیں ہیں۔ ہندو عقیدہ یہ ہے کہ

سچائی ہر مذہب میں پائی جاتی ہے۔ اس لیے جب کوئی ہندو اسلام قبول کرلیتا تو وہ اپنے عقیدہ کے مطابق، یہ سمجھتے تھے کہ وہ سچائی کے ایک حلقہ سے نکل کر سچائی کے دوسرے حلقہ میں چلا گیا ہے۔ اور چونکہ نسلی اعتبار سے وہ ان کی اپنی نسل ہی سے تعلق رکھتا تھا اس لیے وہ ان کے انڈین ہونے پر بھی کوئی شک نہیں کرتے تھے (ڈسکوری آف انڈیا ۲۸۰–۸۱)

مغل دور میں بیشتر راجاؤں نے مغلوں کا ساتھ دیا۔ شیواجی نے اورنگ زیب کے خلاف بغاوت کی۔ مگر اس کا تعلق کچھ بھی اس بات سے نہیں تھا کہ اورنگ زیب مسلمان ہے۔ شیواجی کو اورنگ زیب کی صرف بعض پالیسیوں سے اختلاف تھا۔ چنانچہ جے پور کے راجہ کے نام ایک خط میں شیواجی نے لکھا تھا کہ دہلی کے تخت پر اگر اورنگ زیب کے بجائے دارا شکوہ ہوتا تو وہ ہرگز اس کے خلاف لڑائی نہ لڑتے۔ وہ اس کی ماتحتی قبول کر لیتے۔

۱۹۴۰ سے انڈیا کی تاریخ میں ایک نیا دور آتا ہے جب کہ مسٹر محمد علی جناح نے دو قومی نظریہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ قومیت کا تعلق وطن سے نہیں ہے بلکہ مذہب سے ہے۔ اور چونکہ مسلمانوں کا اور ہندوؤں کا مذہب الگ الگ ہے اس لیے دونوں الگ الگ قوم ہیں۔ انھوں نے اپنے اسی دو قومی نظریہ کی بنیاد پر برصغیر ہند میں دو الگ الگ وطن کا مطالبہ کیا۔

مسٹر محمد علی جناح کے اس فکر کے ردعمل میں پہلی بار ہندوؤں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ مسلمان الگ قوم ہیں اور ہندو الگ قوم ہیں۔ انتہا پسند ہندو اب مسلمانوں کی وطنی وفاداری پر شک کرنے لگے۔ انھوں نے کہا کہ مسلمان غیر ملکی ہیں۔ یہ خیال پختہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ پاکستان جیسے مسلم ملک کے مقابلہ میں بریگیڈیر عثمان اور حوالدار عبدالحمید کی غیر معمولی قربانیاں بھی اس فکر کا خاتمہ نہ کرسکیں۔ مسٹر جناح کے ردعمل میں پیدا ہونے والا فکر کسی جوابی فکر سے ٹوٹ سکتا تھا۔ چونکہ ۱۹۴۷ کے بعد کوئی ایسی طاقتور فکری تحریک برپا نہیں ہوئی اس لیے یہ فکر بھی لوگوں کے ذہنوں سے محو نہ ہو سکا۔

انڈیا کے لوگ ہمیشہ سے یہ مانتے آرہے تھے کہ قوم وطن سے بنتی ہے۔ جو لوگ ایک وطن میں ہوں وہ سب ایک قوم ہیں۔ مگر مسٹر جناح کے دو قومی نظریہ سے متاثر ہو کر یہاں کے ہندو یہ سمجھنے لگے کہ چونکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا مذہب الگ الگ ہے، اس لیے دونوں الگ الگ قوم ہیں۔

انڈیا کا ہندو مسلم مسئلہ پچاس فی صد اس لیے ہے کہ ۱۹۴۷ کے انقلاب کے بعد بھی یہاں کے

مسلمان مسٹر جناح کے علٰحدگی پسندی کے نظریے سے متاثر رہے۔ اور بقیہ پچاس فی صد اس لیے ہے کہ یہاں کے ہندو بھی کم از کم عملی طور پر یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ قوم وطن سے نہیں بنتی بلکہ مذہب سے بنتی ہے۔ اس لیے ہندو الگ قوم ہیں اور مسلمان الگ قوم۔ وہ جناح کو رد کرتے ہیں، مگر وہ جناح کے نظریہ کو پوری طرح قبول کیے ہوئے ہیں۔

دور انقلاب

کسی فکری انقلاب کے لیے حالات کی موافقت ضروری ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے بعد وہ حالات مکمل طور پر پیدا ہو گئے ہیں جب کہ مسٹر جناح کے اس فکری تسلسل کو آخری طور پر توڑ دیا جائے۔ بابری مسجد کے نام پر مسلمانوں کے درمیان جو تحریک اٹھی، وہ مکمل طور پر جناحی پیٹرن پر اٹھنے والی تحریک تھی۔ بابری مسجد کا ڈھایا جانا بلاشبہ ایک ٹریجڈی تھی۔ لیکن اگر بابری مسجد کا انہدام مسٹر جناح کے فکری تسلسل کا انہدام بن جائے تو میں سمجھوں گا کہ اس ٹریجڈی میں بھی ایک تابناک پہلو موجود ہے۔ یہ ناموافق حادثہ اپنے اندر ایک موافق پہلو لیے ہوئے ہے۔

ٹائمس آف انڈیا (۲ جنوری ۱۹۹۳) میں مسٹر چندر رابی کھنڈوری کا جو مضمون شائع ہوا ہے اس میں انھوں نے ایک مسلم خاتون ناہید اشرف کے ایک مطبوعہ مضمون کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ہم نے اس مضمون کو پڑھا۔ اس نے مجھ کو، میرے گھر والوں کو اور میرے دوستوں کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔ جو چیز ہمارے دلوں میں گھس گئی، وہ مسلم خاتون کے یہ الفاظ تھے کہ اب لیڈروں کو ایک بات اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ کوئی بھی ہندستانی مسلمان اس ملک کو چھوڑنے والا نہیں ہے۔ بس ایک بار کافی تھا، مسلمان مہاتما گاندھی کی طرح مر جائیں گے مگر وہ یہاں سے نہیں جائیں گے۔ خواہ ہمارا کھنڈر ہی یہاں ہماری یاد کے لیے باقی رہ جائے :

Reading 'Once Was Enough' by Naheed Ashraf moved me, my children and my friends. What penetrated our hearts were the words: 'Now let the leaders keep one thing in mind that no Indian Muslim is going to leave this country. Once was enough...they will rather die like Gandhi...let the ruins keep reminding us...' Naheed shows the greatness of our Muslim community.(p.10)

جاپان میں دوسری عالمی جنگ کے بعد عمل معکوس (reverse course) کے نام سے ایک

تحریک اٹھی۔ اس کا مقصد جاپانیوں کے قبل از جنگ، ذہن کو بدل کر ان میں نیا تعمیری ذہن پیدا کرنا تھا۔
آج ہمیں بھی اسی قسم کے ایک عمل معکوس کی ضرورت ہے۔ اور خدا کا شکر ہے کہ یہ عمل معکوس اب انڈیا کے ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں کے اندر شروع ہو چکا ہے۔

اب ہمیں ایک طرف ہندستانی مسلمانوں کو بتانا ہے کہ تم اور ہندو دو قوم نہیں ہو بلکہ ایک قوم ہو۔ ہمیں ان کے اندر نفرت کے بجائے محبت کی ہوائیں چلانا ہے۔ ہمیں مسلمانوں کو بتانا ہے کہ تم کو ٹکراؤ کے بجائے ایڈجسٹمنٹ کی پالیسی کو اختیار کرنا چاہیے۔ ہمیں ان کے اندر یہ شعور ابھارنا ہے کہ نئے انڈیا میں ان کا بھی اتنا ہی حصہ ہے جتنا کسی دوسرے کا۔ البتہ یہ حصہ ان کو میرٹ کی بنیاد پر ملے گا نہ کہ رزرویشن اور مطالبہ کی بنیاد پر۔ ہمیں مسلمانوں میں نئی تعمیری صحافت کو وجود میں لانا ہے، ایسی صحافت جو منصفانہ واقعہ نگاری پر مبنی ہو، جو مسائل سے زیادہ مواقع کو نمایاں کرنے میں دلچسپی رکھتی ہو۔

اسی قسم کی تحریک ہندوؤں کے درمیان چلنا بھی ضروری ہے۔ ہندو بھائیوں سے یہ کہنا ہے کہ وہ جناحی طرز فکر کو چھوڑ دیں، اور اپنے ماضی والے فکر کو دوبارہ اختیار کر لیں۔ وہ جناح کے مذہب کے بجائے خود اپنی روایات والے اس مذہب پر آجائیں جس کا اہم ترین پہلو تعدد میں وحدت کو دیکھنا ہے۔ مسٹر چندرا بی کھنڈوری نے اپنا مذکورہ مضمون ان الفاظ پر ختم کیا ہے کہ ضرورت ہے کہ ہم اپنے مشترک کلچر کے مطابق اپنی روایتی عقلیت اور رواداری کی طرف لوٹ آئیں :

In consonance with our composite culture, we need, therefore, to return to our traditional rationality and tolerance.

یہ الفاظ کسی ایک شخص کے الفاظ نہیں ہیں۔ وہ کروروں ہندوؤں کے دل کی ترجمانی ہیں۔ اس کا ایک اظہار وہ ہے جو ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے حادثہ کے بعد بار بار پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا میں ہمارے سامنے آتا رہا ہے۔

یہی بھارت کا ضمیر ہے۔ بھارت کا ضمیر جو ۶ دسمبر سے پہلے عارضی طور پر سو گیا تھا، اب وہ پوری طاقت کے ساتھ جاگ اٹھا ہے۔ اور ضمیر جب جاگ اٹھے تو وہ اپنی تکمیل سے پہلے دوبارہ کبھی نہیں سوتا۔ تاریخ کا تجربہ ہے کہ ضمیر کی آواز ہر دوسری آواز پر غالب آتی ہے۔ اور انڈیا کا معاملہ بلاشبہہ فطرت کے اس عالمی قانون سے مستثنیٰ نہیں۔

مجھے یقین ہے کہ انڈیا میں اب نئے دور کا آغاز ہو چکا ہے، فی الحال یہ آغاز زیادہ تر ایک تاریخی عمل (historical process) کی صورت میں ہے۔ مگر دھیرے دھیرے ان شاء اللہ وہ شعور کا درجہ اختیار کرے گا۔ اور جب وہ شعور کے درجہ میں پہنچے گا تو اس کا عمل بھی زیادہ تیز اور موثر ہو جائے گا۔ اس واقعہ کو بہر حال ظہور میں آنا ہے۔ اس کے اور ہمارے درمیان ضروری مدت کے سوا کوئی بھی دوسری چیز حائل نہیں۔

انسانی زندگی میں جب بھی کوئی نیا دور آتا ہے تو وہ ہمیشہ اس طرح آتا ہے کہ اس میں پچاس فی صد حصہ تاریخی عوامل ادا کرتے ہیں، اور بقیہ پچاس فی صد حصہ خود اس انسانی گروہ کو ادا کرنا ہوتا ہے جس کے درمیان وہ انقلاب آرہا ہو۔

آج ہم اسی امتحانی دور میں ہیں۔ اس وقت ہمارا کام یہ ہے کہ موجودہ حالات میں ابھرنے والے تاریخی عوامل کو پہچانیں اور پھر حکمت اور دانش مندی کے ساتھ انھیں اپنے حق میں استعمال کریں۔ اگر ہم نے اپنے حصہ کا یہ ۵۰ فی صد کام درست طور پر انجام دے دیا تو اس کے بعد مطلوبہ نئے دور کا آنا اتنا ہی یقینی ہو جائے گا جتنا گردش زمین کے قانون کے تحت تاریک شام کے بعد روشن صبح کا نمودار ہونا۔

زندگی میں ہمیشہ مسائل بھی ہوتے ہیں اور اسی کے ساتھ مواقع اور
امکانات بھی۔ یہ رہنمائی نہیں ہے کہ مسائل کو ڈھونڈ کر نکالا جائے
اور ان کو بتا کر لوگوں کو مایوسی اور پست حوصلگی میں مبتلا کیا
جائے۔ سچی رہنمائی یہ ہے کہ مواقع کی نشاندہی کی جائے تاکہ لوگوں
کے اندر عمل کا حوصلہ پیدا ہو۔ پیش نظر کتاب میں یہی دوسرا
انداز اختیار کیا گیا ہے۔ اس میں ٹھوس حقائق کی روشنی میں یہ
بتایا گیا ہے کہ اگر ہوش مندی سے کام لیا جائے تو اس ملک
میں مسلمانوں کے لیے ترقی کے وہ تمام امکانات پوری طرح
موجود ہیں جو کسی بھی دوسرے مقام پر ہیں یا ہو سکتے ہیں۔